مسلم علماء کا مطالعۂ ہندو دھرم

مصنف

ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی

خسرو فاؤنڈیشن، نئی دہلی

© جملہ حقوق بحقِ خسرو فاؤنڈیشن محفوظ ہیں۔

Muslim Ulama Ka Mutala-e-Hindu Dharm

by: Dr. Zafar Darik Qasmi

نام کتاب	:	مسلم علماء کا مطالعۂ ہندو دھرم
مصنف	:	ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی
سن اشاعت	:	202
تعداد	:	1100
قیمت	:	-/200
کمپوزنگ	:	محمد انصر القاسمی، علی گڑھ
پرنٹر	:	الفا آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
ناشر	:	خسرو فاؤنڈیشن، ڈی-319، ڈیفینس کالونی، نئی دہلی۔110024

ملنے کا پتہ

فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ
FARID BOOK DEPOT(Pvt.)Ltd.
Corp. Off : 2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, N. Delhi-2
Ph : 011-23289786, 011-23289159, 011-23278956, 011-23279998
NASIR KHAN : +91-9250963868 Mob : +919560870828
E-mail : faridbookcorner@gmail.com Whatsapp : +91-9717968328

FBD
باہتمام : ناصر خان

Printed at Farid Enterprises, Delhi-2

فہرست مضامین

	تقدیم	7
	پیش لفظ	9
	باب اول: مسلمان، مطالعۂ ادیان اور سماجی ہم آہنگی	**15-95**
۱-	مطالعۂ ادیان کے اسلوب و آداب	17
۲-	سابقہ انبیاء کے واقعات	20
۳-	قرآن کریم میں سابقہ امم کا ذکر	25
۴-	اصحاب سبت	26
۵-	اصحاب الرس	28
۶-	اصحاب کہف کا واقعہ	29
۷-	ہندو قوم کا ذکر قرآن کریم میں	32
۸-	قرآن میں سابقہ شریعتوں کا ذکر	43
۹-	سابقہ شریعتیں مسلم مفکرین کی نظر میں	45
۱۰-	مقدس کتب وصحائف کا مطالعہ	56
۱۱-	ویدوں کا ذکر قرآن میں	66
۱۲-	وحدت دین کا تصور	76
۱۳-	شرائع میں قبلنا کا حکم	84
۱۴-	کتب احادیث اور مطالعۂ ادیان	86
۱۵-	کتب تفاسیر اور مطالعۂ ادیان	88

۱۶-	کتب تواریخ اور مطالعۂ ادیان	89
۱۷-	مطالعۂ ادیان کی سماجی ضرورت	90
باب دوم: ہندوستان کی مسلم حکومتوں میں ہندو دھرم کا احیاء اور تحفظ		**96-167**
۱-	ہندوستان کی مسلم حکومتوں میں بین المذاہب مکالمہ	97
۲-	جلال الدین محمد اکبر کے دور میں مکالمہ	98
۳-	علاء الدین خلجی اور مکالمہ بین المذاہب	99
۴-	عہد جہاں گیری میں مکالمہ	101
۵-	انگریزوں کے عہد میں بین المذاہب مذاکرے	102
۶-	ہندوؤں کے دینی ادب کے تراجم	105
۷-	اپنشدوں کا فارسی ترجمہ	110
۸-	ہندوؤں کی تہذیبی اور فکری کتابوں کے تراجم	115
۹-	ہندوؤں کی زبان اور علوم کا تحفظ	119
۱۰-	مسلم حکمرانوں کی دیگر ادیان کے اہل علم سے ملاقاتیں	124
۱۱-	مسلم حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کے دینی پروگرام	127
۱۲-	ہندومت کے متعلق مسلمانوں کی آراء	133
۱۳-	ہندومت پر مسلمانوں کا تحریری سرمایہ	145
۱۴-	بیرونی کا مختصر تعارف	145
۱۵-	سبب تالیف	146
۱۶-	کتاب الہند کے ماخذ	149
۱۷-	کتاب الہند اہل علم کی نظر میں	150
۱۸-	علامہ شبلی نعمانی	150

۱۹-	علامہ سید سلیمان ندوی	151
۲۰-	سید صباح الدین عبدالرحمن	151
۲۱-	ضیاء الحسن فاروقی	152
۲۲-	پروفیسر اختر الواسع	153
۲۳-	پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی	154
۲۴-	کتاب الہند کے تراجم اور اشاعتیں	155
۲۵-	دبستان مذاہب	155
۲۶-	دبستان مذاہب کا مصنف	157
۲۷-	دبستان مذاہب کے ابواب و تراجم	158
۲۸-	آئین اکبری	161
۲۹-	منتخب التواریخ	162
۳۰-	تحفۃ المجاہدین فی بعض اخبار البرتکالیس	163
۳۱-	مجالسِ جہانگیری	165
۳۲-	تزک جہانگیری	165
باب سوم: مسلم علماء، ہندو دھرم اور تکثیریت		**168-331**
۱-	ادیان و مذاہب میں اختلاف کی حقیقت	169
۲-	ہندوؤں کے متعلق علامہ شبلی نعمانی کے افکار	192
۳-	اسلام اور ہندو دھرم کی مشترک اقدار	204
۴-	ہندوؤں کا دینی و عائلی نظام	220
۵-	ہندوؤں سے متعلق اہم مباحث	234
۶-	کیا ہندو شبہ اہل کتاب ہیں؟	247

۷-	آریوں کے دینی وسیاسی حالات	258
۸-	ہندو احیائی تحریکیں	272
۹-	ہندوؤں کی کتب، عبادت اور عقیدۂ تناسخ	284
۱۰-	مذہبی تکثیریت کی افادیت	295
۱۱-	ہندوؤں کے ساتھ مذاکرات کی معنویت	314
کتابیات		**332-338**
پس نوشت		

تقدیم

یہ بات سب جانتے ہیں کہ ہندوستان ادیان و مذاہب اور متنوع افکار و خیالات کا شاندار مرکز و محور ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہاں کی خوبصورتی اور حسن کو تہذیبی تنوع، سماجی تعدد اور مذہبی تکثیریت دوبالا کرتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ ہندوستان کا یہ امتیاز اسی وقت برقرار رہ سکتا ہے جب کہ ہم ایک دوسرے کے مذہب، دین اور تہذیب و ثقافت کا مطالعہ کریں۔ باہم عقائد و افکار کو سمجھنے کی مخلصانہ سعی کریں۔ مکالمہ اور بات چیت کی روایت کو مستحکم کیا جائے۔ یاد رکھیے! کوئی بھی سماج افراتفری کا شکار یا کسی سے بدظن اسی وقت ہوتا ہے جب کہ اس کے متعلق درست بات معلوم نہ ہو۔ یہی حال آج ہمارے معاشرے کا ہے کہ ہم اپنے مذہب کے علاوہ دیگر مذاہب کے متعلق صرف اور صرف درست معلومات نہ ہونے کی وجہ سے غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ لہٰذا مذاہب کی بابت سماج میں رائج غلط فہمیاں یا ایک دوسرے کا کسی دوسرے دین و مذہب کے خلاف افسوسناک رویہ اسی وقت معدوم ہوسکتا ہے جب کہ ہم دیگر مذاہب، تہذیبوں اور ثقافتوں کا مطالعہ کریں۔ دیگر مذاہب کے افراد سے گفتگو کی جائے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ مطالعہ یا مکالمہ مثبت انداز میں کیا جائے۔ مطالعہ کرتے وقت پہلے سے دوسرے مذہب کے خلاف کوئی رائے قائم کر لینا، اسی طرح مکالمہ یا بات چیت کے مابین کسی کو مغلوب کرنے کا مقصد قطعی نہ ہو۔ اس طرح کا مزاج ہمارے دانشوروں اور محققین کا بنے گا تو یقیناً اس کے مثبت اثرات معاشرے پر مرتب ہوں گے۔ افہام و تفہیم اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی آج جس قدر ضرورت ہے وہ کسی کی نظروں سے مخفی نہیں ہے۔ اس کے لیے ہمیں وسعت فکر اور متوازن و ایجابی رویہ اختیار کرنے کی سخت ترین ضرورت ہے۔ اطمینان بخش بات

یہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں مذاہب کے مثبت مطالعہ کا شوق بڑھ رہا ہے۔ ہندو مذہب کے ساتھ ساتھ دیگر سامی اور غیر سامی مذاہب کے حوالے سے مفکرین و مدبرین اور محققین ومصنفین نہایت جامع اور قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ماضی میں بھی اس حوالے سے علماء اسلام نے بڑا وسیع سرمایہ تاریخ کے اوراق پر ثبت کیا ہے۔ اس کے اعادہ کا یہاں موقع نہیں ہے۔ البتہ عہد حاضر میں نوا جوان فضلاء کا مطالعہ مذاہب کی طرف اشتیاق ہونا ہندوستان جیسے تکثیری سماج کے لیے فال نیک ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی کی کتاب ''مسلم علماء کا مطالعہ ہندو دھرم'' ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں جن مباحث کو پیش کیا ہے، یقینی طور پر وہ بڑی اہم ہیں۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ عہد حاضر میں مطالعہ ادیان و مذاہب کی ضرورت کے کیا فوائد ہیں۔ اس کتاب میں یہ بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ سماجی و معاشرتی نقطہ نظر سے مطالعہ مذاہب کیوں ضروری ہے۔ سماج میں ہم آہنگی اور بقائے باہم کا فروغ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہم مطالعہ ادیان و مذاہب اور افہام وتفہیم کو پوری طرح سے آگے بڑھائیں۔ کتاب میں یہ بھی وضاحت ملتی ہے کہ ہندوستان کی مسلم ریاستوں میں ادیان و مذاہب پر جو گراں قدر کام ہوا ہے وہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ہندوستان کی مسلم ریاستوں میں ہندو دھرم پر جو خدمات انجام دی گئیں ہیں وہ یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ مسلم حکمرانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کسی بھی طرح کا بھید بھاؤ یا تعصب وتنگ نظری کا رویہ نہیں اپنایا بلکہ ان کے مذہب وثقافت اور رسم ورواج کو پروان چڑھنے کا پورا موقع عنایت کیا گیا۔ لہٰذا اس تناظر میں بھی اس کتاب کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مسلم علماء اپنے خول میں رہتے ہیں، دیگر مذاہب وادیان یا تہذیبوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ یہ اعتراض بے بنیاد ہے کیوں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مسلم علماء نے

ہندو دھرم اور دیگر مذاہب کا مطالعہ بڑی وسعت اور کشادہ ظرفی سے کیا ہے اور انہوں نے اپنی تحقیق و تفتیش میں یہ پیغام دیا ہے کہ اپنے مذہب کے ساتھ ساتھ دیگر تہذیبوں کا بھی مطالعہ کیا جائے تا کہ سماج میں ایک دوسرے کے دین و دھرم کے لیے احترام و توقیر پیدا ہو اور ہمارے درمیان رائج غلط فہمیاں یا شکوک و شبہات کا ازالہ ہو سکے۔

گویا ڈاکٹر ظفر دارک کی یہ کاوش عہد حاضر کی ایک اہم ضرورت تھی۔ اس تصنیفی سعی کا یہی پیغام ہے کہ ہمیں معاشرے میں اگر امن و امان اور سنجیدگی پیدا کرنی ہے تو پھر دیگر ادیان کا مطالعہ تحقیقی و معروضی انداز میں کیا جانا چاہیے۔

اس موقع پر میں ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے خسرو فاؤنڈیشن کی تحریک پر وقت کے حساب سے ایک اچھا اور علمی کام کیا ہے۔ ہم خسرو فاؤنڈیشن کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے تمام ارکان شری روہت کھیڑا، جناب سراج الدین قریشی، شری رنجن مکھرجی اور راقم الحروف بجا طور پر یہ امید کرتے ہیں کہ ان کا یہ علمی کارنامہ اہل علم کی بارگاہ میں قبولیت حاصل کرے گا اور معاشرے میں رواداری، اخوت و فکری توازن کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ آمین یارب العالمین

پروفیسر اختر الواسع

چیئرمین

خسرو فاؤنڈیشن، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

دنیا کو اس وقت بنیادی طور پر جو ضرورت ہے وہ امن وامان اور رواداری کی ہے۔ جن قوموں میں امن وامان نہیں ہوتا ہے وہ کسی بھی طرح ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتی ہیں۔ اس لیے سماج کو پوری طرح پر امن بنانے کے لیے بنیادی طور پر جو ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنے مذہب کے ساتھ ساتھ دیگر ادیان و مذاہب کے مطالعہ کو بھی اہمیت دیں۔ اس کے معاشرے پر جو اثرات مرتب ہوں گے وہ کسی کی نظروں سے مخفی نہیں ہیں۔ اسی طرح آج کے دور میں اس طرح کی چیزوں کی جو ضرورت ہے وہ اپنی جگہ مسلم ہے۔ واضح رہے کہ موازنۂ ادیان یا تقابل ادیان کا اولین محرک قرآن کریم ہے۔ قرآن مجید میں سابقہ انبیاء و سابقہ امم کے متعلق آیات قرآنی موجود ہیں۔ مثلاً قصۂ آدم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ، حضرت خضر علیہ السلام کا ذکر، حضرت اسحاق علیہ السلام کا تذکرہ، نیز حضرت عیسی علیہ السلام کا ذکر، علاوہ ازیں بنی اسرائیل، قوم عاد، قوم ثمود، قوم عمالقہ، اصحاب الایکہ، اصحاب رس، قوم لوط اور قوم صالح وغیرہ وغیرہ۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قرآن تقابل ادیان کی کتاب ہے۔ ہاں یہ کہنا درست ہے کہ قرآن میں بھی اس موضوع سے متعلق اشارات پائے جاتے ہیں۔ جو نوع انسانیت کے لیے درس عبرت ہیں۔ یہ وہ حقیقی شواہد ہیں جو مطالعہ ادیان پر کام کرنے والے اصحاب علم وفضل کے لیے مشعل راہ اور بین ثبوت ہیں۔ اس کے بعد دوسرا سب سے اہم اور بنیادی مصدر تقابل ادیان پر کتب احادیث ہیں۔ اگر نگاہ تدبر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ احادیث میں نہ صرف سابقہ انبیاء کے احوال بیان فرمائے ہیں، بلکہ سابقہ امتوں کے متعلق بھی کافی تفصیلات قلم بند کی گئی ہیں۔ مثلاً کتب احادیث میں ''کتاب الانبیاء'' کے ذیل میں جو احادیث لائی گئی ہیں ان کا تعلق بھی تقابل ادیان سے بہت گہرا ہے۔ اسی طرح بعض کتب تواریخ اور سیر میں بھی تقابل ادیان پر مباحث

درج ہیں۔ مثلاً ابن کثیر نے اپنی کتاب ''البدایہ والنہایہ'' علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون نے ''دیوان المبتدا والخبر ، ابن اثیر نے ''الکامل فی التاریخ'' وغیرہ میں سابقہ انبیاء علیہم السلام کی بابت کافی علمی اور اہم بحثیں کی ہیں۔ اسی طرح متقدمین علماء نے بھی اس موضوع پر بہت ہی علمی کام کیا ہے۔ ابوریحان البیرونی کی ''فی تحقیق ماللہند'' ابن حزم ظاہری کی ''الفصل فی الملل والاہواء والنحل'' علامہ عبدالکریم شہرستانی کی ''الملل والنحل'' علامہ اپنی تیمیہ کی ''الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح''، ابن قیم الجوزیہ کی ''ہدایۃ الحیاری فی اجوبۃ الیہود والنصاری'' سرسید احمد خاں کی ''تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام'' اس کے علاوہ ایک اور بہت ہی اہم کتاب جو توریت کی تفسیر پر ہے۔ مولانا عنایت رسول چریا کوٹی کی۔ ''بشری'' اسی طرح داراشکوہ نے اپنشدوں کا فارسی ترجمہ ''سر اکبر'' کے نام سے کیا تھا۔ نیز عرب ممالک میں بھی تقابل ادیان پر کام ہوا ہے۔ معروف محقق احمد شلبی نے ''ادیان الہند الکبری'' کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ معروف محدث ضیاء الرحمٰن اعظمی کی تصنیف ''دراسات فی الیہودیہ، والمسیحیہ وادیان الھند'' وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کتب کے علاوہ کئی مذاہب وادیان نمبر بھی نکلے ہیں۔ جیسے ''گگن کا مذاہب نمبر'' اور جماعت اسلامی سے شائع ہونے والے ''سہ روزہ دعوت'' نے بھی مذاہب نمبر نکالا تھا۔ تقابل ادیان پر مذکورہ کتب سند و متن اور دستاویز کا درجہ رکھتی ہیں۔ آج کے دور میں تقابل ادیان پر درس گاہوں اور دانش گاہوں میں بہت زیادہ کام ہو رہا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے علاوہ مغرب کی دانش گاہوں میں بھی اس عنوان کے متعلق باقاعدہ شعبہ جات قائم ہو چکے ہیں۔ جہاں تقابل ادیان کے متعدد گوشوں کو بروئے کار لا کر معاشرے میں ہم آہنگی کی روایات کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ دراصل تقابل ادیان کے دو بنیادی حصہ ہیں۔ ایک سامی ادیان، دوسرا غیر سامی ادیان۔ لہذا جوں جوں تقابل ادیان پر کام ہوتا گیا اس کے نئے گوشے اجاگر ہوتے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں عربی زبان میں مسلم مفکرین اور اصحاب علم نے اس موضوع پر نہایت وقیع کام کیا ہے۔ وہیں اردو زبان و ادب میں بھی تقابل ادیان خصوصاً ہندوستانی مذاہب پر مسلم اسکالرسے نے بڑا تحقیقی کام کیا ہے۔ راقم کی ناقص جانکاری کے مطابق اب تک تقریباً سو

کتب ہیں جو ہندوستانی مذاہب پر اُردو زبان میں مسلم علماء نے تحریر کی ہیں۔ بناء بریں ان کتب ومقالات کا تعارف عہد حاضر کی ناگزیر ضرورت ہے۔ ان کتب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ درج ذیل نوعیت سے کا کیا گیا ہے۔ علمی اور تحقیقی کام، تقابلی نوعیت کا کام، تجزیاتی یا تنقیدی مطالعہ، مناظرانہ نوعیت کا کام اور معاشرے میں رواداری کے فروغ وغیرہ کی غرض سے۔ ہندوستانی مذاہب یا مطالعۂ ادیان پر کام کرنے والے نمایاں علماء درج ذیل ہیں۔ مولانا قاسم نانوتوی، ڈاکٹر ذاکر نائک، احمد دیدات، مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری، خواجہ حسن نظامی، مولانا عبدالصمد رحمانی، ڈاکٹر محمد فاروق خاں۔ مولانا حامد علی، مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ تقابل ادیان پر اردو زبان میں غیر سامی ادیان پر کام کرنے والے مسلم اسکالرز کی ایک بڑی تعداد ہے۔ ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی تحقیقات و تصنیفات کے ضمن میں ہندوستانی مذاہب پر کافی کچھ لکھا ہے۔ مثلاً مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، علامہ شبلی نعمانی، پروفیسر خورشید احمد، شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ، سید امیر علی، (مصنف روح اسلام)، پروفیسر محمد حمید اللہ پیرس، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، قاضی سلیمان منصور پوری، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کے یہاں بھی ہندوستانی مذاہب کے حوالے سے کافی مواد ملتا ہے۔ اس جملہ علمی وفکری سرمائے کا تحقیقی، تنقیدی، و تجزیاتی مطالعہ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ کیونکہ اس سے جہاں علمی فائدہ ہوگا، وہیں اس کے مثبت اور خوش آئند نتائج معاشرے پر بھی مرتب ہوں گے۔ اس تحقیقی کام کا بنیادی فائدہ یہ ہوگا کہ باہم جو غلط فہمیاں اور شکوک وشبہات ہیں ان کو رفع کرنے میں اس کام سے بڑی مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ ابھی تک اس نوعیت کا کام برصغیر میں نہیں ہوا ہے۔ (البتہ ایک دو مختصر مضمون ضرور لکھے گئے ہیں جو ناکافی ہیں ہاں معروف اسلامی اسکالر پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی نے اس تناظر میں ایک اہم کتاب ''مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت'' کے نام سے تصنیف کی مگر انہوں نے قدیم اور عربی کتب کا تعارف کرایا ہے۔) اس کام کی ایک افادیت یہ بھی ہے کہ دانش گاہوں میں جو اسکالر تقابل ادیان پر کام کرتے ہیں ان کو یکجا مواد نہیں مل پاتا ہے۔ اس لیے یہ

تحقیقی کام مطالعہ ادیان پر کام کرنے والے باحثین کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

چنانچہ راقم نے ان تمام ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر تقابل ادیان پر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر کام کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ راقم نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد، پوسٹ ڈاکٹریٹ بھی کیا اور اس کا عنوان تھا ''اسلام اور ہندوازم کی مشترکہ اقدار'' اس دوران جو کتابیں ہندوازم کے حوالے سے نظر سے گزری تو خیال آیا کہ کیوں نہ باقاعدہ ایک علمی اور منفرد کام مسلم علماء کے مطالعہ ہندومت کے حوالے سے کیا جائے۔ بہرحال اس موضوع پر قسط وار لکھنا شروع کیا اور اس سلسلے کی تقریباً ستائیس قسطوں کو ہفت روزہ دعوت نے شائع کیا۔ جوں ہی یہ سلسلہ وار مضامین دعوت کے کالم میں شائع ہونا شروع ہوئے، تو میری حوصلہ افزائی کئی ہندوستان کے معروف اسکالرز نے کی۔ مجھے مزید تقویت ملی ہفت روزہ دعوت میں ان قسطوں کا عنوان تھا'' تقابل ادیان میں مسلم علماء کی خدمات'' ظاہر ہے یہ سلسلہ آگے بڑھا اور ناچیز نے ایک خاکہ بنا کر عالی جناب پروفیسر اختر الواسع کی خدمت میں ارسال کیا اور انھوں نے باقاعدہ اس کام کے کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ یہ ہے مختصر روداد اس موضوع پر کام کرنے کی۔ لیکن یہ کام اتنا وسیع ہے کہ ہزاروں صفحات درکار ہیں۔ اس لیے ناچیز نے صرف ہندوستانی ادیان میں سے ہندوازم پر توجہ مبذول کی ہے۔ اور مسلم علماء نے ہندومت کا جو مطالعہ کیا ہے، اس کا تجزیہ وتعارف پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ تقابل ادیان کا یہ گوشہ بھی گرچہ بہت طویل اور اہم ہے۔ لیکن کوشش کی گئی ہے کہ نامور مسلم علماء نے ہندوازم کے متعلق جو لکھا ہے اس کو ضرور شامل کرلیا جائے۔ اس کتاب کو راقم نے تین ابواب پر مشتمل کیا ہے۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

باب اول: مسلمان، مطالعۂ ادیان اور سماجی ہم آہنگی

باب دوم: ہندوستان کی مسلم حکومتوں میں ہندو دھرم کا احیاء اور تحفظ

باب سوم: مسلم علماء، ہندو دھرم اور تکثیریت

امید ہے کہ راقم کی یہ ادنیٰ کاوش اہل علم وتحقیق کی بارگاہ میں مقبول ہوگی۔ یقیناً اس

میں خامیاں اور کوتاہیاں رہ گئی ہوں گی۔ میری گزارش ہے کہ اگر کوئی خامی نظر آئے تو ضرور مطلع فرمائیں۔ آخر میں اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اس کاوش کو راقم کے لیے توشۂ آخرت بنائے آمین یارب العالمین۔

ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی

ستمبر ۲۰۲۲ء

باب اول

مسلمان، مطالعۂ ادیان اور سماجی ہم آہنگی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مطالعۂ ادیان/ مکالمہ بین المذاہب عہد حاضر کی ناگیز یر ضرورت ہے۔ اسی وجہ سے دانشگاہوں اور تعلیم گاہوں میں Comparative Religion کے شعبے قائم ہورہے ہیں۔ یورپ کی تقریبا تمام دانشگاہوں میں مطالعۂ ادیان/ تقابل ادیان کے شعبہ جات قائم ہو چکے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے بھی تعلیمی اداروں میں مطالعۂ ادیان کی ضرورت محسوس کی گئی ہے وہاں بھی مطالعۂ ادیان پر تحقیقی و تصنیفی کام کیا جارہا ہے۔ اس طرح برصغیر کی دانشگاہوں میں اس موضوع کے متعلق شعبہ جات قائم ہو چکے ہیں۔ ان میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیق و تالیف کا بھی کام جاری ہے۔

چنانچہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فیکلٹی دینیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں Center for Comparative Religion and Civiligalion جیسے اہم ادارے مطالعۂ ادیان پر کافی کام کر رہے ہیں۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ مطالعۂ ادیان مسلمانوں کی دلچسپی کا میدان شروع سے ہی رہا ہے کیوں کہ دیگر ادیان کے حاملین اور متبعین سے گفتگو کا ثبوت قرآن وسنت میں بخوبی ملتا ہے۔ اسی طرح خلافت راشدہ، عہد اموی، عہد عباسی اور دیگر مسلم حکومتوں میں بھی مطالعۂ ادیان کے بین شواہد موجود ہیں۔

موجودہ وقت میں مذہبی ہم آہنگی اور رواداری کے فروغ یا تکثیری سماج میں بقائے باہم کو فروغ دینے کے لیے مطالعۂ ادیان کی دوسری شکل بین مذہبی مذاکرات ہے۔ جسے مکالمہ اور انگریزی میں Dailague کہا جاتا ہے۔ مطالعۂ ادیان اور مکالمہ بین المذاہب دونوں کا بنیادی کردار امن وامان، اشتراک و یگانگت اور سماجی ہم آہنگی ہے۔

یہ بات اب کسی سے مخفی نہیں ہے کہ دنیا ایک عالمی گاؤں ہے۔ اس لیے امن وسلامتی کے فروغ اور انسانی رشتوں کے تحفظ کے لیے ان خطوط پر مکمل عمل کرنے کی ضرورت ہے جن سے معاشرے میں ہم آہنگی اور یکجائیت مرکزیت پیدا ہو۔ اس کے لیے بنیادی طور پر مطالعۂ

ادیان کی ضرورت ہے۔ مطالعۂ ادیان ایک ایسا پہلو ہے جس کے فروغ اور دلچسپی سے ادیان کے متبعین کے مابین جو غلط فہمیاں اور دوریاں پیدا ہوگئی ہیں ان کا خاتمہ یقینی طور پر ہو سکے گا۔ اسی طرح یہاں یہ بات بھی بتانا ضروری ہے کہ مطالعۂ ادیان کا اولین محرک قرآن کریم ہے۔ قرآن مجید میں سابقہ انبیاء، سابقہ امم کے احوال اور سابقہ کتب کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔

آج کا عالمی بحران مذہبی، سماجی، سیاسی، اقتصادی اور معاشی طور پر دنیا کو بری طرح متاثر کر رہا ہے۔ جس کے باعث معاشروں میں بے چینی نفرت اور اضطراب کی کیفیت بڑھ رہی ہے۔ اس لیے مذاہب وادیان اور تہذیبوں کے مابین مکالمہ، گفتگو اور مطالعہ کو آج کی سب سے بڑی ضرورت محسوس کیا جا رہا ہے۔ البتہ یہ کوئی نئی کوشش اور جدوجہد نہیں ہے۔ بلکہ ماضی میں بھی متعدد اور مختلف الخیال طبقوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی مختلف کوششیں ہوئی ہیں۔ اس کی متعدد نظیریں تاریخ کے اوراق میں ملتی ہیں۔ یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ تعدد پسند طبقات میں گفت وشنید کے لیے اسلام کا فلسفہ نہایت مبنی بر حقیقت ہے۔ اسلام نظریاتی وفکری اختلاف کی تائید کرتا ہے۔ یا در کھیے برداشت، احترام اور محبت کی پالیسی کو اس وقت عمل میں لایا جا سکتا ہے جب کہ ایک دوسرے کے نظریات کا احترام کیا جائے۔ اسلام نے اس حوالے سے جو گرانقدر اصول وضع کیے ہیں ان میں ادیان کا احترام کے ساتھ ساتھ مذہبی افراد کے مابین قومی یکجہتی اور رواداری کی ضرورت پر بھی توجہ دلائی ہے۔ اس حوالے سے اسلام نے جو تابندہ اصول دنیا کو دیئے ہیں، ان پر اگر نوع انسانی عمل پیرا ہو جائے تو یقیناً معاشرے میں دین ودھرم اور زبان و رنگ کے نام پر کوئی بھی تصادم واقع نہیں ہوگا۔ مطالعۂ ادیان پر کام کرنے اور دیگر ادیان سے واقفیت پیدا کرنے پر علماء نے اسلوب وآداب طے فرمائیں ہیں۔ اگر ان کا خیال رکھا جائے گا تو یقیناً معاشرے پر مثبت اثر ہوگا۔

مطالعۂ ادیان کے اسلوب وآداب:

یہ سچ ہے کہ مطالعۂ ادیان آج کی ضرورت ہے اس کے بے شمار فوائد ہیں۔ اسی وجہ سے اب اس موضوع پر دنیا کے مختلف ممالک کی دانش گاہوں اور درس گاہوں میں کام ہو رہا

ہے۔ مطالعۂ ادیان کی اہمیت ومعنویت پر زور دیتے ہوئے شیخ احمد دیدات (۱۹۱۸۔ ۲۰۰۵ء) نے اپنی کتاب 'تقابل الادیان السماویۃ' (اس کا اردو ترجمہ مصباح اکرم نے یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے عنوان سے کیا ہے) میں لکھا ہے:

''تقابل ادیان سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں پائے جانے والے متعدد مذاہب اور معروف ادیان کی تعلیمات کا غیر متعصّبانہ تقابل اور غیر جانب دارانہ موازنہ کیا جائے۔ نیز تمام مذاہب کا کھلے دل سے اعتراف کیا جائے۔ تقابل ادیان سے مراد مختلف مذاہب کے بنیادی عقائد و عبادات اور رسوم کا ایسا ناقدانہ اور عادلانہ جائزہ ہے جس سے ہر ایک مذہب کی قدر و قیمت، خوبیاں اور خامیاں پوری طرح روشن ہو جائیں۔ مطالعۂ ادیان کے دوران اگر کسی دین کی خوبی سامنے آتی ہے تو اسے بلا تکلف سراہا جائے۔ نیز اگر کوئی خامی ہے تو اسے دلیل اور برہان سے رد کیا جائے تا کہ حق تک رسائی ممکن ہو۔ دین اسلام کی فضیلت کو دلائل عقلیہ اور اس کی حقانیت کو تاریخی شواہد سے ثابت کیا جائے تا کہ نئی نسل اور تعلیم یافتہ طبقہ اس پر شعوری طور پر ایمان لائے، اسے شرح صدر سے قبول کرے اور نتیجتاً وہ اپنی زندگیوں میں مطلوبہ پسندیدہ تبدیلیاں لائے''۔[1]

سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳۔ ۱۹۷۹) نے اپنی کتاب 'الجہاد فی الاسلام' میں تقابل ادیان کے اصول وضوابط بتائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''دو ادیان کا مقابلہ درحقیقت ایک بہت مشکل کام ہے۔ انسان جس عقیدہ اور رائے پر ایمان رکھتا ہو۔ اس کے مخالف عقائد اور آراء کے ساتھ بہت کم انصاف کر سکتا ہے۔ یہ کمزوری انسانی طبائع میں بہت عام ہے مگر خصوصیت کے ساتھ مذہبی گروہ میں تو اس نے تعصب وتنگ نظری کی بدترین شکل اختیار کر لی ہے۔ ایک مذہب کے پیرو جب دوسرے مذاہب پر تنقید کرتے ہیں تو ہمیشہ ان کے تاریک پہلو ہی تلاش کرتے ہیں اور روشن پہلو کو دیکھنے کی کوشش

[1] شیخ احمد دیدات، تقابل الادیان السماویۃ، مترجم، مصباح اکرم، آر آر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص: ۲۷

ہی نہیں کرتے یا اگر دیکھ بھی لیتے ہیں تو اسے دیدہ و دانستہ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذہبی تنقید سے ان کا مدعا دراصل حق کی تلاش نہیں ہوتا بلکہ محض اس رائے کو جسے وہ تحقیق سے پہلے اختیار کر چکے ہیں درست کرنا ہوتا ہے۔ اس طریقہ سے تقابل ادیان کے تمام فوائد زائل ہو جاتے ہیں اور خود اس مذہب کو بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا جس کی تائید میں یہ گمراہ کن طریقہ اختیار کیا جاتا ہے"۔

مولانا مودودی اس تمہیدی گفتگو کے بعد تقابل ادیان کے درج ضابطے بتاتے ہیں۔

۱۔ ایک مذہب کی تعلیم کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ دوسرے مذاہب کی تعلیمات کو کلیۃً غلط ثابت کیا جائے اور نہ یہ ضروری ہے کہ ایک مذہب میں حق وصداقت کے موجود ہونے سے دوسرے مذاہب میں اس کا عدم لازم آئے۔ حق ایک کلی حقیقت ہے جس کے افراد خواہ کہیں ہوں بہر حال اس کل کے فرد رہتے ہیں۔ حال و مقام کے بدلنے سے ان کی حقیقت و اصلیت نہیں بدلتی، جو حق ہمارے یہاں مذہب میں پایا جاتا ہے اس کا دوسرے مذہب میں پایا جانا، دونوں میں سے کسی مذہب کے بھی نقص کی دلیل نہیں ہے کہ اس پر خواہ مخواہ پردہ ڈالنے کی کوشش کی جائے، بلکہ دراصل وہ اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں ایک مشترک سرچشمۂ حق سے ماخوذ ہیں۔ جس کا فیض دونوں کے پاس محفوظ رہا ہے۔ جس کا حق جتنا اور جیسا فیضان بھی کہیں موجود ہے اس کا مستحق ہے کہ اس کی فکر کی جائے نہ کہ خواہ مخواہ کھینچ تان کر اسے بے قدر ثابت کرنے پر زور صرف کیا جائے۔

۲۔ جو شخص یہ دعوی کرتا ہے کہ حق اس کے مذہب کے سوا کہیں موجود نہیں ہے۔ وہ دوسرے مذاہب ہی پر نہیں خود حق پر بھی ظلم کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حق وصداقت کی روشنی کم و بیش سب جگہ موجود ہے۔ البتہ ارباب تحقیق جب کسی ایک مذہب کو دوسرے مذاہب پر ترجیح دیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی نگاہ میں مذہب تجلیات حقیقت کا مظہر ہوتا ہے۔ پس تقابل ادیان کے کسی متعلم کو کبھی یہ پیشگی فیصلہ کر کے نہ بیٹھ جانا چاہیے کہ اس کے سامنے حق اور باطل دونوں ملے جلے آئیں گے اور اس کا کام یہ ہوگا کہ اپنی عقل اور قوت تمیز سے کام لے کر حق

کو حق اور باطل کو باطل دیکھے اور ایک دوسرے سے مختلط نہ ہونے دے۔

۳۔ مذہبی تحقیقات میں اس امر کا خاص اہتمام کرنا چاہیے کہ کسی مذہب کے متعصب مخالفین اور غالی متبعین دونوں کی تصنیفات کا مطالعہ کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ ابتدائی تحقیقات میں اس قسم کے لوگوں کی تصنیفات کے مطالعہ سے ایک ناظر کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ زیر تحقیق مذہب کے اصلی چیز کو دیکھنے سے پہلے بھی اس کی آنکھوں پر ایک خاص رنگ کی عینک چڑھ جاتی ہے۔ جس سے وہ اس مذہب کو اس کے اصل رنگ میں نہیں دیکھ سکتا۔ اگر اس تحقیقات کو کسی صحیح نتیجہ تک پہنچانا ہو تو یہ ضروری ہے کہ کسی مذہب کو اس حیثیت سے نہ دیکھا جائے کہ دوسرے اس کو کس شکل میں دیکھتے ہیں بلکہ اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ وہ خود اپنے آپ کس شکل میں دکھاتا ہے۔ اس کے لیے حتی الامکان ہر مذہب کے ماخذ اصلیہ کا مطالعہ کرنا چاہیے اور ان کو پڑھ کر خود اپنی عقل سے فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ مذہب کہاں تک صحیح ہے۔ اور کہاں تک غلط ہے۔ پھر جب آدمی خود ایک رائے قائم کر لے تو اس کے بعد دوسروں کی آراء وافکار کا مطالعہ کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ اس وقت وہ حق و باطل میں بآسانی امتیاز کر سکے گا۔[1]

درج بالا اصولوں کو مدنظر رکھا جائے گا تو پھر تقابل ادیان پر کام کرنے کے فوائد کچھ اور ہی ہوں گے۔

سابقہ انبیاء کے واقعات:

آج مسلمانوں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے خول میں رہتے ہیں دیگر مذاہب کی تعلیمات یا ان کے مطالعہ سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ کیونکہ خود قرآن میں انبیاء کرام کے احوال، سابقہ کتب وصحائف کا ذکر، اسی طرح دیگر قوموں کے حالات تفصیل سے ملتے ہیں۔ قرآن کریم میں درج ذیل سورتوں کے نام سابقہ انبیاء کرام کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ سورہ یونس، سورہ ہود، سورہ یوسف، سورہ ابراہیم، سورہ بنی اسرائیل، سورہ انبیاء۔

---

[1] مودودی، سید ابوالاعلیٰ، الجہاد فی الاسلام، ادارہ ترجمان القرآن، ۱۹۹۶ء، ص: ۳۲۷-۳۲۹

مسلمانوں کے مقدس صحیفہ میں دیگر اقوام، انبیاء اور کتب کے ذکر سے مسلمانوں میں مطالعۂ ادیان کا شوق پیدا ہوا، اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ادیان کا اولین محرک قرآن کریم ہے۔

قرآن کریم میں سب سے پہلے ابو البشر حضرت آدمؑ کا ذکر آیا ہے۔ قرآن میں حضرت آدمؑ کا نام پچپن مرتبہ آیا ہے۔ جن سورتوں میں آپؑ کا نام مذکور ہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔ سورہ بقرہ، سورہ آل عمران، سورہ مائدہ، سورہ اعراف، سورہ اسراء، سورہ کہف، سورہ مریم، سورہ طہٰ، سورہ یٰسین، متذکرہ سورتوں میں حضرت آدمؑ سے متعلق درج ذیل احوال ملتے ہیں۔

آدمؑ کی پیدائش، مسئلہ سجود ملائکہ، انکار ابلیس، رب العالمین سے ابلیس کا مکالمہ، ملعونیت ابلیس اور تا قیامت زندگی کی مہلت، خلافت آدمؑ، خلافت آدم پر فرشتوں کا اظہار تعجب، بارگاہ ربوبیت سے حضرت آدمؑ وحوّا کی جنت میں رہائش، آدمؑ وحوّا، ابلیس اور شجر ممنوعہ کا واقعہ، عتاب الٰہی اور آدمؑ وحوّا کا جنت سے زمین کی طرف اخراج۔ حضرت آدمؑ کے واقعہ میں جو عبرتیں اور نشانیاں ہیں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آدمؑ کی پوری زندگی کی تفصیل قرآن کریم ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ جو اس بات پر شاہد ہے کہ مطالعۂ ادیان کے ثبوت قرآن کریم میں موجود ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلاَئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الأَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُواْ أَتَجْعَلُ فِيْهَا مَن يُفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاء وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ۔[1]

''اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔ فرشتے کہنے لگے کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اور خوں ریزیاں کریں گے اور ہم برابر تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ بحمد اللہ اور تقدیس کرتے رہتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے ارشاد

[1] سورۃ البقرۃ: ۳۰

فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے۔''

قرآن نے حضرت نوحؑ کا اجمالی و تفصیلی ذکر تینتالیس مرتبہ کیا ہے۔ جن سورتوں میں حضرت نوحؑ کا ذکر آیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

سورہ آل عمران، سورہ مریم، سورہ غافر، سورہ نساء، سورہ انبیاء، سورہ شوریٰ، سورہ انعام، سورہ حج، سورہ ق، سورہ اعراف، سورہ مومنون، سورہ ذاریات، سورہ توبہ، سورہ فرقان، سورہ فجر، سورہ شعراء، سورہ قمر، سورہ ہود، سورہ عنکبوت، سورہ حدید، سورہ احزاب، سورہ مریم، سورہ ابراہیم، سورہ صافات، سورہ نوح، سورہ اسراء، سورہ ص

متذکرہ سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کی زندگی کے متعدد گوشوں اور پہلوؤں کو ذکر کیا ہے۔ جن میں نوع انسانی کے لیے پند و نصائح کا ذخیرہ موجود ہے۔ سورہ نوح میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحاً إِلَى قَوْمِهِ أَنْ أَنذِرْ قَوْمَكَ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (1) قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ[1]

''ہم نے نوح کو ان کی قوم کے پاس (پیغمبر بنا کر) بھیجا تھا کہ تم اپنی قوم کو ڈراؤ قبل اس کے کہ ان پر دردناک عذاب آئے۔ انہوں نے (اپنی قوم سے) کہا اے میری قوم تمہارے لیے صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔ (اور کہتا ہوں) کہ تم اللہ کی عبادت (یعنی توحید اختیار) کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔''

حضرت ادریسؑ کا ذکر قرآن کریم میں صرف دو سورتوں میں ملتا ہے۔ سورہ مریم اور سورہ انبیاء، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقاً نَّبِيّاً وَرَفَعْنَاهُ مَكَاناً عَلِيّاً۔[2]

''اور اس کتاب میں ادریس کا بھی ذکر کیجئے بے شک وہ بڑے راستی والے نبی

---

[1] سورۃ نوح: ۱۔۳ [2] سورۃ مریم: ۵۷

تھے۔اور ہم نے ان کو کمالات میں بلند رتبہ تک پہنچایا۔''

دوسری جگہ حضرت ادریسؑ کے متعلق ارشاد ہے:

وَإِسْمَاعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ۔[1]

''اور اسماعیل اور ادریس (کا تذکرہ کیجئے یہ) اور سب (احکام الٰہیہ پر) ثابت قدم رہنے والے لوگوں میں سے تھے۔''

قرآن کریم حضرت ہودؑ کا ذکر کرتا ہے۔اور ان کی قوم عاد کا بھی ذکر کرتا ہے۔ہودؑ کا ذکر قرآن کریم کی درج ذیل سورتوں میں آیا ہے۔سورہ اعراف، سورہ ہود، سورہ شعراء۔اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے:

وَإِلَى عَادٍ أَخَاهُمْ هُوداً قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُواْ اللّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَـهٍ غَيْرُهُ إِنْ أَنتُمْ إِلاَّ مُفْتَرُونَ يَا قَوْمِ لا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْراً إِنْ أَجْرِيَ إِلاَّ عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ أَفَلاَ تَعْقِلُونَ۔[2]

''اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا انہوں نے فرمایا کہ اے قوم تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں۔تم (اس بت پرستی کے اعتقاد میں) محض مفتری ہو، اے میری قوم میں تم سے اس (تبلیغ) پر کچھ معاوضہ نہیں مانگتا۔میرا معاوضہ تو صرف اس (اللہ) کے ذمہ ہے۔جس نے مجھ کو پیدا کیا۔پھر کیا تم نہیں سمجھتے۔''

حضرت صالحؑ ایک پیغمبر تھے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے قوم ثمود میں مبعوث فرمایا تھا۔ قرآن کی متعدد سورتوں میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔سورہ اعراف، سورہ ہود، سورہ شعراء اور سورہ نمل، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِلَى ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحاً قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُواْ اللّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَـهٍ غَيْرُهُ هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا فَاسْتَغْفِرُوهُ ثُمَّ تُوبُواْ إِلَيْهِ إِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ۔[3]

---

[1] سورۃ الانبیاء:۸۵ [2] سورۃ ہود:۵۱ [3] سورۃ ہود:۶۱

''اور ہم نے ثمود کے پاس ان کے بھائی صالح کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا، انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں۔ اس نے تم کو زمین (کے مادہ) سے پیدا کیا اور اس نے تم کو اس میں آباد کیا تو تم اپنے گناہ اس سے معاف کرو (یعنی ایمان لاؤ) پھر اس کی طرف متوجہ رہو، بے شک میرا رب قریب ہے قبول والا ہے۔''

حضرت ابراہیم کا ذکر بھی قرآن کی متعدد سورتوں میں آیا ہے۔ یعنی ۲۵ سورتوں میں ۶۵ مرتبہ ذکر آیا ہے۔ سورہ انبیاء میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِينَ. إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا هَٰذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ. قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ. قَالَ لَقَدْ كُنتُمْ أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ. قَالُوا أَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ أَمْ أَنتَ مِنَ اللَّاعِبِينَ. قَالَ بَل رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ وَأَنَا عَلَىٰ ذَٰلِكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ۔[1]

''اور ہم نے (اس زمانہ موسوی سے) پہلے ابراہیم کو ان کی (شان کے مناسب) خوش فہمی عطا فرمائی تھی اور ہم ان کو خوب جانتے تھے۔ (ان کا وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جب کہ انہوں نے اپنے باپ سے اور اپنی برادری سے فرمایا کہ یہ کیا مورتیں ہیں جن (کی عبادت) پر تم جمے بیٹھے ہو۔ وہ لوگ (جواب میں) کہنے لگے کہ ہم نے اپنے بڑوں کو ان کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (ابراہیم نے) کہا کہ بے شک تم اور تمہارے باپ دادا (ان کو لائق عبادت سمجھنے میں) صریح غلطی میں ہو۔ وہ کہنے لگے کہ کیا تم (اپنے نزدیک) سچی بات سمجھ کر ہمارے سامنے پیش کر رہے ہو، یا دل لگی کر رہے ہو۔ (ابراہیم) نے کہا کہ نہیں (دل لگی نہیں) بلکہ تمہارا رب (حقیقی جو لائق عبادت

[1] سورۃ الانبیاء: ۵۱۔۵۶

ہے) وہ جو تمام آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان سب کو پیدا بھی کیا
اور میں اس پر دلیل بھی رکھتا ہوں۔''

درج بالا آیات اس بات پر بین ثبوت ہیں کہ قرآن نے سابقہ انبیاء کا صرف ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ بلکہ ان کا طریقۂ دعوت اور ان کے اوصاف کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات پورے اعتماد و یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ سابقہ انبیاء کا ذکر کر کے اسلام، مذاکرات، مکالمہ، افہام و تفہیم اور ہم آہنگی کی پورے طور پر دعوت دیتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی اور پرائمری ماخذ یعنی قرآن میں سابقہ انبیاء کی سیرت و کردار اور ان کے احوال و اوصاف کے ذکر سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے دامن میں نہایت کشادگی اور وسعت ہے۔ اس سے نوع انسانی کو اس بات کا بھی درس بخوبی ملتا ہے کہ ہم دیگر ادیان، ان کی تاریخ و تہذیب کے ساتھ ساتھ ان کی مقدس شخصیات کے کارناموں سے آشنائی حاصل کریں۔ اس سے بنیادی طور پر جو فوائد ہوں گے وہ غیر معمولی ہیں۔ البتہ یہ بات سچ ہے کہ جب ایک دوسرے کے دین و دھرم، مذہبی شخصیات اور ان کی مکمل تاریخ کا علم ہو جائے گا تو پھر ہمارے معاشرے میں رائج ہو چکی بہت ساری غلط فہمیاں بھی دور ہو سکیں گی۔ نیز معاشرے میں متعدد افکار و نظریات، ادیان و مذاہب کے حاملین تحمل و برداشت سے زندگی گزار سکیں گے۔ قرآن میں مذکور انبیاء کرام کے واقعات سے جہاں انسانی رشتوں کی عظمت اور مذہبی احترام کا ثبوت ملتا ہے وہیں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ قرآن کریم وہ واحد کتاب ہے کہ جس نے مسلمانوں کو مطالعۂ ادیان/ تقابل ادیان پر کام کرنے کے لیے ابھارا اور دیگر ادیان و مذاہب کے متبعین سے بات چیت کی بنیاد بھی ڈالی ہے۔

قرآن کریم میں سابقہ امم کا ذکر:

قرآن کریم میں مطالعۂ ادیان کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ سابقہ امتوں کی تہذیب و تاریخ، کردار و افکار اور مذہبی نظریات کو بڑے واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس بنا پر یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ قرآن میں سابقہ امتوں کے ذکر سے مراد یہ ہے کہ ان کے مکمل

احوال وکوائف، معاشرت ورسوم اور دین وعقائد سے واقفیت حاصل کی جا سکے۔

اصحاب سبت:

قرآن کی درج ذیل سورتوں میں اصحاب سبت کا ذکر کیا گیا ہے۔

سورہ بقرہ، سورہ نساء، سورہ مائدہ، سورہ اعراف

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (۱۹۰۱-۱۹۶۲) نے اپنی کتاب 'قصص القرآن' میں واقعۂ سبت کا زمانہ ایک اندازہ کے مطابق ۱۱۰۰ ق م بتایا ہے۔ قرآن کریم میں اس واقعہ کی تفصیل اس طرح ملتی ہے:

وَاسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعاً وَيَوْمَ لاَ يَسْبِتُونَ لاَ تَأْتِيهِمْ كَذَلِكَ نَبْلُوهُم بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ. وَإِذَ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْماً اللّهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَاباً شَدِيْداً قَالُواْ مَعْذِرَةً إِلَى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ. فَلَمَّا نَسُواْ مَا ذُكِّرُواْ بِهِ اَنجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُواْ بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ بِمَا كَانُواْ يَفْسُقُونَ. فَلَمَّا عَتَوْاْ عَن مَّا نُهُواْ عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُواْ قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ [1]

''اس بستی (والوں) کا جو کہ دریائے شور کے قریب آباد تھے (اس وقت) کا حال پوچھئے جب کہ وہ ہفتہ کے بارے میں حد (شرعی) سے نکل رہے تھے جب کہ ان کے ہفتہ کے روز ان (کے دریا) کی مچھلیاں ظاہر ہو کر ان کے سامنے آتی تھیں اور جب ہفتہ کا دن نہ ہوتا تو ان کے سامنے نہ آتی تھیں۔ ہم ان کی اس طرح پر (شدید) آزمائش کرتے تھے، اس سبب سے کہ وہ (پہلے سے) بے حکمی کیا کرتے تھے۔ اور (اس وقت کا حال پوچھئے) جب کہ ان میں

[1] سورۃ الاعراف: ۱۶۳-۱۶۵

سے ایک جماعت نے (یوں) کہا کہ تم ایسے لوگ کو کیوں نصیحت کیے جاتے ہو جن کو اللہ تعالیٰ (بالکل) ہلاک کرنے والے ہیں یا ان کو سخت سزا دینے والے ہیں؟۔ انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے (اور اپنے) رب کے رو برو عذر کرنے کے لیے اور (نیز) اس لیے کہ شاید یہ ڈر جاویں سو (آخر) جب وہ اس امر کے تارک ہی رہے۔ جو ان کو سمجھایا جاتا تھا (یعنی نہ مانا) تو ہم نے ان لوگوں کو تو بچا لیا جو اس بری بات سے منع کیا کرتے تھے، اور ان لوگوں کو جو (حکم مذکور میں) کرتے تھے ایک سخت عذاب میں پکڑ لیا۔ پھر یہ اس کے کہ وہ بے حکمی کیا کرتے تھے (یعنی) جب وہ جس کام سے ان کو منع کیا گیا تھا اس میں حد سے نکل گئے تو ہم نے ان کو (قہر) کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ''۔

اصحاب سبت کی بستی کہاں واقع تھی، یہ کس نبی کے دور کا واقعہ ہے؟ اسی طرح بعض دیگر ضرروی مسائل ونکات کی طرف توجہ مفسرین نے مبذول کرائی ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سوہاروی (۱۹۰۱۔۱۹۶۲) نے اپنی معروف کتاب 'قصص القرآن' میں اس واقعہ کے مقام کے متعلق دو باتیں نقل کی ہیں:

''جس بستی پر یہ حادثہ گزرا اس کا نام کیا ہے؟ قرآن عزیز سورہ اعراف میں صرف یہ بیان کرتا ہے کہ وہ ساحل بحر پر واقع تھی۔ مگر مفسرین اس کی تعیین میں متعدد نام لیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے ایک روایت یہ نقل کی جاتی ہے کہ یہ مدین کا واقعہ ہے۔ اور ابن زید کہتے ہیں کہ اس کا نام ''متنا'' تھا اور یہ مدین اور عیونا کے درمیان واقع تھا۔''

دوسرا قول علامہ ابن حجر عسقلانی کی معروف کتاب فتح الباری کے حوالے سے لکھا ہے:

''اس بستی کا نام ''ایلۃ'' تھا اور یہ بحر قلزم کے ساحل پر واقع تھی عرب جغرافیہ داں کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص طور سینا سے گزر کر مصر کو روانہ ہوتا تو طور سینا کی

---

۱ سیوہاروی، حفظ الرحمٰن، (مولانا)، قصص القرآن، مکتبہ قاسمیہ الفضل مارکیٹ، ۷۱ اردو بازار لاہور، جلد ۳، ص: ۵۸

جانب ساحل بحر پر یہ بستی ملتی تھی یا یوں کہہ لیجئے کہ مصر کا باشندہ اگر مکہ کا سفر کرے تو راہ میں یہ شہر پڑتا تھا، یہ قول راجح ہے''۔[1]

اس ضمن میں مفسرین نے ایک بحث یہ اٹھائی ہے کہ یہ واقعہ کس نبی کے زمانہ میں پیش آیا۔ چنانچہ اس بابت مفسرین کے کئی قول موجود ہیں۔ ان میں ایک قول یہ ہے کہ یہ حضرت داؤدؑ کے دور کا واقعہ ہے یہ قول 'قصص القرآن' کے مصنف نے شاہ عبدالقادر (۱۷۵۳-۱۸۱۴) کے حوالے سے لکھا ہے۔ لیکن دیگر مفسرین ابن جریر (۸۳۹ء-۹۲۳ء)، ابن کثیر (۱۳۰۱-۱۳۷۳)، ابوحبان (۸۸۴-۹۶۵) اور امام رازی (۱۱۵۰-۱۲۱۰) نے اس واقعہ کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ:

''قرآن کریم کے اسلوب بیان اور جلیل القدر مفسرین سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب سبت کا یہ واقعہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ کے درمیانی زمانہ میں کسی ایسے وقت پیش آیا جب کہ ایلہ میں کوئی نبی موجود نہیں تھے۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ وہاں کے علماء حق ہی کے سپرد تھا''۔[1]

یہاں یہ بحث مقصود نہیں کہ آیا یہ واقعہ کب اور کس وقت پیش آیا۔ راقم کو یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک قوم ایسی تھی جو سبت کے نام سے جانی جاتی تھی، اس قوم کی دینی اور مذہبی کارکردگی کے ساتھ قرآن نے ان کا طرز معاشرت بیان کیا ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن میں دیگر اقوام کا ذکر پایا جاتا ہے۔

اصحاب الرس:

مولانا سیوہاروی نے لکھا ہے کہ اصحاب رس کا واقعہ کب پیش آیا؟ اس بابت ۶۳۰ ق م بتایا ہے۔ یا مدت نا معلوم۔ قرآن کی سورہ ق اور سورہ فرقان میں ان کا ذکر آیا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کی تحقیق کے مطابق ''رس'' لغت میں پرانے کنوئیں کو کہا جاتا ہے۔ اس لیے اصحاب رس کے معنی ہوئے کنوئیں والے اس کے علاوہ دیگر محققین نے اصحاب رس کے کئی مفاہیم بیان کیے

---

[1] سیوہاروی، حفظ الرحمٰن، (مولانا)، قصص القرآن، جلد:۳، ص:۶۰

ہیں۔ان تمام تفصیلات کونظر انداز کرتے ہوئے یہاں بتانا ضروری ہے کہ جن قوموں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب واستہزاء کے سبب ہلاکت وتباہی مول لی ان کی فہرست صرف ان کا نام بیان کر دیا ہے۔دیگر تفصیلات نہیں بتائی ہیں۔[1] قرآن میں ارشاد ہے:

وَعَاداً وَثَمُودَ وَأَصْحَابَ الرَّسِّ وَقُرُوناً بَيْنَ ذَلِكَ كَثِيراً.
وَكُلّاً ضَرَبْنَا لَهُ الْأَمْثَالَ وَكُلّاً تَبَّرْنَا تَتْبِيراً۔[2]

''اور ہم نے عاد اور ثمود اور اصحاب الرس اور ان کے بیچ میں بہت سی امتوں کو ہلاک کر دیا اور ہم نے ہر ایک کے واسطے عجیب عجیب (یعنی) مضامین میں بیان کیے ہیں اور (جب نہ مانا تو) ہم نے سب کو بالکل برباد ہی کر دیا۔''

اصحاب رس کے متعلق دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

''اس سے پہلے قوم نوح اور اصحاب رس اور ثمود اور عاد اور فرعون قوم لوط اور اصحاب ایکہ اور قوم تبع تکذیب کر چکے ہیں (یعنی) سب نے پیغمبروں کو جھٹلایا، سیو میری وعید (ان پر) محقق ہوگئی''۔[3]

اصحاب کہف کا واقعہ:

قرآن کریم نے اصحاب کہف کا واقعہ بیان کیا ہے بلکہ ایک سورت کا نام بھی کہف رکھا ہے۔قرآن میں اس واقعہ کا ذکر کرنے کا سبب مفسرین کے یہاں درج ذیل ہے:

''ایک مرتبہ قریش مکہ میں یہ مشورہ ہوا کہ محمد ﷺ کا معاملہ بہت سنگین ہوتا جا رہا ہے۔اس لیے ایسا کوئی یقینی فیصلہ ہونا چاہیے کہ یہ صادق ہیں یا کاذب تاکہ ہم ان کے متعلق اپنی آخری رائے پر عمل کر سکیں۔بہتر یہ ہے کہ اس مسئلہ کو یہود مدینہ سے حل کیا جائے کیونکہ وہ خود کو اہل کتاب کہتے ہیں اور اس قسم کے معاملات میں صاحب بصیرت ہیں۔قریش نے اس غرض سے خضر بن حارث

---

[1] سیو ہاروی، حفظ الرحمٰن، (مولانا)، قصص القرآن، جلد:۳، ص:۷۶

[2] سورۃ الفرقان:۳۸-۳۹

[3] سورۃ ق:۱۲-۱۴

اور عقبہ بن معیط پر مشتمل ایک وفد علماء یہود کے پاس بھیجا۔ علماء یہود نے ان سے کہا کہ تم اس سے تین باتیں دریافت کرو اگر وہ صحیح صحیح جواب دیں تو بلاشبہ وہ خدا کے سچے رسول ہیں۔ تم کو ان کی ہرگز مخالفت نہیں کرنی چاہیے اور اگر وہ صحیح جواب نہ بتاسکیں تو تم کو اختیار ہے جو چاہو ان کے ساتھ کرو۔ وہ تین سوال یہ ہیں:

ذوالقرنین کا واقعہ کیا ہے؟

اصحاب کہف کون تھے اور ان پر کیا گزرا؟

روح کی حقیقت بیان کیجئے؟

وفد نے مکہ جا کر صنادید قریش سے صورت حال بتائی اور قریش نے اس بات کو بہت پسند کیا اور خدمت اقدس میں حاضر ہو کر آپ ﷺ سے درج بالا تینوں سوالات کئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کا جواب وحی آنے پر دوں گا چنانچہ جب وحی کے ذریعے آپ ﷺ کو ان واقعات کی حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا تب آپ ﷺ نے ان کے سامنے سورہ کہف تلاوت کر کے واقعات کی حقیقت ان پر واضح کر دی۔''[1]

اصحاب کہف کا پورا واقعہ سورہ کہف میں مذکور ہے۔ یہاں چند آیتوں پر اکتفا کیا جائے گا۔

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ آيَاتِنَا عَجَباً. إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَداً. فَضَرَبْنَا عَلَى آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَداً. ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَى لِمَا لَبِثُوا أَمَداً۔[2]

''کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور پہاڑ والے ہماری عجائبات

---

[1] سیوہاروی، حفظ الرحمٰن، (مولانا)، قصص القرآن، جلد:۳، ص: ۲۳۸

[2] سورۃ الکہف:۹-۱۲

(قدرت) میں سے کچھ تعجب کی چیز تھے۔ (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب کہ ان نوجوانوں نے (اس) غار میں جا کر پناہ لی پھر کہا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنے پاس سے رحمت (کا سامان) عطا فرمائیے۔ اور ہمارے لیے ہمارے (اس) کام میں درستی کا سامان مہیا کیجیے۔ سو ہم نے (اس) غار میں ان کے کانوں پر سالہا سال تک (نیند کا پردہ) ڈال دیا۔ پھر ہم نے ان کو اٹھایا تا کہ یہ معلوم کرلیں ان دونوں گروہ میں سے کون سا (گروہ) ان کے رہنے کی مدت سے زیادہ واقف تھا''۔

اس واقعہ کی تعین مدت اور دیگر احوال کے متعلق مفسرین کے یہاں کافی اختلاف پایا جاتا ہے ان تمام مباحث کو یہاں ترک کیا جارہا ہے۔

قرآن کریم میں پچھلی امتوں کے جن واقعات وقصص کو بیان کیا گیا ہے ان کا بنیادی طور پر ایک مقصد تو یہ ہے کہ ان کے حالات وکوائف اور تاریخ وتہذیب سے شناسائی پیدا کر کے نوع انسانی عبرت ونصیحت حاصل کر سکے۔ علاوہ ازیں اس بات سے بھی قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ واقعات اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ سابقہ امتوں، قوموں کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں جو مطالعۂ ادیان کا اہم پہلو ہے۔ مکالمۂ ادیان میں جن اصولوں سے بحث کی جاتی ہے ان میں یہ چیز واضح طور پر شامل ہے کہ اقوام وملل کی تاریخ، تہذیب وتمدن، دین و دھرم اور معاشرت کا پتہ لگایا جائے۔ اب اس تناظر میں دیکھتے ہیں کہ جہاں جہاں قرآن نے پچھلی امتوں کا ذکر کیا ہے وہاں جدید وقدیم مفسرین نے ان قوموں کی پوری تاریخ بڑی شرح وبسط کے ساتھ پیش کی ہے۔ جو مطالعۂ ادیان اور مذاکرات پر بنیادی مواد فراہم کرتی ہیں۔ ان واقعات وقصص کو یہاں رکھنے کا یہی مقصد ہے کہ ہم یہ جان سکیں کہ ان اقوام وملل کی کیا تاریخ وتمدن ہے۔

یہ عرض کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر وتشریح احادیث ہیں۔ لہذا محدثین نے بھی کتب احادیث میں دیگر اقوام وملل کے متعلق بڑی اہم اور علمی نکات پیش کیے ہیں۔ انسانی تمدن اور اس کے فکری و مذہبی خیالات کو سمجھنا، معلومات حاصل کرنا جہاں مؤرخین وسیرت نگاروں کے لیے ضروری ہے، وہیں عوام اور دیگر اصحاب علم کے لیے بھی ضروری

ہے کیونکہ جب تک ہم دوسری تہذیبوں، ان کے کردار و افکار اور تاریخ و معاشرت سے مکمل واقفیت حاصل نہیں کریں گے اس وقت تک معاشرے میں بدامنی اور ابتری کے بڑھنے کا خطرہ زیادہ ہے۔ اس بناء پر قرآن کریم کی تحریک پر مصنّفین و محققین اور باحثین و اسکالرس نے سابقہ اقوام کے متعلق نہایت جامع اور اہم کتب تصنیف فرمائیں۔ علماء و محققین کی ان کتابوں نے مطالعۂ ادیان کے لیے جو راستے فراہم کیے اور جو جدید باب وا ہوائے وہ کسی کی نظروں سے مخفی نہیں ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ امت مسلمہ کو دیگر اقوام و ملل کی پوری تاریخ کا جاننا اس لیے بھی ضروری ہے کہ امت مسلمہ کو دعوت و تبلیغ کا فریضہ سونپا گیا ہے۔ اسلام کی دعوت کا بنیادی حق اسی وقت ادا ہو پائے گا جب کہ ہم انسانی تاریخ پر گہری نظر رکھیں۔

مذکورہ تمام مباحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ قرآن میں سابقہ اقوام و ملل کے واقعات سے جہاں علمی و تحقیقی اور دعوتی گوشے اجاگر کرتے ہیں، وہیں وہ اس بات کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں کہ انسانی برادری کو ایک دوسرے کے متعلق پوری جانکاری ہونی چاہیے۔ تاکہ معاشرہ ہر اعتبار سے پرامن اور پرسکون رہے۔ اس لیے یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مطالعۂ ادیان اور مکالمہ ادیان کے موجد مسلمان ہیں۔ بھلے ہی آج مغرب نے اس میں بڑی مہارت حاصل کرلی ہو، یا مطالعۂ ادیان کے بڑے بڑے شعبہ جات قائم کر لیے ہوں۔ انہیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کا نظریہ سب سے پہلے قرآن نے پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے اس تحریک کو ایک زمانے تک ہمارے علماء اور مفکرین و مدبرین آگے بڑھاتے رہے جس کے نتیجہ میں مسلم اسکالرس نے تحریر لکھی ہیں۔ اس مضمون میں جن واقعات کو پیش کیا گیا ہے وہ بطور تمثیل ہے۔ ان کے علاوہ بھی اور کئی اقوام کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے۔ اصحاب الفیل، اصحاب الجنۃ، ذوالقرنین، ملکہ سبا، یہودی، نصاریٰ، صابئین، مجوسی وغیرہ وغیرہ۔

ہندو قوم کا ذکر قرآن کریم میں:

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندو قوم کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے؟ یہ عہد حاضر کا اہم سوال ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ہندو مذہب ایک قدیم مذہب ہے اس کی اپنی تاریخ و تہذیب

ہے۔ ہندوستان کی اکثریت ہندو مذہب کی اتباع کرتی ہے۔ اس کے علاوہ بنگلہ دیش، پاکستان، نیپال اور کئی دیگر ممالک میں بھی ہندوازم کے ماننے والے پائے جاتے ہیں۔

یہ بات سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی اقوام کے احوال اور ان کے دین مذہب اور تہذیب وتمدن کا ذکر کیا ہے۔ اس تناظر میں بہت سے محققین نے یہ قیاس کیا ہے کہ ہندو قوم کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے نیز انہوں نے اپنے دعویٰ کی تائید میں دلائل وبراہین بھی پیش کیے ہیں:

" إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ . وَإِن يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتَابِ الْمُنِيرِ۔ " [1]

''ہم نے آپ کو (دین) حق دے کر خوشخبری سنانے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈر سنانے والا نہ گزرا ہو اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلا دیں تو جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ انہوں نے بھی جھٹلایا تھا (اور) ان کے پاس بھی ان کے پیغمبر معجزے اور صحیفے اور روشن کتابیں لے کر آئے تھے۔''

آیت کا مفہوم یہ واضح کر رہا ہے کہ دنیا میں جتنی قومیں آئی ہیں انہیں کوئی نہ کوئی ڈر سنانے والا نبی، پیغمبر مبعوث ہوا ہے۔ لہذا آیت کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ہندوؤں میں بھی کوئی نہ کوئی نبی ضرور مبعوث ہوا ہوگا۔ چنانچہ یہ غلط فہمی کہ ہندوؤں کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ درست نہیں ہے۔ مولانا عبدالماجد قاسمی اپنے مقالہ ''قرآن کریم اور ہندو مذہب کی تعلیمات میں'' رقم کرتے ہیں:

''ہندو قوم کے تعلق سے مسلمانوں میں یہ غلط فہمیاں ہیں کہ قرآن وحدیث میں اس قوم کا ذکر موجود نہیں جب کہ قرآن وحدیث میں نہ صرف یہ کہ اس قوم کا ذکر موجود ہے بلکہ اس کے قبول اسلام کی واضح پیشین گوئی کے ساتھ قوت

[1] الفاطر: ۲۴۔۲۵

ایمان میں بے مثال حیثیت سے اس کا ذکر موجود ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے بار بار اس قوم کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ جسے تاریخ اسلام نے اس طور پر محفوظ کر رکھا ہے کہ رسول ﷺ نے حضرت سلمان فارسیؓ کی قوم (جو ایران و فارس میں آباد تھی) اور یمن کی قوم کے ایمان میں مضبوط ترین قوم کی حیثیت سے پیشن گوئی کی ہے۔ جو لوگ ہندوستان کی تاریخ سے واقف ہیں وہ اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ یہاں آ کر بسنے والی دو قومیں (۱) آرین جو ایران میں آباد تھی (۲) دراوڑ جو یمن میں آباد تھی یہاں پہنچ کر دونوں نے آپس میں مل کر ایک مذہب ''ہندو'' کے نام سے ایجاد کیا''۔[۱]

چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہے:

عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قال: قال رسول الله ﷺ: ای الخلق اعجب الیکم ایماناً؟ قالوا: الملائکة قال: و مالهم لا یومنون وهم عند ربهم؟ قالوا: فالنبیون، قال: وما لهم لا یومنون، والوحی ینزل علیهم؟ قالو: فنحن قال: وما لکم لا تومنون وانا بین اظهرکم قالوا: فمن یا رسول الله الا ان اعجب الخلق الی ایماناً لقوم یکونون من بعدکم یجدون صحفاً فیها کتاب یومنون بما فیها''۔[۲]

''حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (ایک دن صحابہ سے) پوچھا ایمان کے اعتبار سے کون سی مخلوق تمہارے نزدیک سب سے عجیب اور عزیمت والی ہے؟ صحابہ نے عرض

---

۱ سید عبدالرشید (مولانا)، مقالات کا مجموعہ، قرآن مجید اور عصر حاضر، قرآن اور ہندو مذہب کی تعلیمات، مقالہ نگار مولانا عبدالماجد قاسمی، ۲۰۱۲، ہدیٰ بک حیدرآباد، ص: ۱۲۰

۲ مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، کتاب المناقب، باب ثواب هذه الامة

کیا: فرشتے آپ نے فرمایا ان کے ایمان میں کیا عجیب بات ہے؟ وہ ایمان کیوں نہیں لاتے جب کہ وہ اپنے پروردگار کے قریب رہتے ہیں۔صحابہ نے کہا وہ جماعت انبیاء ہیں، آپ نے فرمایا کہ وہ ایمان کیوں نہ لاتے؟ جب کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے۔صحابہ نے کہا: یارسول اللہ! وہ ہم لوگ ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: تم ایمان کیوں نہیں لاتے جب کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔راوی کہتے ہیں کہ پھر رسول ﷺ نے فرمایا: بے شک تمام مخلوقات میں ایمان کے اعتبار سے عجیب ترین ایک قوم ہوگی، جو میرے بعد ہوگی اور وہ اپنے پاس کچھ صحیفے پائیں گے، ان صحائف میں کتاب ہے، جو کچھ ان صحائف میں ہے، اس پر وہ ایمان لائیں گے۔''

اس حدیث میں حضور ﷺ نے کسی بھی قوم کا نام لے کر ذکر نہیں کیا ہے بلکہ جو نکتہ ارشاد فرمایا وہ یہ ہے کہ میرے بعد ایک قوم ہوگی اس کے پاس کچھ صحیفے ہوں گے اور ان میں جو کچھ بھی ہوگا وہ اس پر ایمان لائے گی۔ دراصل یہ اشارہ محمد ﷺ کی امت کی جانب ہے، کیونکہ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ تمام آسمانی کتابوں میں محمد ﷺ کی صفات کو بیان کیا گیا ہے۔اس لیے اس میں ہندو قوم بھی شامل ہے، ہم جانتے ہیں کہ ہندوؤں کی تمام دینی کتابوں، ویدوں، شاستروں اور گرنتھوں میں حضور ﷺ کا ذکر موجود ہے۔جس طرح توریت، انجیل اور زبور میں آپ ﷺ کا ذکر کیا گیا ہے۔اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث میں ہندو قوم کا بھی ذکر موجود ہے۔اس بابت ایک اور تحقیق اور قابل غور پہلو شمس نوید عثمانی نے اپنی کتاب 'اگر اب بھی نہ جاگے تو' میں پیش کیا ہے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ قرآن میں دیگر اقوام کے ساتھ ساتھ ہندو قوم کا بھی ذکر موجود ہے۔ان کا کہنا یہ ہے:

'' قرآن پاک میں بہت سی ایسی قوموں کا تذکرہ ملتا ہے جنہیں مفسرین آج تک متعین نہیں کر سکے جیسے اصحاب الرس اور قوم تبع، خصوصاً صابئین کا ذکر تو جگہ جگہ کلام پاک میں مومنین، یہود اور نصاریٰ کے ساتھ اس حیثیت کیا گیا ہے جیسے یہ بہت بڑی قوم یا دنیا کے منفرد گروہوں میں سے

ایک ہوں۔''

اسی طرح انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن مجید پر محض یہ الزام ہے کہ قرآن میں ہندو قوم کا ذکر نہیں ہے۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''بے شک قرآن کے اولین مخاطب اہل عرب تھے لیکن اگر یہ صرف ۱۴۰۰ سال پرانی کتاب نہیں ہے بلکہ رہتی دنیا تک کے حالات و واقعات کا اس میں ذکر ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس قوم کا اس میں ذکر نہ ہو جو دنیا کی قدیم ترین مذہبی قوم ہے اور نزول قرآن سے ہزاروں سال قبل آج تک بہت بڑی دنیا میں موجود ہے۔ یہ قرآن پر ایک الزام ہے''۔[۱]

شمس نوید عثمانی (۱۹۲۷۔۱۹۹۳) نے اپنی کتاب میں ایک اقتباس شری گنگا پرشاد اپادھیائے کی کتاب 'مصابیح الاسلام' سے نقل کیا ہے:

''قرآن شریف میں کئی جگہ پر تو یہ کہا ہے کہ خدا مختلف قوموں کی ہدایت کے لیے مختلف نبیوں کو بھیجتا ہے لیکن خصوصاً کسی کا تذکرہ نہیں ہے۔ تماشے کی بات یہ ہے کہ جو پرانی قومیں ہیں اور جن کی تہذیب کی تواریخ ہزاروں سال پرانی ہے جیسے ہندوستان، چین وغیرہ ان کا کچھ بھی اشارہ تک نہیں۔ گویا اس الہام سے جس کو قرآن یا کلام مجید کے نام سے پکارا جاتا ہے عام انسانی جماعت کا کوئی تعلق ہے ہی نہیں۔''[۲]

اس طرح کے اعتراضات یقیناً بہت سارے افراد کے ذہنوں اور دماغوں میں پنپ رہے ہوں گے اور وہ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ واقعی قرآن نے ہندو قوم کا ذکر نہیں کیا ہے۔ چنانچہ اس طرح کے شکوک وشبہات کو رفع کرنے کے لیے شمس نوید عثمانی نے یہ بحث اٹھائی ہے کہ قرآن میں بھی ہندو قوم کا ذکر موجود ہے اور ان کی تحقیق کے مطابق لفظ صابئین سے ''ہندو قوم'' ہی مراد ہے۔

---

۱ عثمانی، شمس نوید، اگر اب بھی نہ جاگے تو، روشنی پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۹ء، ص: ۳۹

۲ ایضاً، ص: ۳۸-۳۹

انھوں نے اپنی اس رائے کی حمایت میں قرآن کی درج ذیل آیت پیش کی ہے:

" إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَالَّذِيْنَ هَادُواْ وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِيْنَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحاً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ "۔[1]

"یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان اور یہودی اور نصاریٰ اور فرقۂ صابئین (ان سب میں) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ (کی ذات اور صفات) پر اور روز قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے ایسوں کے لیے ان کا حق الخدمت بھی ہے ان کے پروردگار کے پاس اور (وہاں جا کر) کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں، ان پر اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔"

درج بالا آیت سے شمس نوید عثمانی نے استدلال کیا ہے:

"اس آیت میں صابئین کا ذکر یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ قرآن میں جہاں جہاں صابئین کا ذکر ہے ان ہی بڑی بڑی قوموں کے ساتھ ہے۔ اتنی اہمیت کی حامل قوم جس کا خصوصی تذکرہ قرآن پاک نے دنیا کی بڑی بڑی قوموں کے ساتھ کیا ہے۔ اس کو ہم آج تک تلاش نہیں کر سکے۔ حالانکہ انہیں مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح آج بھی اور آئندہ آنے والے زمانے میں بھی دنیا کی نمایاں مذہبی قوموں میں سے ہونا چاہیے۔ اگر ہم غور کریں تو تلاش کا دائرہ بہت محدود ہو گیا ہے۔ مسلمان، عیسائیوں اور یہودیوں کے علاوہ دنیا میں کتنی بڑی بڑی مذہبی قومیں اور ہیں؟ انہیں میں صابئین کو ہونا چاہئے"۔[2]

اہل علم نے ایک اور اہم نکتہ بیان کیا ہے۔ حضرت نوحؑ کی قوم ہی صابئین میں شامل

---

[1] سورہ بقرۃ:۶۲

[2] عثمانی، شمس نوید، اگر اب بھی نہ جاگے تو، روشنی پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۹ء، ص:۳۹-۴۰

ہے ''اگر اب بھی نہ جاگے تو'' کے مصنف نے اس بابت کئی ایسے شواہد پیش کیے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ صابئین قوم کا ذکر قرآن وحدیث میں آیا ہے دراصل یہ قوم قوم نوح ہے۔ انہوں نے اپنی اس بات کے استدلال میں امام ابوحنیفہ (۶۹۹۔ ۷۶۷) ابوالزناذ (۶۸۵۔ ۷۴۸) علامہ قرطبی (۱۲۱۴۔۱۲۷۳) علامہ ابن تیمیہ (۱۲۶۳۔ ۱۳۲۸) امام غزالی (۱۰۵۸۔ ۱۱۱۱) امام راغب (۱۱۰۸) ابن جریر طبری (۸۳۹۔۹۲۳) ابن کثیر (۱۳۰۱۔۱۳۷۳) علامہ شوکانی (۱۷۵۹۔۱۸۳۴) قاضی بیضاوی (۱۲۸۶) عبد الماجد دریابادی (۱۸۹۲۔ ۱۹۷۷) اور سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴۔۱۹۵۳) کے اقوال وافکار کو جمع کیا ہے۔ ذیل میں ان کو پیش کیا جا رہا ہے:

۱۔ عراق کے اس مقام کے رہنے والے لوگ تھے جہاں ابراہیم پیدا ہوئے تھے۔ حضرت ابراہیم کے مقام پیدائش اور ہندوستانی تہذیبوں، ہڑپا اور موہن جوداڑو کے کھنڈرات کی کھدائی سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ دونوں تہذیبوں کے درمیان بہت قریبی روابط تھے۔

۲۔ اہل کتاب تھے۔

۳۔ لا الہ اللہ کہتے تھے لیکن مشرک تھے۔

۴۔ یمن کی طرف منھ کر کے نماز پڑھتے تھے۔

۵۔ صابئین عجمی (غیر عرب) نام ہے عربی نہیں۔

۶۔ فرشتوں کی پجاری قوم تھی۔ (ہندو مذہب میں بہت سے دیوتاؤں کا تصور فرشتوں کا ہے اور وہ ان کی پوجا کرتے ہیں۔)

۷۔ جماعت ستارگان اور نجوم کے معتقد تھے۔ (اقوام عالم میں شاید کسی قوم کو نجوم میں اتنی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ اور نہ ہے جتنی ہندوستانی ہندو قوم کو ہے۔)

۸۔ ستاروں کی پوجا کرنے والے مختلف ستاروں اور سیاروں کی پوجا موجودہ ہندو مذہب کا جز ہے۔

۹۔ آگ کی پوجا کرتے ہیں (یہ آگ کی پوجا، ہون، شادی، ارتھی وغیرہ میں ہندو قوم میں رائج ہے۔)

۱۰۔ زرتشت ایرانی نسل (یہ لوگ بھی آگ کے پجاری تھے، اور ہندو بھی ہیں۔ یہ بھی آرین تھے اور ادھر سے ہی آرین ہندوستان میں آئے۔)

۱۱۔ مذہبا دن میں کئی مرتبہ غسل کرنے والے (مذہباً دنیا میں غسل کی اہمیت شاید سب سے زیادہ ہندومت ہی میں ہے۔ ان کی پوجا اشنان کے بغیر نہیں ہوتی اس کے علاوہ مختلف موقعوں پر اجتماعی اشنان ہوتے ہیں۔)

مذکورہ تمام شواہد ہندو قوم پر صادق آتے ہیں۔ خواہ مختلف ادوار میں مفسرین الگ الگ قوموں کو صابئین بتلاتے رہے ہیں۔ لیکن اس دور میں یہ سب خصوصیات اس قوم میں ایک ہی جگہ پائی جاتی ہیں، یہ ہوسکتا ہے کہ مندرجہ بالا خصوصیات یا عقائد رکھنے والی تمام جماعتیں ماضی میں نقل مکان کرتے ہوئے ہندوستان میں اکٹھی ہوچکی ہوں۔[1]

ضمن میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۷۰۳-۱۷۶۲) کی رائے ملاحظہ کرتے چلیے کہ وہ صابئین کو آرین نسل ہی مانتے ہیں چنانچہ رسالہ 'الفرقان' بریلی نے شاہ ولی اللہ نمبر شائع کیا تھا، اس میں ایک اہم مضمون مولانا عبید اللہ سندھی (۱۸۷۲-۱۹۴۴) نے ''شاہ ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف'' کے عنوان سے لکھا ہے اس میں مولانا سندھی نے شاہ صاحب کے حوالے سے کچھ ایسی باتیں پیش کی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صابئین حضرت نوحؑ کی قوم کا نام ہے۔ اور آرین نسل کا دوسرا نام صابئین ہے:

> ''مسیحؑ ضرور ایسے بزرگ تھے جنہوں نے اس تعلیم کو غیر اسرائیلی لوگوں میں بالفاظ دیگر صابئین یا آرین قوموں میں بھی پہونچانے کی کوشش کی''۔[2]

مولانا عبید اللہ سندھی اپنے مضمون میں مزید تحریر کرتے ہیں:

> ''سورہ جمعہ میں امیین کے بعد آخرین منہم لما یلحقوا بھم کا ذکر آیا ہے۔ اس کی تفسیر میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے ایرانی قوم کی طرف

---

[1] عثمانی، شمس نوید، اگر اب بھی نہ جاگے تو، روشنی پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۹ء، ص: ۴۱-۴۲

[2] الفرقان (بریلی)، شاہ ولی اللہ نمبر، مدیر مولانا محمد منظور نعمانی، مضمون، شاہ ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف، مضمون نگار، مولانا عبید اللہ سندھی، ص: ۲۸۹

اشارہ نکل سکتا ہے۔ ایران اس زمانہ میں آرین (صابی) قوموں کا مرکز بن چکا تھا، اس سے پہلے زمانے میں ہندوستان کو یہ مرکزیت حاصل تھی، ہماری سمجھ میں ''و آخرین منہم'' کے مصداق میں ایران اور ہند شامل ہونے چاہئیں۔ ہم اس حصہ کو قرآن حکیم کی بین الاقوامی تعلیم کا متن سمجھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت جیسے امیین کے لیے ہے ویسے ہی آخرین کے لیے بھی ہے''۔[1]

یہاں ایک اور اقتباس علامہ سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء-۱۹۵۳ء) کا پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

''مغضوب اور ضال جس طرح اہل کتاب میں ہیں اپنی اپنی مزاجی کیفیت کی بنیاد پر وہی صورتیں متابعۃ شبہ اہل کتاب میں بھی ہیں جن کی دو جماعتوں سے ہم کو قرآن نے واقف کرایا اور وہ مجوس اور صابئین ہیں جن میں ایران اور ہند قدیم کے باشندے بھی داخل ہیں''۔[2]

مذکورہ جملہ شواہد اس بات کی جانب اشارہ ضرور کرتے ہیں کہ صابئین سے مراد ہندو قوم ہے۔ اور ہندو قوم کے نبی حضرت نوحؑ ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ مذکورہ باتوں پر یقین کیا جائے، یا انہیں تسلیم کیا جائے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ اس بحث سے علمی وفکری حلقوں میں ایک مثبت بازگشت سنائی دے گی، جو اہل علم کو اس بات پر آمادہ کرے گی کہ اس امر کی مزید تحقیق و تفتیش اور مطالعہ ہونا چاہیے کہ آیا مذکورہ تمام باتیں درست ہیں، یا پھر یہ محض قیاس آرائیاں اور ظنی باتیں ہیں؟۔ یہاں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ مذکورہ شواہد جو اشارہ کر رہے ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ ہندو قوم صابی قوم ہے اور ان کے نبی حضرت نوحؑ ہیں۔

---

[1] الفرقان (بریلی)، شاہ ولی اللہ نمبر، مدیر مولانا محمد منظور نعمانی، مضمون، شاہ ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف، مضمون نگار، مولانا عبید اللہ سندھی، ص: ۲۹۵

[2] ابو محمد امام الدین (مولانا)، حکومت الہیہ اور علماء و مفکرین، مکتبہ نشاۃ ثانیہ پنچلگوڑہ حیدرآباد، ۱۹۴۶، ص: ۲۱۴-۲۱۵

متذکرہ سطور میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ صابئین سے مراد ہندو قوم ہے اس طرح ہندو قوم کا تذکرہ قرآن کریم میں ملتا ہے۔ دراصل صابئین سے مراد کون سی قوم ہے اس بابت مفسرین کے یہاں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ یہ رائے کہ اس سے ہندو قوم مراد ہے تو اس پر بھی غور وفکر کرنا چاہئے۔ اس ضمن میں محققین نے ایک بحث یہ کی ہے کہ ہندو قوم، قوم نوح ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر یہ کہنا قطعی غلط نہیں ہے کہ ہندو قوم کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھنا ہوگا کہ ویدک دھرم دنیا کے تمام مذاہب میں بالاتفاق سب سے قدیم مذہب ہے اور حضرت نوحؑ سب سے پہلے صاحب شریعت رسول تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کا یقین کیسے کیا جائے ہندو مذہب سب سے قدیم دھرم ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ویدوں کو ہندوؤں کے مفکرین وعلماء کی اکثریت آسمانی بتاتی ہے (یہ ممکن ہے کہ ان کی موجودہ شکل تبدیل شدہ ہو) ان میں اس قوم کا نبی کون سا بتایا گیا ہے یہ مسئلہ قابل وضاحت ہے۔ ہندوؤں کی تہذیب اور ثقافت پر ایک اہم اور مستند کتاب فرانسیسی مصنف Abbe. A. Dubois نے Hindu Manners, Customs Ceremonies. کے نام سے تصنیف کی ہے۔ واضح رہے ہیں کہ انہوں نے ہندو مذہب اور ہندوستانی تہذیب کا مطالعہ چالیس برس تک کیا ہے۔ اس کتاب کا انگلش ترجمہ Henry K. Beaucha- mp, C-I-E نے کیا ہے۔ اس کتاب میں کئی حقائق ایسے پیش کیے گئے ہیں۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندو قوم قوم نوح ہے، نیز ویدوں یا ہندو مذہبی گرنتھوں میں Mahanuvu لفظ آیا ہے اس سے مراد حضرت نوح ہیں۔[1]

اسی طرح یہی مصنف ایک اور حقیقت بیان کرتا ہے وہ یہ کہ سیلاب عظیم میں تمام نسل انسانی ختم ہوگئی سوائے سات عبادت گزار رشیوں کے ایک اور مشہور شخصیت بچنے والوں میں تھی۔ لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ ہندو قوم، نوحؑ کی قوم ہوسکتی ہے۔[2]

---

[1] Abbej. a. Dubois, Hindu Manners, Customs Ceremonies. oxford at the clarendn press 1906, p.48

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے: ایضاً، ص: ۴۱۶-۴۱۷

علاوہ ازیں ''اگر اب بھی نہ جاگے تو'' کے مصنف نے بعض دیگر شواہد بھی پیش کیے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ہندو قوم قوم نوح ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''دنیا کی تمام قوموں کو دو طرح کی نسلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سامی نسلیں اور غیر سامی قومیں۔ غیر سامی قوموں میں آرین نسل آتی ہے اور سمیٹک قوموں میں یہودی عیسائی اور جزیرہ نمائے عرب کے نبی اسماعیل۔''

دنیا کی دو نسلوں میں تقسیم ہونے اور ان میں سے ایک نسل کا تعلق حضرت نوحؑ سے ہونے کی قرآن بھی تصدیق کرتا ہے:

أُولَئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِن ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا [1]

''یہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے خاص انعام فرمایا ہے منجملہ (دیگر) انبیاء کرام کے آدم کی نسل سے اور ان لوگوں (کی نسل) سے جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ سوار کیا تھا اور ابراہیم اور یعقوب کی نسل سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت فرمائی اور ان کو مقبول بنایا۔''

اس آیت کے ذیل میں علماء نے لکھا ہے:

''قرآن مجید کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نسل آدم میں سے حضرت نوحؑ کے ساتھیوں کی نسل ہے اور حضرت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام کی نسل یعنی بنی اسرائیل سامی نسل ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ حضرت نوحؑ کے ساتھیوں کی نسل غیر سامی یا آرین نسل ہونی چاہئے''۔[2]

مذکورہ تمام تفصیل کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہندو قوم کے نبی حضرت نوحؑ ہیں اور ہندو قوم، نوحؑ کی امت ہیں۔ سابقہ سطور میں جو شواہد پیش کے گئے ہیں ان کے علاوہ بھی

[1] مریم:۵۸

[2] اگر اب بھی نہ جاگے تو، ۳۶۔۳۷

بہت سے شواہد ملتے ہیں۔ بنا بریں اگر ہندو مذہبی کتب و گرنتھوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت نوح کو ''منو'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

قرآن میں سابقہ شریعتوں کا ذکر:

قرآن ایک ایسی جامع اور مکمل و مدلل کتاب ہے۔اس میں زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔خواہ ان کا تعلق دین و شریعت سے ہو یا سماج و سیاست سے، دین و شریعت کا ایک حصہ یہ ہے کہ جتنی بھی آسمانی کتابیں نازل ہوئی ہیں ان سب پر ایمان و یقین رکھا جائے اور یہ بات تسلیم کی جائے کہ مذکورہ تمام کتب و صحائف اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کیے گئے تھے۔ اسی طرح تمام انبیاء اکرام کی بعثت کو برحق ماننا ایمان کا جزو ہے۔قرآن نے جہاں دیگر انبیاء اور سابقہ قوموں کے احوال و کوائف اور تہذیب و معاشرت کو ذکر کیا ہے، وہیں سابقہ شریعت کی شکل میں جو کتابیں نازل کی گئی ہیں ان کا بھی ذکر کیا ہے۔اس لحاظ سے مطالعۂ ادیان اور مکالمہ کی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔اسلام کی تعلیمات اس قدر توسع اور رواداری پر مبنی ہیں کہ اس نے اپنے بنیادی دینی مصدر قرآن میں سابقہ ادیان کی شرائع کا ذکر کیا اور نوع انسانیت کے لیے افہام و تفہیم اور مذاکرات و مکالمات کے تئیں ایک مثبت پلیٹ فارم مہیا کیا۔قرآن سابقہ انبیاء پر نازل کردہ کتب کا تذکرہ کچھ اس انداز میں کرتا ہے:

قُلْ آمَنَّا بِاللّهِ وَمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَالنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لاَ نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ[1]

''آپ فرما دیجئے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس ہر جو ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس پر جو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ اور اولاد یعقوبؑ کی طرف بھیجا گیا۔ اور اس پر جو موسیٰؑ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو دیا گیا ان کے

---

[1] آل عمران:۸۴

پروردگار کی طرف سے اس کیفیت سے کہ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم تو اللہ ہی کے مطیع ہیں۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

والَّذِيْنَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ۔[1]

''اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر جو آپ کی طرف اتاری گئی اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں۔''

قرآن کریم میں زبور کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ۔[2]

''یہ ہمارے ذمہ وعدہ ہے (اور) ہم ضرور (اس کو پورا) اور ہم زبور (اور سب آسمانی کتابوں) میں ذکر (یعنی لوح محفوظ میں لکھنے) کے بعد لکھ چکے ہیں اس زمین (یعنی جنت) کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ تورات اور انجیل کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ[3]

''اور اللہ تعالیٰ ان کو تعلیم فرمادیں گے (آسمانی) کتابیں اور سمجھ کی باتیں اور (بالخصوص) توریت اور انجیل''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ. مِن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُواْ بِآيَاتِ اللّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَاللّهُ عَزِيْزٌ ذُو انتِقَامٍ۔[4]

---

[1] سورۃ البقرہ:۴ [2] سورۃ الانبیاء:۱۰۵

[3] سورۃ آل عمران:۴۸ [4] سورۃ آل عمران:۳۔۴

''اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس قرآن بھیجا ہے واقعیت کے ساتھ اس کیفیت سے کہ وہ تصدیق کرتا ہے ان (آسمانی) کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور (اس طرح) توریت اور انجیل کو اس کے قبل لوگوں کی ہدایت کے واسطے اور اللہ تعالیٰ نے بھیجے معجزات بے شک جو لوگ منکر ہیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ان کے لیے سزا سخت ہے۔''

مذکورہ آیتیں اور قرآن کی دیگر کئی آیتوں سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہیں کہ قرآن سابقہ کتابوں جو متعدد اوقات میں مختلف انبیاء ورسل پر نازل کی گئی ہیں ان کا ذکر کرتا ہے۔ اس طرح قرآن نے صحف ابراہیم کا بھی ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

'' أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَى. وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى۔''[1]

''اور کیا اس مضمون کی خبریں پہنچی جو موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں ہے اور نیز ابراہیم کے جنہوں نے احکام کی بجا آوری کی۔]

دوسری جگہ ارشاد ہے:

'' إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَى. صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى ''[2]

''اور یہ مضمون اگلے صحیفوں میں بھی ہے یعنی ابراہم اور موسیٰ کے صحیفوں میں''۔

سابقہ شریعتیں مسلم مفکرین کی نظر میں:

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے اپنی کتاب 'قرآن کریم اور آسمانی صحیفے' میں لکھا ہے:

''قرآن کریم صحف سماوی میں سے صحف ابراہیم، توریت، زبور اور انجیل کا تذکرہ کرتا ہے اور بعض تعلیمات اور احکام بیان کرتے ہوئے جا بجا ان کے حوالے بھی دیتا ہے، گزشتہ آسمانی کتابیں آج جس صورت میں ملتی ہیں۔ اس

---

[1] سورۃ النجم: ۳۶۔۳۷ [2] سورۃ الاعلیٰ: ۱۸۔۱۹

میں بھی ان میں قرآن کے حوالوں کو تلاش کرنا فائدے سے خالی نہیں، اس لیے کہ ان کے محرف ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کلام الٰہی سے یکسر خالی اور محض بے بنیاد ہیں۔ روایات اور واقعات کا پلندہ ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں اب بھی حکمت و معرفت کے اور کلام ربانی کے جواہر پوشیدہ ہیں۔ اس عمل سے جہاں ہم ان آسمانی کتابوں میں کلام الٰہی اور کلام انسانی کے مابین امتیاز کر سکیں گے، وہیں اس کے ذریعہ حکمت قرآن کا صحیح فہم بھی حاصل ہو سکے گا۔ اور اس کے معنی کی صحیح تعیین کی جا سکے گی''۔[1]

ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی اپنی مذکورہ کتاب میں مولانا امین احسن اصلاحی (۱۹۰۴۔ ۱۹۹۷) کی معروف تفسیر 'تدبر قرآن' کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''یہ ایک حقیقت کہ جس طرح قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اسی طرح توریت اور انجیل بھی اللہ ہی کے اتارے ہوئے صحیفے ہیں۔ اگر ان کے بدقسمت عاملوں نے ان صحیفوں میں تحریفیں نہ کر دی ہوتی تو یہ بھی اسی طرح ہمارے لیے رحمت و برکت تھے۔ جس طرح قرآن ہے۔ لیکن ان تحریفات کے باوجود آج بھی ان کے اندر حکمت کے خزانے ہیں۔ اگر آدمی ان کو پڑھے تو یہ حقیقت آفتاب کی طرح سامنے آتی ہے کہ ان صحیفوں کا سرچشمہ بھی بلاشبہ وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ میں ان کو بار بار پڑھنے کے بعد اس رائے کا اظہار کرتا ہوں کہ قرآن کی حکمت کے سمجھنے میں جو مدد ان صحیفوں سے ملتی ہے وہ مشکل ہی سے کسی دوسری چیز سے ملتی ہے''۔[2]

مولانا حمید الدین فراہی (۱۸۶۳۔۱۹۳۰) نے 'تفسیر نظام القرآن' کے مقدمہ میں بڑی اہم بات لکھی ہے:

''جس طرح سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد تاروں کی روشنی کی ضرورت

---

[1] ندوی، محمد رضی الاسلام (ڈاکٹر)، قرآن کریم اور آسمانی صحیفے، اریب پبلی کیشنز، ۲۰۱۳، ص: ۹۔۱۰

[2] ایضاً، ص: ۱۰

باقی نہیں رہتی ہے۔ اسی طرح قرآن کے نازل ہوجانے کے بعد مسلمان بھی ان پچھلی آسمانی کتابوں سے بالکل بے نیاز ہوگئے، جن میں جھوٹی اور سچی ہر قسم کی باتیں ملادی گئی ہیں اس وجہ سے ہمارے لیے پچھلے صحیفوں کی تعلیمات کو جاننا ضروری ہے۔ اس سے قرآن مجید کی وہ اشارات بھی واضح ہوں گے جو ہمارے دور آخر کے مفسرین سے مخفی رہ گئے اور اس کے سبب سے وہ ایک سے زیادہ مقامات میں اصل حقیقت تک نہ پہنچ سکے''۔[1]

قرآن نے صحف ابراہیم کا ذکر بھی کیا ہے، چنانچہ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں بعض ضروری مباحث کا ذکر کیا جائے۔ اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ صحف ابراہیم کی تعداد کتنی ہے۔ دوسری بحث یہ ہے کہ صحف ابراہیم کا زمانۂ نزول کیا ہے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ صحف ابراہیم کی موجودہ کیفیت کیا ہے۔ دراصل یہ بات مختلف فیہ ہے کہ صحف ابراہم کی تعداد کتنی ہے چنانچہ ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی نے اپنی کتاب 'قرآن کریم اور آسمانی صحیفے' میں ایک حدیث کے حوالے سے لکھا ہے:

'' عن ابی ذر قال: دخلت المسجد فاذا رسول الله ﷺ جالس وحده قلت یا رسول الله! کم کتاباً انزله الله؟ قال: مئة کتاب و اربعة کتب: انزل علی شیث خمسون صحیفة، و انزل علی اخنوخ ثلاثون صحیفة، وانزل علی ابراهیم عشر صحائف وانزل التوراة والانجیل والزبور والفرقان''۔[2]

''حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ فرماتے ہیں: میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے کتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں؟ ارشاد فرمایا ایک سو چار کتابیں: حضرت شیث پر پچاس صحیفے، حضرت اخنوخ (ادریس) پر

[1] ندوی، محمد رضی الاسلام (ڈاکٹر)، قرآن کریم اور آسمانی صحیفے، اریب پبلی کیشنز، ۲۰۱۳، ص: ۱۰-۱۱

[2] الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، ج ۲، ص: ۷۶-۷۷

تیس صحیفے اور حضرت ابراہیم پر تیس صحیفے اور تورات اور انجیل اور زبور اور فرقان یعنی قرآن کریم نازل فرمایا۔''

اس کے علاوہ ایک اور روایت ملتی ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم پر بیس صحیفے نازل ہوئے۔[1] یہاں یہ بتانا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان صحائف کا زمانہ نزول کیا ہے اس بابت علماء نے لکھا ہے کہ اولاً تو کوئی حتمی اور یقینی بات نہیں کہی جاسکتی ہے کہ ان کا زمانہ نزول کیا ہے۔ البتہ بعض قرائن سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان کے نزول کا زمانہ قوم لوط کی ہلاکت کے بعد کا ہے، چنانچہ مولانا اشرف علی تھانوی (۱۸۶۲۔۱۹۴۳) نے اپنی کتاب ''ترتیب الطیف فی قصۃ الکلیم والحنیف'' میں لکھا ہے:

''حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صحف قوم لوط کی ہلاکت کے بعد ملے ہوں گے۔ اس لیے کہ سورہ نجم میں قوم لوط کے ہلاک ہونے کا بھی ذکر ہے''۔[2]

اب رہ جاتی ہے۔ یہ بات کہ صحف ابراہیمی کا اس وقت وجود کہاں ہے اس بابت بعض محققین کو کچھ کتابیں ایسی ملی ہیں جو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۲۔۱۹۷۷) کی تفسیر کے حوالے سے لکھا ہے:

''۱۸۹۲ میں ایم آر جیمس نے یونانی زبان سے ایک قدیم صحیفۂ ابراہیمی کا ترجمہ کیمبرج سے شائع کیا اور پھر یورپی زبانوں میں اس کے ایڈیشن نکلے ہیں۔ اسی طرح لندن کی ایک مذہبی سوسائٹی نے ۱۹۲۷ میں ایک کتاب وصیت نامہ ابراہیم (The Testment of Abraham) کے نام سے شائع کی تھی جو یونانی زبان میں کسی کا ترجمہ تھی۔ اور اس کو مسٹر جی ایچ بوکس نے یونانی سے انگریزی میں منتقل کیا تھا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اصل کتاب عبرانی زبان میں تھی اور اس کو پہلی صدی عیسوی میں مصر میں یونانی زبان کا لباس پہنایا گیا تھا۔

---

[1] قرآن کریم اور آسمانی صحیفے، ص: ۷۰

[2] تھانوی، اشرف علی (مولانا)، الترتیب اللطیف فی قصۃ الکلیم والحنیف، مطبع اشرف المطابع تھانہ بھون، ۱۳۲۷ھ، ص: ۴۰۰، بحوالہ قرآن کریم اور آسمانی صحیفے، ص: ۷۱

ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی (۱۹۲۱۔ ۱۹۸۶) نے اپنی کتاب ''العروبہ'' میں ایک کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے، جسے کسی زمانہ میں بائبل سوسائٹی نے صحیفۂ ابراہیم (The Book of Abraham) کے نام سے شائع کیا تھا، اس کی بعض تعلیمات کا قرآنی تعلیمات سے موازنہ کیا ہے۔ اور بڑے دل چسپ انداز میں دونوں کی تعلیمات دکھانے کی کوشش کی گئی ہے'' ۔[۱]

معروف مجدد سیرت اور مفکر اسلام ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۱۹۰۸۔۲۰۰۲) نے مطالعۂ ادیان کے حوالے سے اپنی مختلف تصانیف میں اظہار خیال کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی ایک معروف کتاب Introduction to Islam (اسلام کیا ہے) میں تحریر کرتے ہیں:

''دنیا کے تمام اہم مذاہب کی بنیاد مخصوص مقدس کتابیں ہوتی ہیں اور اکثر ان کا ماخذ اللہ کی طرف سے آنے والی وحی قرار دیا جاتا ہے، تاہم اگر بدقسمتی سے مقدس کتاب کا اصل مسودہ کسی طرح ضائع ہو جائے تو اس کا جو متبادل تیار کیا جائے گا وہ کبھی بھی مکمل طور پر اصل کے مطابق نہیں ہوسکتا۔ شاید ہندو، بدھ، یہودی، پارسی اور مسیحی اپنے اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات کو محفوظ رکھنے کے طریقے کا مسلمانوں کے طریقے سے موازنہ کرنا چاہیں، مگر سوال یہ ہے کہ ان کی کتابیں کس نے تحریر کیں؟ اس کونسل در نسل کس نے منتقل کیا؟ جو مسودے اگلی نسل کو منتقل ہوئے اصل تھے یا محض ان کے تراجم تھے؟ کیا ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کے مابین جنگ و جدل نے مسودوں کی نقول کو نقصان نہیں پہنچایا؟ کیا مختلف مذاہب میں اندرونی تضادات اور خلا نہیں پائے جاتے ہیں جن کا حوالہ کسی دوسری جگہ سے مل جاتا ہے۔ یہ وہ چند اہم سوالات ہیں، جن کا سامنا سچائی کے حقیقی متلاشی کو کرنا پڑتا ہے اور جو اطمینان بخش جوابات کے متقاضی ہیں'' ۔[۲]

---

۱ قرآن کریم اور آسمانی صحیفے، ص: ۲۷

۲ محمد حمید اللہ (ڈاکٹر)، اسلام کیا ہے، مترجم: سید خالد جاوید شہید، پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۱۳، ص: ۴۰-۴۱

ان معروضی سوالات کے بعد ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے کتب سماوی اور صحف انبیاء کے متعلق مزید علمی و تحقیقی باتیں کہی ہیں وہ لکھتے ہیں:

''حضرت آدمؑ پر دس صحیفے نازل ہوئے تھے لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں وہ کس زبان میں تھے۔ چہ جائے کہ ان کے مندرجات کا علم ہو۔ حضرت آدمؑ کے بیٹے حضرت شیثؑ بھی پیغمبر تھے ان کے متعلق بعض روایات میں ذکر ملتا ہے کہ ان پر بھی چند کتابیں نازل ہوئی تھیں لیکن ان کا بھی اب دنیا میں کوئی وجود نہیں۔ قدیم ترین نبی جس کی طرف منسوب کتاب کا کچھ حصہ ابھی حال ہی ہم تک پہنچا ہے حضرت ادریسؑ ہیں۔ کچھ عرصے پہلے فلسطین میں بحر مردار (Dead Sea) کے پاس بعض غاروں میں کچھ مخطوطے ملے ہیں۔ ان مخطوطوں میں سے ایک کتاب حضرت اخنوخ یا انوخ یعنی حضرت ادریسؑ کے طرف منسوب ہے۔ حال ہی میں اس کتاب کے تراجم انگریزی زبان میں شائع ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس بات کا کوئی قطعی و حتمی ثبوت موجود نہیں ہے لیکن اب تک کی تحقیق کے مطابق ہم اسے قدیم ترین نئی کتاب کہہ سکتے ہیں۔ اس کتاب میں آخری نبی کی بشارت بھی ہے جس کو بعد میں عہد جدید (انجیل) کے باب مکتوب یہودا نے بھی نقل کیا ہے''۔[1]

حضرت ادریس علیہ السلام کے بعد حضرت نوحؑ کے متعلق بھی ہمیں کچھ اشارے ملتے ہیں۔ عراق میں صابیہ کے نام سے ایک چھوٹا سا گروہ پایا جاتا ہے۔ جس کا ایک مستقل دین ہے ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم حضرت نوح کی کتاب اور ان کے دین پر عمل پیرا ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ ایک زمانہ میں حضرت نوحؑ کی پوری کتاب ہمارے پاس موجود تھی لیکن امتداد زمانہ کے باعث اب وہ ناپید ہے۔ اس کے بعد ایک اور نبی آئے جن کی کتاب کا ذکر خود قرآن میں موجود ہے۔ وہ حضرت ابراہیمؑ ہیں ان کی کتاب (صحیفہ) کے مندرجات یہودی اور عیسائی ادبیات میں تو نہیں۔ قرآن میں چند سطروں کی حد تک محفوظ ملتے ہیں۔[2]

---

[1] محمد حمید اللہ (ڈاکٹر) خطبات بہاول پور، ایڈیشن گیارہ، ۲۰۰۷، ص:۱

[2] ایضاً، ص:۲

اس طرح بعض ایسے انسان بھی ہیں جن کو صراحت کے ساتھ نبی تو تسلیم نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کے نبوت کے امکان کو رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک شخصیت ''زردشت'' کی ہے پارسی انہیں اپنا نبی مانتے ہیں۔ ان کی نبوت کا امکان اس بنا پر بھی ہے کہ قرآن مجید میں مجوس قوم کا ذکر آیا ہے مجوسیوں کا مذہب ''زردشت'' کی لائی ہوئی کتاب ''اوستا'' پر مبنی ہے۔ ''اوستا'' کے متعلق ہم تک کچھ معلومات پہنچی ہیں۔ جب ہم اس کا قرآن مجید سے موازنہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کس کو کیا برتری حاصل ہے۔ زردشت کی کتاب اس وقت ''ژند'' زبان میں تھی۔ کچھ عرصے بعد ایران پر دوسری قوموں کا غلبہ ہوا۔ اور نئے فاتحین کی زبان وہاں رائج ہوئی۔ پرانی زبان متروک ہوتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک بھر میں مٹھی بھر عالم اور متخصصین کے سوا ''ژند'' زبان جاننے والا کوئی نہ رہا۔ اس لیے زردشتی مذہب کے علماء نے نئی زبان پازند میں اس کتاب کا خلاصہ اور شرح لکھی۔ آج کل ہمارے پاس اس نسخے کا صرف دسواں حصہ موجود ہے۔ باقی غائب ہو چکا ہے۔ اس دسویں حصہ میں کچھ چیزیں عبادت سے متعلق ہیں اور کچھ دیگر احکام ہیں۔ بہرحال دنیا کی ایک قدیم کتاب کو ہم ''اوستا'' کے نام سے جانتے ہیں۔ لیکن وہ مکمل حالت میں ہم تک نہیں پہنچ سکی ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق اوستا میں دوسری باتوں کے علاوہ زردشت کا یہ بیان ملتا ہے:

> ''میں نے دین کو مکمل نہیں کیا۔ میرے بعد ایک نبی آئے گا جو اسکی تکمیل کرے گا۔ اور اس کا نام رحمۃ للعالمین ہوگا''۔[1]

ڈاکٹر محمد حمید اللہ دیگر آسمانی کتابوں کے حوالے سے جو معتدل اور متوازن رویہ پیش کرتے ہیں وہ بھی قابل ذکر ہے:

> ''عقائد کا تیسرا جزو کتابیں ہیں یعنی اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان لاتا ہوں۔ یہ اتنا اہم کلمہ ہے کہ اس کے مماثل ہمیں کوئی چیز دوسرے مذاہب میں نظر نہیں آتی، وہ اس لیے کہ اگر یہاں کہا جاتا میں کتاب پر ایمان لاتا ہوں یعنی قرآن مجید پر تو یہ صرف ایک کتاب ہوتی لیکن ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ایک کتاب پر نہیں بلکہ خدا کی

[1] محمد حمید اللہ (ڈاکٹر) خطبات بہاول پور، ایڈیشن گیارہ، ۲۰۰۷، ص: ۲

بھیجی ہوئی ساری کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے، اس عقیدے میں ایک طرف فراخ دلی اور وسیع القلبی کا پہلو ہے اور دوسری طرف اسلام کے عالم گیر ہونے اور ابتداء سے لے کر قیامت تک مسلسل جاری رہنے کا تصور بھی ہے۔ کیونکہ اگر ہم کتابوں پر ایمان لائیں تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ آدمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک جتنی بھی کتابیں آئی ہیں وہ سب مختلف لوگوں کی نہیں ہماری اپنی کتابیں ہیں۔ مثلاً تورات یہودیوں کی کتاب نہیں بلکہ ہماری کتاب بھی ہے۔ انجیل عیسائیوں ہی کی کتاب نہیں ہماری کتاب بھی ہے۔ ایسی تعلیم ہمیں دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی۔ عام طور پر دوسرے مذاہب والے یہ کہتے ہیں کہ سارے مذاہب غلط ہیں انہیں چھوڑ دو ہمارا مذہب سچا ہے۔ میں بھی بطور مسلمان کے یہی کہوں گا میرا دین سچا ہے لیکن دوسرے مذاہب بھی اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے سچے اور الٰہی مذاہب ہیں اگر چہ ان پرانے مذاہب پر عمل نہیں کرتا۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی ساری کتابیں خدا ہی کا حکم ہیں اور اسی بنا پر ہمارے لیے قابل احترام ہیں۔

مگر اصول کی بنا پر آخری احکام واجب التعمیل رہتے ہیں۔ اور اس سے پہلے کے احکام منسوخ سمجھے جاتے ہیں۔ ہم آخری کتاب پر عمل کرتے ہیں۔ اس سے پہلے کی کتابوں پر عمل تو نہیں کرتے لیکن ان کو تسلیم ضرور کرتے ہیں۔ اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ اس میں ایک نفسیاتی فائدہ اور بھی ہے اگر میں کسی یہودی یا کسی عیسائی کو یہ کہوں کہ تیرا مذہب جھوٹا ہے۔ تیری نجات کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ تو اسلام قبول کرے تیرے پاس جو کتابیں ہیں وہ لغو اور جلا دینے کے قابل ہیں تو اسے دکھ ہوگا۔ اور غالباً وہ جوش غضب سے اس قدر مغلوب ہو جائے گا کہ اسلام کی حقانیت کے بارے میں میری کوئی بات سننے یا ماننے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر میں اس سے یہ کہوں کہ تمہارا دین بھی سچا ہے۔ تمہارے یہاں کی کتاب بھی سچی ہے وہ اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب ہے۔ تم اس کو پڑھو اور غور کر کے دیکھو کہ اس میں کیا بیان ہوا ہے۔ وہ نسبتاً زیادہ خوش دلی کے ساتھ اس کو پڑھنے اور غور کرنے

کے لیے تیار ہوگا۔ اس طرح اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان لانے کا جو حکم دیا گیا ہے اس میں بھی وہی فراخ دلی وسیع القلبی تحمل اور رواداری کا پہلو نظر آتا ہے۔ میں نے مسند احمد بن حنبل میں ایک حدیث پڑھی ہے۔ جو دوسری کتابوں میں بھی ہے کہ ایک مرتبہ حضورﷺ نے فرمایا کہ آدمؑ سے لے کر اب تک اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بھیجے ہیں جن میں ۳۱۵ رسول تھے گویا ۳۱۵ صحیفے نازل ہوئے۔ باقی ایک لاکھ تینتیس ہزار چھ سو پچاسی پیغمبر نے اپنے اپنے پیش رو نبی کی عبادت پر عمل جاری رکھا۔ ظاہر ہے کہ سارے پیغمبر مختلف زمانوں اور دنیا کے مختلف ملکوں میں آئے ہوں گے۔ اور ان کی زبانیں بھی مختلف رہی ہوں گی''۔[1]

مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء-۱۹۵۸ء) اپنی تفسیر 'ترجمان القرآن' میں رقم فرماتے ہیں۔ کہ اسلام تمام مذاہب کی کتب وصحائف کی تصدیق نہایت مثبت انداز میں کرتا ہے:

''ان میں سے ہر تعلیم دوسری تعلیم کی تصدیق کرتی ہے۔ جھٹلاتی نہیں۔ اور جب ہر تعلیم دوسری تعلیم کی تصدیق کرتی ہے تو اس سے معلوم ہوا، ان تمام تعلیمات کے اندر کوئی ایک ہی ثابت وقائم حقیقت ضرور کام کر رہی ہے کیوں کہ اگر مختلف وقتوں، مختلف گوشوں، مختلف ناموں، مختلف پیرایوں اور مختلف زبانوں سے کوئی بات کہی گئی ہو اور باوجود ان تمام اختلاف کے بات ہمیشہ ایک ہی ہو اور ایک ہی مقصد پر زور دیتی ہو تو قدرتی طور پر تمہیں ماننا پڑے گا کہ ایسی بات اصلیت سے خالی نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں اس بیان موعظت کا ایک بڑا موضوع پچھلے عہدوں کی ہدایت اور رسالتوں کا تذکرہ ہے۔ اور ان کی یکسانی ہم آہنگی اور وحدت تعلیم سے مذہبی صداقت کے تمام مقاصد پر استشہاد کرنا ہے''۔[2]

علامہ سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳) نے 'سیرۃ النبیؐ' کی جلد چہارم میں اس نظریہ کی نہایت وقیع وضاحت پیش کی ہے:

---

[1] محمد حمید اللہ (ڈاکٹر) خطبات بہاول پور، ایڈیشن گیارہ، ۲۰۰۷، ص: ۱۶۱-۱۶۲

[2] آزاد، ابوالکلام (مولانا) ترجمان القرآن، مطبع فرقان، افضل پریس، جلد ا، ص: ۲۲۴-۲۲۵

''حقیقت میں اسلام کی یہ تعلیم دنیا کی مہتم بالشان تعلیمات میں سے ہے جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہ تھا۔ یہ رواداری بے تعصبی اور انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے۔ یہودی اپنی کتاب چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کر کے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے۔ عیسائی تورات اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہی کا متوقع ہوسکتا ہے، پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر بھی مینو (جنت) کا استحقاق پیدا کرسکتا ہے۔ ہندو اپنے ویدوں کے سوا دنیا کی تمام آسمانی کتابوں کو دجل فریب مان کر بھی آواگون سے نجات حاصل کرسکتا ہے۔ بدھ مت والے اپنے سوا تمام دنیا کی وحیوں کا انکار کر کے بھی نروان کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں، مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو من جانب اللہ نہ تسلیم کرے جنت کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ یہ تعلیم صرف نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ عملاً اس پر اسلامی حکومت کے قوانین اور احکام مبنی ہیں۔ یہودیوں کی نظر میں صرف دو ہی قومیں ہیں۔ بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل یا اسرائیل کا گھرانہ اور غیر قومیں یا مختون اور غیر مختون اور ان ہی دونوں تقسیموں پر ان کے قانون کی بنیاد ہے۔ عیسائیوں میں مذہبی حیثیت سے مسیحی یہود اور بت پرست گو تین قومیں مانی جاتی ہیں۔ مگر چونکہ ان کے مذہب میں قانون نہیں ہے اس لیے وہ اکثر کے پیرو کار رہے ہیں۔ لیکن رومن عیسائیوں میں بھی ملکی حیثیت سے دو ہی تقسیمیں ہیں۔ رومی اور غیر رومی۔ ایک رومی ملک میں غیر رومی کا کوئی حق نہیں کہ رومی حکومت کے لئے، اور غیر رومی غلامی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ پارسیوں میں پاک نژادان ایران اور بیرونی لوگ، دنیا کی دو ہی حیثیتیں ہیں۔ ہندوؤں میں اونچی ذات اور اچھوت اور ملیچھ قوموں کی دو ہی صورتیں ہیں'' [1]

اسلام دین کا جو تصور پیش کرتا ہے۔ اس میں وسعت و فراخی ہے۔ اسلام کی

[1] ندوی، سید سلیمان (علامہ) سیرۃ النبی، ناشران وتاجران کتب اردو بازار لاہور، ۲۰۰۶، ج ۴، ص: ۵۸۷

خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف دین اسلام کی ہی تائید وتوثیق نہیں کرتا ہے بلکہ تمام ادیان، ان کے مقدس نوشتوں، صحف کا احترام کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیمات کا بھی احترام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن سابقہ انبیاء اور کتابوں کا ذکر جا بجا کرتا ہے۔ حتی کہ قرآن کریم سابقہ کتابوں کی تصدیق کرتا ہے ان پر ایمان لانے کو لازمی قرار دیتا ہے۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اسلام کے مزاج میں رواداری، نرمی اور بقائے باہم کی تعلیمات بخوبی پائی جاتی ہیں۔ اس ضمن میں قرآن کی جو آیتیں پیش کی گئیں ہیں۔ ان میں صرف اشارہ نہیں بلکہ نام کے ساتھ پچھلی شریعتوں کا ذکر آیا ہے۔ اس لیے اگر کوئی یہ اعتراض کرتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں تشدد اور تنگی پائی جاتی ہے۔ تو اس کا یہ اعتراض نری جہالت اور تعصب پر مبنی ہے۔ بنابریں یہ بات بھی عرض کی جاسکتی ہے کہ قرآن نے نوع انسانی کو اس بات کا بھی ثبوت فراہم کیا ہے کہ دیگر ادیان کی کتب ان کی مقدس ہستیوں، طریقۂ عبادت اور دیگر تمام باتوں سے واقفیت حاصل کی جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مسلم مفکرین واسکالرس نے سابقہ کتب کے حوالے سے جو آراء اور نظریہ پیش کیا ہے۔ اس میں بھی بلا کی رواداری اور توسع پایا جاتا ہے۔ بلکہ مسلم مفکرین کا ایک بڑا طبقہ ہے جن کی تحریروں اور افکار ونظریات سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مذکورہ سابقہ کتب یا جن کا ذکر نہیں ہوا ہے، البتہ ان میں ایسی تعلیمات پائی جاتی ہیں جو اسلامی شریعت کے مترادف ہیں اور ان کے من جانب اللہ ہونے میں شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ ان کا بھی احترام کیا جائے اگر کوئی ان تعلیمات پر رضائے الٰہی کی خاطر عمل پیرا ہوتا ہے تو اس کا وہ عمل قابل قبول ہوگا۔

سابقہ سطور میں جو آراء اور شواہد علماء کرام کے سابقہ کتب سے متعلق پیش کیے گئے ہیں ان سے اہل علم وفکر کو اختلاف ہوسکتا ہے، اس لیے ہمارے اکابر واسلاف اور اصحاب علم ونظر کو غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ معاشرہ کو اسلام کی ان تعلیمات وشواہد سے آشنا کیا جائے جن سے سماج میں ہم آہنگی اور باہمی حقوق کے تحفظ کو لازمی بنایا جاسکے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے علمی اور تحقیقی ورثہ خصوصاً مصادر اسلام میں مطالعۂ ادیان کے گراں قدر ثبوت تو ملتے ہیں مگر انہیں عمداً آگے نہیں بڑھایا گیا۔ اگر ان روایات واقدار کو آگے بڑھاتے تو آج اسلام کے خلاف اور مسلمانوں کے خلاف

جو شازشیں ہو رہی ہیں ان پر قدغن لگایا جا سکتا تھا۔ ذرا غور کیجئے کہ بالائی سطروں میں پیش کیے گئے حقائق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اساطین علم اور ماہرین شریعت نے دیگر ادیان و مذاہب کو کس قدر اہمیت سے پیش کیا ہے۔ جو ہمارے درمیان بہت ساری دوریوں کے اختتام کا باعث ہو سکتا ہے۔ بس ضرورت ہے کہ ہم ایمان داری اور بلا کسی بھید بھاؤ کے ان روایتوں اور تعلیمات سے معاشرہ کو متنبہ کریں۔ ہمارے یہاں مطالعۂ ادیان کے واضح ثبوت موجود ہیں۔ معاشرہ کے سماجی مسائل کا حل اور مذہبی منافرت کا خاتمہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ ہم توازن و تحمل اور علمی بنیادوں پر معاشرہ کی تعمیر و تشکیل کریں گے۔

مقدس کتب وصحائف کا مطالعہ:

اہل علم کے یہاں ایک بحث یہ ملتی ہے کہ دیگر ادیان کے مذہبی صحیفوں و کتب کا مطالعہ کرنا اور ان میں غور و فکر کرنا کیسا ہے؟ یہ ایک سنجیدہ بحث ہے اس پر تفصیلی گفتگو کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آسمانی کتب کا تعارف پیش کر دیا جائے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے خطبات بہاول پور میں توریت، انجیل اور زبور کا تعارف اس طرح پیش کیا ہے:

> ''حضرت موسیٰ پر جو کتاب نازل ہوئی وہ توریت کہی جاتی ہے لیکن دراصل توریت اس کتاب کا ایک جز ہے۔ توریت کے معنی ہیں ''قانون'' یہودی حضرت موسیٰؑ کی طرف پانچ کتابیں منسوب کرتے ہیں۔ پہلی کتاب ''کتاب پیدائش'' کہلاتی ہے دوسری کتاب ''کتاب خروج'' جو مصر سے نکلنے کے حالات پر مشتمل ہے۔ تیسری کتاب ''قانون'' ہے چوتھی کتاب کا نام ''اعداد و شمار'' ہے کیونکہ حضرت موسیٰ نے حکم دیا تھا کہ یہودیوں کے قبیلے وار مردم شماری کی جائے، پانچویں کتاب ''تثنیہ'' کے نام سے موسوم ہے۔ جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ پرانی چیزوں کو دوبارہ دہرایا جائے۔ ان کو up to date کیا جائے یا ان کی تشریح کی جائے۔ شروع شروع میں یہودیوں کے یہاں یہ پانچویں کتاب تثنیہ نہیں پائی جاتی تھی حضرت موسیٰؑ کے کوئی چھ سو سال بعد ایک جنگ

کے زمانہ میں ایک شخص ملک کے اس وقت کے یہودی بادشاہ کے پاس ایک کتاب لایا اور کہا کہ مجھے یہ کتاب غار سے ملی ہے معلوم نہیں کس کی ہے۔ مگر اس میں دینی احکام نظر آتے ہیں۔

بادشاہ نے اپنے زمانے کی ایک نبیہ عورت کے پاس اس نسخے کو بھیجا، یہودیوں کے ہاں عورتیں بھی نبی رہی ہیں (یا کم از کم وہ اس کا دعوی کرتے ہیں) اس نبیہ نے جس کا نام ہلدا (Huldа) بیان کیا جاتا ہے یہ کہلا بھیجا کہ یہ حضرت موسیٰؑ ہی کی کتاب ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے چھ سو سال بعد اسے حضرت موسیٰؑ کی طرف منسوب کیا جانے لگا۔ اس کو ''تثنیہ'' کا نام اس لیے دیا گیا کہ اس میں پہلی چار کتابوں کے احکام میں سے کچھ احکام خلاصے کے طور پر اور کچھ اضافے کے ساتھ دہرائے گئے ہیں۔ بہر حال ان پانچ کتابوں کی سرگزشت یہ ہے کہ حضرت موسی کی وفات کے بعد آنے والے انبیاء کے زمانے میں یہودیوں نے فلسطین کا کچھ حصہ فتح کیا۔ اور وہاں حکومت شروع کی تو کچھ عرصے بعد عراق کے حکمران بخت نصر نے فلسطین پر حملہ کیا۔ چونکہ اس کا دین یہودیوں کے دین سے مختلف تھا اس لیے اس نے صرف ملک فتح کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان دشمنوں کے دین کو دنیا سے نیست و نابود کرنے کے لیے توریت کے تمام قلمی نسخوں کو جمع کر کے آگ لگا دی۔ حتی کہ توریت کا ایک نسخہ بھی باقی نہ رہا، یہودی مؤرخوں کے مطابق اس کے ایک سو سال کے بعد ان کے نبی ''حضرت عزرا'' نے (جو شاید عزیرؑ ہوں) یہ کہا کہ مجھے توریت زبانی یاد ہے۔ انہوں نے توریت املا کروائی توریت کے اس اعادے کے کچھ عرصہ بعد روما کے ایک حکمراں نے فلسطین پر حملہ کیا۔ سپہ سالار کا نام انیٹوکس تھا اس نے بھی وہی کام کیا جو بخت نصر نے کیا تھا۔ یعنی یہودیوں کی کتابیں جمع کر کے جلا دیں اس طرح وہ دوسری مرتبہ نابود کر دی گئیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد ایک اور رومی حکمراں نے طیطس نامی کمانڈر کی

ماتحتی میں ایک فوج بھیجی اور اس نے تیسری مرتبہ فلسطین میں دستیاب شدہ یہودیوں کی تمام کتابوں کو جلا دیا۔ اب ہمیں توریت کے نام سے جو کتاب ملتی ہے وہ بائبل کا حصہ عہد نامہ عتیق میں حضرت موسیٰؑ کی طرف منسوب پانچ کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں تین چار مرتبہ کی آتش زدگی کے بعد اعادہ شدہ شکلیں ہیں۔ ان کا اعادہ کس طرح ہوا اور کس نے ان کا اعادہ کیا اس کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں۔ البتہ جو شخص ان کی کتابوں کو پڑھتا ہے تو اسے دو چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے بعض اوقات ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جو کھٹکتی ہیں اور اسے احساس ہوتا ہے کہ اصل میں نہ ہوں گی، بلکہ بعد کا اضافہ ہیں۔ بعض مقامات پر کمی محسوس ہوتی ہے اور تشنگی باقی رہتی ہے۔ چنانچہ بعض چیزیں جو زیادہ ہوگئی ہیں وہ اس طرح کی ہیں کہ جو حضرت موسیٰؑ کی طرف منسوب ہیں اس میں وہ باتیں ہیں جو حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد پیش آئیں۔ اگر آپ کتاب تثنیہ پڑھیں تو اس کے آخری باب میں حضرت موسیٰؑ کی بیماری، حضرت موسیٰؑ کی وفات، حضرت موسیٰؑ کی تدفین اور اس کے بعد کے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حصہ بعد کا اضافہ ہے۔ مگر یہ تو ایسی باتیں ہیں جنہیں ہر پڑھنے والا محسوس کر لیتا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں دیگر کتنی چیزوں کا اضافہ ہوا ہے۔ جو غیر محسوس ہوں۔ اسی طرح جن چیزوں کی کمی نظر آتی ہے جن کا وہاں ہونا ضروری تھا مگر نہیں ہیں وہ ایسی ہیں کہ کم از کم بیس مرتبہ اس طرح کے الفاظ ملتے ہیں کہ اس علم کی تفصیل فلاں باب میں ملیں گی، جن ابواب کے حوالے دیئے گئے ہیں ان میں سے ایک باب کا نام ''خدا کی جنگیں'' ایک اور باب کا نام ''مخلص اور نیک لوگوں کی کتاب'' ہے وہ باب سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔[1]

ڈاکٹر حمید اللہ کا زبور کے متعلق درج ذیل نظریہ ہے:

---

[1] خطبات بہاول پور، ص: ۳۔۵

''توریت کے بعد مسلمانوں میں عام طور پر زبور کا نام لیا جاتا ہے اور ہمارا تصور یہ رہا ہے کہ یہ بھی توریت اور انجیل ہی کی طرح ایک مستقل کتاب ہے۔ لیکن عہد نامہ عتیق میں جو چیز حضرت داؤدؑ کی طرف منسوب ہے اور جس کو وہ یعنی زبور کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس میں صرف خدا کی حمد وثنا کی نظمیں ہیں کوئی نیا حکم نہیں ہے۔ ہمارا یہ تصور ہے کہ ہر رسول یا نبی ایک نئی شریعت لاتا ہے۔ لیکن اس کتاب میں ایسی کوئی نئی شریعت نہیں ملتی۔ تاہم جس طرح پرانی کتابوں میں (کتاب ادریس سے لے کر ایران کی اوستا تک) ایک آخری نبی کی بشارت ملتی ہے اس طرح زبور میں بھی ایسی چیزیں ملتی ہیں نیز جو سرگزشت توریت کی ہے زبور کی بھی رہی ہے۔''[1]

ڈاکٹر حمید اللہ نے انجیل کے متعلق درج ذیل معلومات بہم پہنچائی ہیں:

''انجیل کے متعلق مسلمانوں کا عام تصور یہ ہے کہ وہ ایک مستقل کتاب تھی جو خدا کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی لیکن ہمارے پاس عیسائیوں کے واسطہ سے جو انجیل پہنچی ہے وہ ایک نہیں بلکہ چار انجیلیں ہیں جو یہ ہیں:

(۱) متی (۲) مرقس (۳) لوقا (۴) یوحنا

ہر انجیل ایک الگ آدمی کی طرف منسوب ہے۔ یہ چار کتابیں بھی ساری انجیل نہیں ہیں بلکہ خود عیسائی مؤرخوں کے مطابق ستر سے زیادہ انجیلیں پائی جاتی تھیں جن میں سے ان چار کو قابل اعتماد اور باقی کو مشتبہ قرار دیا گیا۔ ان کو پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے الہام یا وحی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی سوانح عمریاں ہیں۔ چار شخصوں نے یک بعد دیگرے حضرت عیسیٰ کی سوانح عمریاں لکھی اور ہر ایک نے اس کو انجیل کا نام دیا۔ لفظ انجیل کے معنیٰ ہیں خوشخبری اور اس کی وجہ تسمیہ غالبا یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے جو حالات زندگی انجیل میں ملتے ہیں ان کے مطابق عام طور

[1] خطبات بہاول پور، ص: ۵

پر وہ کسی گاؤں میں جایا کرتے اور وہاں کے لوگوں سے کہتے تھے کہ میں بشارت دیتا ہوں کہ خدا کی حکمرانی اب جلد آنے والی ہے شاید اس اساس پر کتاب کا نام بھی یہی ہوگیا۔لیکن حضرت عیسیٰؑ پر اگر کوئی کتاب نازل ہوئی تھی تو حضرت عیسیٰؑ نے اسے لکھوایا نہیں اس لیے آج دنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں۔اب جو انجیلیں موجود ہیں ان کی حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے مختلف زبانوں میں حضرت عیسیٰؑ کی سوانح عمریاں لکھیں اور ان کی سوانح عمری کو ہر مؤلف نے انجیل کا نام دیا۔ان میں سے چار کو کلیسا نے قابل اعتماد قرار دیا ہے۔اور باقی کو رد کر دیا ہے۔ان چار انجیلوں کے انتخاب کے متعلق کس کو کوئی علم نہیں کہ ان کو کس نے انتخاب کیا۔کب انتخاب کیا اور کن معیارات کو سامنے رکھ کر انتخاب کیا۔ فرانس کا ایک مشہور مورخ ''والٹیر'' کے نام سے گزرا ہے اس نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کلیسا کو یہ خیال ہوا کہ یہ جو ستر سے زائد انجیلیں ہیں اور ان کے مندرجات میں اختلافات بھی ہیں۔ان میں سے صرف ان انجیلوں کا انتخاب کیا جائے جو قابل اعتماد ہوں۔انتخاب کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ کلیسا میں ساری انجیلوں کو عبادت گاہ کے مقام کے پاس ایک میز پر جمع کیا گیا۔پھر اس کو ہلایا گیا۔جو کتابیں نیچے گر گئیں ان کو قابل اعتماد قرار دیا گیا یہ ''والٹیر'' کا بیان ہے۔اس نے کس بنیاد پر یہ بات کہی یہ بتانا میرے لیے دشوار ہے۔ظاہر ہے عیسائی لوگ اس کی تردید کرتے ہیں اور ایسی بات کہنے والا ان کے نزدیک جھوٹا اور بدمعاش تھا۔جو چیز ہمارے پاس انجیل کے نام سے ملتی ہے وہ حضرت عیسیٰؑ کی سوانح عمریاں ہیں،انہیں ہم سیرت حضرت عیسیٰؑ کہہ سکتے ہیں۔ بعینہٖ جس طرح مسلمانوں کے یہاں سیرت نبوی کی کتابیں پائی جاتی ہیں''۔[1]

متذکرہ تحقیقات ڈاکٹر حمید اللہ کی ہیں،ان کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ

[1] خطبات بہاول پور،ص:۵-۶

اصل جو کلام، اللہ تعالیٰ نے نازل کیا توریت، زبور اور انجیل کی شکل میں، جس کا تذکرہ اسلام کے بنیادی مصدر قرآن وحدیث میں آیا ہے، وہ بعینہٖ اپنی شکل میں موجود نہیں ہیں۔ جس طرح مرور زمانہ کے اعتبار سے انہیں لکھا گیا اور تباہی کے بعد ان کا اعادہ کیا گیا، یہ سب اشارے اسی بات کی طرف جاتے ہیں کہ اصل کلام خدا تعالیٰ کا اب موجود نہیں ہے۔ ان کتابوں کی استناد پر علامہ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب 'الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح' میں بڑا تفصیلی کلام کیا ہے۔ علامہ تیمیہ کی گفتگو کو پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی نے اپنی کتاب 'مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت' میں جمع کیا ہے جس کو نذر قارئین کیا جاتا ہے:

''موجودہ توریت وانجیل جو اہل کتاب کے پاس ہے وہ تواتر کے ساتھ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ سے ثابت نہیں ہے۔ جہاں تک توریت کا تعلق ہے تو وہ اس وقت ختم ہوگئی جب پہلی مرتبہ بیت المقدس کو ویران کیا گیا اور بنی اسرائیل کو وہاں سے نکالا گیا۔ اس کے بعد جس شخص واحد نے توریت کو یہودیوں پر املا کرایا وہ ''عاذر'' تھا جس کے بارے میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ نبی تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ وہ نبی نہیں تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ توریت کے الفاظ تواتر کے ساتھ حضرت موسیٰؑ تک نہیں پہنچتے۔ اور یہ اس کے الفاظ کے نقل کرنے میں غلطی کے واقع ہونے کا امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک موجودہ انجیل کا تعلق ہے تو عیسائیوں کا اعتراف ہے کہ نہ تو خود حضرت عیسیٰؑ نے اسے لکھا اور نہ جس نے لکھا ہے اس کو املا کرایا ہے۔ بلکہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد متی اور یوحنا نے املا کروایا جو حضرت مسیح کے حواری تھے۔ مگر اسے ان لوگوں نے یاد نہیں کیا جب کہ مرقس اور لوقا نے انہیں دیکھا تک نہیں۔ ان لوگوں نے حضرت مسیح کے صرف بعض اقوال اور اخبار کو براہ راست نقل کیا ہے''۔[1]

[1] قاسمی، محمد سعود عالم (پروفیسر)، مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۹، ص: ۱۷۱-۱۷۲

یہودیوں کی توریت کے متعلق علامہ تیمیہ کے حوالے سے پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی رقم کرتے ہیں:

''عیسائی حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ وہ امانت جسے وہ اپنے مذہب کی اصل قرار دیتے ہیں اور عقیدہ کی بنیاد مانتے ہیں اس کے الفاظ انجیلوں میں موجود نہیں ہے اور نہ وہ حواریوں سے منقول ہیں۔ وہ لوگ اس بات پر بھی متفق ہیں کہ ان کو پہلی کونسل نے وضع کیا ہے جو فلسطین کے پاس تین سو اٹھارہ میں جمع ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے عبداللہ بن اربوس پادری کی مخالفت کی تھی جو حضرت عیسیٰؑ کو (ابن اللہ کی جگہ) عبداللہ کہتا تھا۔ یہ حضرت عیسیٰ کے تین سو سال بعد منعقد ہوئی تھی''۔[1]

اسی طرح توریت اور انجیل کے الفاظ و معانی کے ساتھ ترجمہ میں بھی غلطیاں واقع ہوئی ہیں اس کی شہادت یہ ہے کہ:

''عیسائیوں کا کہنا ہے کہ بائبل چار زبانوں میں لکھی گئی (۱) ایرانی (۲) رومی (۳) یونانی (۴) سریانی۔ نصاریٰ یہ بھی کہتے ہیں کہ بائبل بہتر ۷۲/ زبانوں میں لکھی گئی۔ اگر ان چار زبانوں میں غلطیاں ہوئیں تو بعد کی بہتر زبانوں میں بھی یہ غلطیاں رہ گئیں''۔[2]

متذکرہ جملہ شواہد و حقائق کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ قرآن کے علاوہ توریت، زبور اور انجیل اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں۔ جن لوگوں نے عیسائیت کا مطالعہ گہرائی سے کیا ہے انہیں اس بات کا اندازہ بخوبی ہے۔ بہر حال ہمارے سامنے سابقہ آسمانی کتابوں کا ایک جامع خاکہ آ گیا۔ وہیں اس بات کا بھی علم ہو گیا کہ توریت و زبور اور انجیل کی جمع و تدوین کن کن مراحل سے ہو کر ہم تک پہنچی ہے۔ اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ آیا ان کی تلاوت کا کیا حکم ہے۔ اس بابت اسلامی ماخذ میں ہمیں دو روایتیں ملتی ہیں:

---

[1] قاسمی، محمد سعود عالم (پروفیسر)، مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت، ۲۰۱۹ء، ص: ۱۷۲

[2] ایضاً، ۱۷۴

حدثنا ابی ثنا محمد بن احمد بن زید حدثنا احمد بن محمد بن الحسن ، حدثنی جدی الحسین بن حفص حدثنا ابراهیم بن محمد بن ابی یحیی المدنی حدثنا معاذ بن عبد الرحمن عن یوسف بن عبدالله بن سلا عن ابیه انه جاء الی ﷺ فقال: انی قرأت القرآن التوراة فقال: اقرأ بهذه لیلة ولهذه لیلة۔ [1]

''حضرت عبداللہ بن سلام جب اسلام میں داخل ہوگئے تو انہوں نے عرض کیا کہ قرآن کے ساتھ توریت کی تلاوت بھی جاری رکھوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ایک رات قرآن پڑھا کرو اور ایک رات توریت''

ایک دوسری روایت میں مذکور ہے:

قال اخبرنا سلیمان بن حرب قال: حدثنا حمد بن زید عن میمونه بنت ابی الجلد قالت: کان ابی یقرأ القرآن فی کل سبعة ایام و یختم التوراة فی ستة یقرؤها نظراً فاذا کان یوم یختمها حشد لذلك ناس و کان یقول: کان یقال تنزل عنه ختمها الرحمة۔ [2]

''سلیمان بن حرب بیان کرتے ہیں کہ ہم سے حماد بن زید نے بیان کیا، انھوں نے میمونہ بنت ابی الجلد سے نقل کیا ہے وہ فرماتی ہیں کہ میرے والد ابوالجلد سات دن میں قرآن ختم کرتے اور چھ دن میں تورات کو دیکھ کر ختم کرتے۔ جب ختم والا دن ہوتا تو کچھ لوگ ختم کے لیے جمع ہوجاتے تھے اور ابو الجلد

---

[1] علی محمد عمر (دکتور)، کتاب الطبقات الکبریٰ لمحمد بن سعد بن منیع الزہری، مکتبہ الخانجی قاہرہ، ۲۰۰۱، جلد ۷، ص: ۲۲۱

[2] کتانی، سید محمد عبدالحیٔ، نظام الحکومۃ النبویۃ المسمی التراتیب الاداویۃ، النشر والتوزیع، بیروت، لبان، ج ۲، ص: ۲۸۲

فرماتے تھے کہ کہا جاتا تھا کہ ختم قرآن کے دوران ساتھ رحمت اترتی تھی۔''

ان دونوں روایتوں پر محدثین نے کلام کیا ہے۔ اس تفصیل سے قطع نظر یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس سے اسلام کی وسعت اور دیگر آسمانی کتب، یا دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں سے مسلمانوں کے رشتے کو واضح کرنا ہے۔ عبداللہ بن سلام کو محمد ﷺ نے توریت کی تلاوت کی اجازت اس وقت دی جب کہ وہ اسلام کی دولت سے سرفراز ہو چکے تھے، ان دونوں روایتوں کی روشنی میں مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے:

> ''واقعہ بھی یہی ہے کہ قرآن کی صحیح رہنمائی میں اس قسم کی کتابوں کے پڑھنے سے جہاں تک میرا ذاتی تجربہ ہے خود قرآن کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے اور انجیل و توریت خیران کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ میں سنسکرت سے واقف نہیں، لیکن اردو میں اس کے بعض حصوں کا ترجمہ ہو گیا ہے اس کا ایک دن مطالعہ کر رہا تھا جو یجروید کا ایک ٹکڑا تھا، ایک جگہ مجھے یہ فقرہ اس کتاب میں ملا یعنی ''اے اگنی تو خوبصورت بچہ ہے۔ پودوں میں سے نکالا ہوا، تاریکی کو دور کرتا ہوا، ماؤں سے شور کرتا ہوا پیدا ہوا ہے'' اس کو کہتے ہوئے کچھ ڈر بھی معلوم ہوتا ہے لیکن جو واقعہ پیش آیا اس کا اظہار کرتا ہوں اس اشلوک نے میرے دماغ کو قرآن کی ان آیتوں کی طرف منتقل کر دیا جن میں ارشاد ہوا ہے کہ تم دیکھتے ہو اس آگ کو جسے تم پیدا کرتے یا نکالتے ہو، کیا تم نے اس کے درخت کو اگایا، یا ہم ہیں اس کے اگانے والے (الواقعہ) قریب قریب یہی مضمون سورہ یٰسین میں بھی ہے۔[1]

اس واقعہ سے مولانا مناظر احسن گیلانی کا استدلال یہ ہے کہ قرآن کے علاوہ دیگر کتابوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی تحقیق و تفتیش کی جا سکتی ہے علاوہ ازیں برصغیر کی معروف دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے ایک فتویٰ میں دیگر آسمانی کتابوں کے متعلق کہا گیا ہے:

> ''قرآن کریم کی آمد کے بعد تمام آسمانی کتابیں منسوخ ہو گئیں اور سابقہ آسمانی

[1] گیلانی، مناظر احسن (مولانا) تدوین قرآن، مکتبہ بخاری کراچی، پاکستان، ۲۰۰۵ء، ص: ۴۰

کتابوں میں تحریفات بھی بہت ہوئی ہیں۔ اس لیے عام آدمی کے لیے ان کتابوں میں صحیح اور باقی حکم خداوندی کی شناخت آسان نہیں، نیز قرآن میں مذہب اسلام کی تمام ضروری باتیں بیان کردی گئیں ہیں: اس لیے معلومات و استفادہ کی غرض سے تورات وانجیل کا مطالعہ درست نہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ حضور ﷺ کی خدمت میں توریت لائے اور اسے پڑھنا شروع کیا، تو آپ ﷺ نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ میں تم لوگوں کے پاس واضح اور صاف ستھری شریعت لے کر آیا ہوں ۔ اور حنابلہ اور شافعیہ نے صراحت کے ساتھ اہل کتاب کی کتابوں کے مطالعہ سے منع فرمایا ہے بلکہ شافعیہ نے تو اسے محرمات میں شمار کیا ہے۔ البتہ اگر کوئی متجر عالم کسی دوسرے مذہب کی کتابوں کا مطالعہ اس مذہب والوں کے عقائد باطلہ کی تردید کی غرض سے کرے تو اس کی گنجائش ہے۔ کیونکہ اس کی متجر علمی کی وجہ سے گمراہی کا اندیشہ نا کے درجے میں ہوگا اور مقصد استفادہ کرنا نہیں ہے بلکہ اس مذہب کے لوگوں کے عقائد باطلہ کی تردید کرنا ہے جو ایک صحیح ودرست مقصد ہے''۔[1]

دارالعلوم دیوبند کے اس فتویٰ سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ دیگر آسمانی کتابوں کا مطالعہ ہر کس وناکس کو نہیں کرنا چاہیے بلکہ جو علمی تفوق رکھتا ہے اس کو دیگر آسمانی کتابوں کا مطالعہ کرنے کی گنجائش ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ آج کے دور میں مطالعۂ ادیان کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ ہم ایک مخلوط سوسائٹی اور تکثیری سماج میں رہتے ہیں۔ ہمارا سابقہ دنیا میں پائی جانے والی تمام تہذیبوں، ادیان اور اقوام سے پڑتا ہے۔ دیگر ادیان کے متبعین ہمارے پڑوسی ہیں، تو کہیں ہمارا ان سے لین دین اور معاملہ ہے۔ علاوہ ازیں اور بھی بہت ساری بنیادی ضروریات میں دیگر مذاہب کے ماننے والوں سے واسطہ رہتا ہے۔ ان تمام حالات کو مدنظر رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کو دیگر مذاہب کی تہذیب، تاریخ اور ان کی تہذیب ومعاشرت کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کے عقائد وافکار اور تعلیمات سے واقفیت پیدا کرنا ضروری ہے۔ یقیناً

[1] آن فتویٰ، فتوی دارالعلوم دیوبند، سوال: ۱۷۰۳۴۵۔ جواب ۱۷۰۳۴۶

اس سے معاشرہ میں بھائی چارگی اور ہم آہنگی پیدا ہوگی، جو انسانی سوسائٹی کو امن وامان کی طرف لے جانے میں مفید ومددگار ثابت ہوگی۔

ویدوں کا ذکر قرآن میں:

ہندوازم کے ماننے والے کی تعداد دنیا میں اچھی خاصی ہے۔ خصوصاً ہندوستان میں ان کی اکثریت ہے۔ ان کے پاس ایک تہذیب اور دین ہے جس پر وہ عمل کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے یہاں کتابیں بھی پائی جاتی ہیں، ان کے یہاں ویدوں کے نام سے جو نوشتے ہیں اس بابت ہندو علماء کے یہاں اختلاف ملتا ہے کہ آیا وہ آسمانی ہیں، یا انسانی کدو کاوش کا نتیجہ۔ اس سلسلہ میں مسلم مفکرین اور کئی مستشرقین مثلاً موکس مولر نے کافی کچھ لکھا ہے۔ اسی طرح ایک بحث یہ اٹھائی گئی ہے کہ ویدوں کا ذکر قرآن میں ہے یا نہیں؟ یہ تمام مباحث نہایت سنجیدہ ہیں ان پر علماء نے علمی اور تحقیقی گفتگو کی ہے ان مباحث کو پیش کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ ہندوؤں کی کتابوں کا مختصر تعارف پیش کر دیا جائے۔ چنانچہ مولانا عبدالحق ودیارتھی (۱۸۸۸۔۱۹۷۷) (یہ قادیانی عالم ہیں انہوں نے میثاق النبیین کے نام سے ایک اہم کتاب تصنیف کی ہے) نے ہندوؤں کی کتابوں کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

> ''اہل ہنود کی کتب مقدسہ وید۔ اپنشد اور پران تین حصوں میں منقسم ہیں۔ برہمن گرنتھ ویدوں کی ہی تشریحات ہیں اگر چہ ان کو بھی شرتی (الہامی کتب) میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ وید بلحاظ منقسم چار ہیں۔ (گو تعداد کے لحاظ سے ۱۱۳۱ مستند ہیں جن میں سے اس وقت صرف دس گیارہ دستیاب ہیں) رگوید، یجروید اور سام وید ان تینوں ویدوں کو پرانا سمجھا جاتا ہے۔ انہی تینوں ویدوں کو ترودیا (علوم ثلاثہ) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اتھروید کو سب سے آخری کہا جاتا ہے۔ ان چار ویدوں کے زمانۂ نزول یا تالیف میں سخت اختلاف ہے۔ یورپین علماء سنسکرت تو اس بارے میں قریباً قریباً متفق ہیں۔ مگر ہندو فضلا اور فرقوں میں اس کے متعلق نا قابل تصفیہ اختلاف آراء موجود ہے۔ ایک عالم کی تحقیق میں

ویدا گر آج سے ایک ارب ۳۱ کروڑ برس پہلے نازل ہوئے تو دوسروں کی تحقیق میں چار ہزار سال سے زیادہ ان کی عمر نہیں۔ زمانۂ تالیف کے علاوہ ان کے رشیوں (رسولوں) جائے نزول اور تعداد کے متعلق بھی بیسیوں مختلف آراء ہیں۔ تاہم ویدان کے یہاں نہایت مستند کتابیں ہیں ایسی مستند کہ وہ ہندو دھرم کی گویا بنیاد ہیں۔ ویدوں کے بعد دوسرے درجہ کی کتابیں اپنیشد ہیں بلکہ بعض پنڈتوں کے نزدیک ان کا درجہ ویدوں پر بھی فائق ہے۔ ہندوؤں کو ان کی فلاسفی پر ناز ہے۔ نہ صرف ہندوؤں کو بلکہ خود اپنشدوں کو بھی ویدوں پر فضیلت کا ادعا ہے۔ اپنشدوں سے نیچے اتر کر ہندوؤں کی مستند کتاب اور سب سے بڑھ کر کثیر التلاوت کتابیں پران ہیں یہاں تک کہ وید جس قدر عسیر الفہم اور کمیات ہیں، پران اسی قدر سہل الحصول اور دستیاب ہیں۔ ہندوؤں میں یہ کتابیں انتہائی تعظیم کی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ اور نہایت ذوق شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ پرانوں میں تخلیق کائنات آریہ نسل کے ابتدائی قبائل کا ذکر۔ ہندو قوم کی قابل پرستش ہستیوں کے واقعات زندگی اور افسانے ہیں۔ مہرشی ویاس نے ۱۸ ضخیم جلدوں میں ان کو تقسیم کیا ہے۔ ہندوؤں کا سواد اعظم ان کی نسبت یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ وید خود پرانوں کی مصدق ہیں جس سے اس کا مستند اور قدیم ہونا ثابت ہوتا ہے۔[1]

ان کے علاوہ ہندوؤں کے یہاں گیتا، رامائن، منودھرم شاستر، ارتھ شاستر اور مہابھارت وغیرہ بھی مقدس اور اہم مانی جاتی ہیں۔ گیتا کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عدالت کی کارروائی شروع ہونے سے قبل موکل کو گیتا پر ہاتھ رکھ کر قسم دلائی جاتی ہے۔ گویا یہ بات درست ہے کہ ہندوؤں کے یہاں کتابوں کا تصور پایا جاتا ہے۔ ان کتابوں میں بہت ساری تعلیمات ایسی ہیں جو اسلام کی تعلیمات سے ہم آہنگ ہیں۔ اس طرح ان کے

[1] ودیارتھی، عبدالحق (مولانا)، میثاق النبیین، دارالاشاعت کتب اسلامیہ مولانا آزاد روڈ جیکب سرکل بمبئی، بدون سن، ص: ۷۵۔۷۷

مذہبی نوشتوں ویدوں میں تو محمد ﷺ کے متعلق بشارت ملتی ہے۔ ہندو فضلا اور بعض مسلم علماء کی تحقیق کے مطابق ویدوں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ الہامی ہیں۔ لہذا اب اس نکتہ پر بحث کرنے کی جسارت کی جائے گی 'اگر اب بھی نہ جاگے تو' کے مصنف نے اس بابت بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے کہ وید الہامی ہیں۔ انہوں نے اس حوالے سے کئی مسلم علماء کے افکار بھی نقل کیے ہیں۔ مثلا انہوں نے پروفیسر خلیق احمد نظامی کی کتاب تاریخ مشائخ چشت کے حوالے سے لکھا کہ مرزا مظہر جان جاناں نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر کیا ہے:

''ہندوؤں کو مشرکین عرب کے مشابہ تسلیم کرنے سے نہ صرف انکار کیا ہے بلکہ وید کو الہامی کتاب مانتے ہوئے ہندوؤں کو اہل کتاب کا مرتبہ دیا ہے۔''

اسی طرح 'اگر اب بھی نہ جاگے تو' کے مصنف نے مزید لکھا ہے:

''مظاہر العلوم سہارنپور کے مفتی مولانا یحی صاحب نے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں نور اللہ مرقدہ کے مکتوب میں وید کے متعلق تحریر موجود ہے کہ انہوں نے اس کو آسمانی اور الہامی کتاب قرار دیا ہے۔ نیز مولانا شاہ عبدالعزیز اور مولانا عبدالحئ لکھنوی کے فتاوی میں ان کے مقتداؤں کا ذکر ہے جن کو یہ اوتار (اتارے ہوئے) کہتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ جو لوگ مثلاً آریہ اپنے مذہب کو آسمانی دھرم اور اپنی کتاب کو الہامی کتاب کہتے ہیں ان سے ان کے دعوی پر برہان طلب کی جاسکتی ہے۔ لیکن بلا وجہ حتمی طور پر اس کا انکار نہ کیا جائے''۔[1]

مرزا مظہر جان جاناں کے اس خط کو راقم نے اپنی کتاب ''ہندوستان کی شرعی حیثیت'' میں ذکر کیا ہے۔ دراصل یہ ایک نہایت حساس مسئلہ ہے اس پر از سرے نو مدلل اور مفصل گفتگو کر کے کسی ایک نتیجے پر پہنچنے کی ضرورت ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ویدوں میں بہت سارے ایسے منتر اور آیات ہیں جن سے توحید باری تعالیٰ، رسالت، آخرت اور دیگر احکام ثابت ہوتے ہیں، جو ہمیں قرآن میں ملتے ہیں اس تناظر میں اگر ویدوں کو دیکھا جائے تو اس بات کا

[1] اگر اب بھی نہ جاگے تو، ص: ۴۲

انکار کرنا مشکل ہے کہ یہ الہامی نہیں ہیں۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے ایک استفتار کے جواب میں ایک لطیف اشارہ کیا ہے اس کو یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

''ہمارا اعتقاد ہے کہ وید مجموعی طور پر الہامی نہیں لیکن بعض کلام اس میں کسی صاحب باطن کا درج ہو تو ممکن ہے۔ جس کلام سے محمد رشی لکھا گیا ہے وہ کشفی معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ کی اس سے تشفی نہیں ہوئی تو سمجھیے کہ محمد رشی معتقدین وید کے لیے الزامی دلیل ہے۔ جیسے انجیل، تورات موجودہ کے حوالے سے الزامی ہے''۔[۲]

عام طور پر ہمارے یہاں یہ رویہ پایا جاتا ہے کہ ویدوں کو پڑھنا یا ان سے اخذ و استفادہ کرنا ممنوع ہے۔ یہی نہیں بلکہ اگر کوئی یہ سوال کرتا ہے کہ ویدوں کے متعلق کیا رائے ہے تو مذہبی طبقہ برجستہ یہ جواب دے دیتا ہے کہ الہامی نہیں ہے، بلکہ انسانوں کے وضع کردہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ رویہ قطعاً درست نہیں ہے اگر چہ یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ وید الہامی نہیں ہے اس کے باوجود ہمیں ہندو نفسیات اور ہندوؤں کے جذبات کا خیال رکھنا چاہئے۔ یہ صداقت ہے کہ ہندوؤں کو اپنے تمام مذہبی گرنتھوں سے لگاؤ ہے اور وہ ویدوں کو الہامی تصور کرتے ہیں۔ اس لیے ہمارا رویہ نہایت محتاط اور متوازن ہونا چاہیے، ہمارے الفاظ، یا کسی بھی نقل و حرکت سے کسی کی بھی دل آزاری نہیں ہونی چاہیے۔ یقیناً ہمارے غیر محتاط رویہ سے معاشرے میں بدامنی اور باہمی تناؤ کی کیفیت ہوسکتی ہے۔ وید الہامی ہیں یہ ایک علمی بحث ہے اس بارے میں صرف اصحاب علم ہی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ہندو مذہبی گرنتھوں کی قدر و منزلت پر حرف نہیں آنا چاہیے۔ یعنی ہندوؤں کی مذہبی شخصیات اور ان کے دینی صحیفوں کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے۔

اس بابت ایک اہم بحث علماء خصوصاً مسلم مفکرین کے یہاں یہ ملتی ہے کہ آیا ویدوں کا ذکر قرآن میں موجود ہے یا نہیں؟ البتہ قرآن میں انجیل، زبور اور صحف ابراہیم کا تذکرہ ملتا ہے۔ دراصل قرآن میں کئی آیتیں ایسی ہیں جن سے بہت سارے مسلم دانشوروں نے یہ قیاس کیا ہے کہ ان سے مراد وید ہوسکتے ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

[۲] https://urdufatuee.com

وَقَالُوا لَوْلَا يَأْتِينَا بِآيَةٍ مِّن رَّبِّهِ أَوَلَمْ تَأْتِهِم بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْأُولَى ۔[1]

''اور وہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ یہ (رسول) ہمارے پاس اپنے رب کے پاس سے کوئی چیز نشانی (اپنی ثبوت کی) کیوں نہیں لاتے جواب یہ ہے کہ کیا ان کے پاس پہلی کتابوں کے مضامین کا ظہور نہیں پہنچا۔''

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ۔[2]

''اور اس قرآن کا ذکر پہلی امتوں کی آسمانی کتابوں میں بھی ہے۔''

ایک جگہ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَى ۔[3]

''یہ مضمون اگلے صحیفوں میں بھی ہے۔''

ان آیات کے علاوہ قرآن میں، پچھلی امتوں کی شریعت کی طرف اشارہ کیا گیا۔ کسی بھی کتاب یا شریعت کا نام نہیں لیا گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ. بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۔[4]

''اور ہم نے آپ کے قبل صرف دو آدمی ہی (رسول بنا کر معجزات کتابیں دے کر) بھیجے ہیں کہ ہم ان پر وحی بھیجا کرتے تھے سو اگر تم کو علم نہیں تو اہل علم سے پوچھ دیکھو اور آپ پر بھی قرآن اتارا ہے۔ تاکہ جو مضامین لوگوں کے پاس بھیجے گئے ان کو آپ ان سے ظاہر کر دیں اور تاکہ وہ فکر کیا کریں۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے جہاں بھی صحف اولیٰ یا زبر الاولین کا تذکرہ کیا ہے

---

[1] سورۃ طٰہٰ: ۱۳۳ [2] سورۃ الشعرا: ۱۹۶

[3] سورۃ الاعلیٰ: ۱۸ [4] سورۃ النحل: ۴۳۔۴۴

ان سے کسی خاص شریعت کی تعیین نہیں ہے۔ اس لیے بہت سے علماء نے یہ قیاس لگایا ہے کہ ان آیات سے ہندوؤں کے دینی نوشتے وید مراد ہیں۔ چنانچہ شمس نوید عثمانی نے اپنی کتاب 'اگر اب بھی نہ جاگے تو' میں یہ سوال قائم کیا ہے کہ جنہیں قرآن میں صحف کہا گیا ہے ہندو انہیں آدگرنتھ کہتے ہیں مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔ تو کہیں اس سے مراد وید تو نہیں ہیں۔؟

''قرآن پاک میں جب ہم پچھلی کتابوں کا ذکر ڈھونڈتے ہیں تو ہمیں توریت زبور انجیل اور صحف ابراہیمی کے علاوہ پچھلی کتابوں کے لیے صحف اولیٰ اور زبر الاولین کے الفاظ ملتے ہیں۔ جن کے لفظی معنیٰ ہیں سب سے پہلے صحیفے اور سب سے پہلے بکھرے ہوئے اوراق ان دونوں الفاظ کے سنسکرت مترادف الفاظ آدگرنتھ اور آدگیان ہیں۔ ویدوں کے بارے میں ہندوؤں کا دعویٰ ہے کہ یہ آدگرنتھ اور آدگیان ہیں۔ کیا کبھی آپ نے یہ سوچا ہے کہ قرآن جنہیں زبر الاولین یا صحف اولیٰ کہتا ہے وہ کہیں یہی کتابیں تو نہیں ہیں جنہیں ہندو آدگرنتھ کہتے ہیں۔ یہاں اس بات کا خیال رہے کہ اگر وید نام کی کسی کتاب کو ہم نے قرآن کریم سے ڈھونڈھنے کی کوشش کی تو یہ سعی لا حاصل رہے گی''۔[1]

یہی مصنف دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں:

''ایک قوم صدیوں سے یہاں رہ رہی ہے اس کے پاس بھی صحف اولی اور زبر الاولین ہیں؟ ایک بہت بڑی قوم ہزاروں سال سے نزول قرآن سے بھی پہلے سے یہ دعوی کرتی ہے کہ اس کے پاس صحف اولیٰ یا زبر الاولین ہیں۔ اپنی زبان میں وہ یہی الفاظ اپنی کتابوں کے لیے استعمال کرتی چلی آرہی ہے اور ہم ایک ہزار سال سے اسی ملک میں اسی قوم کے درمیان رہتے ہوئے بھی تحقیق کیے بغیر ان کے آدگرنتھوں کو پڑھے بغیر یہی کہے چلے جارہے ہیں کہ صحف اولیٰ زبر الاولین کا دنیا میں اب کوئی وجود نہیں ہے اور پھر ایسا بھی تو نہیں کہ بہت سی قومیں اس نام کی کتاب رکھنے کا دعوی کرتی ہوں۔ جس سے سب کا یہی دعوی

[1] اگر اب بھی نہ جاگے تو، ص:۸۹

مشکوک ہو رہا ہے بلکہ دنیا میں صرف یہی ایک مذہبی قوم ہے جو اس کی مدعی ہے ''[1]

یہ بھی ملاحظہ کرتے چلئے:

''بہرحال قرآن نے اپنے مخصوص طرز بیان میں جن نبیوں کی کتابوں سے اس وقت کے قرآن کے مخاطب واقف تھے۔ ان کا نام ان الفاظ میں لیا گیا کہ وہ لوگ آسانی سے پہچان لیں۔ لیکن ان سے پہلی کتابوں کا ذکر بھی چھوڑا نہیں اس کے لیے ایسے جامع اور ذومعنیٰ الفاظ استعمال فرمائے کہ جو صرف اللہ رب العزت ہی کی خصوصی شان ہے۔ صحف اولیٰ اور زبر الاولین کے الفاظ سے اس دور کے لوگوں کو کبھی کوئی دقت پیش نہیں آئی کیوں کہ ان سے وہی تمام صحائف وہ مراد لیتے رہے جن کو وہ جانتے تھے''[2]

مذکورہ تینوں اقتباس کی روشنی میں یہ بات عرض کی جاسکتی ہے کہ قرآن کی جن آیتوں میں صحف اولیٰ کے الفاظ آئے ہیں ممکن ہے کہ ان سے ہندوؤں کی وہی کتاب مراد ہوں جن کو وہ اپنی زبان میں آدگرنتھ کہتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اگر یہ بات تسلیم نہ بھی کی جائے کہ ان الفاظ سے وید مراد نہیں ہیں لیکن پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ قرآن نے جہاں بھی پچھلی کتابوں کا ذکر کیا ہے ان کا نام وضاحت سے پیش کیا ہے۔ لہٰذا یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان سے ہندوؤں کا دینی ادب یعنی وید مراد ہیں۔ اب ذرا اس مضمون کو تفصیل سے دیکھئے ڈاکٹر حمید اللہ نے ''زبر الاولین'' کے متعلق لکھا ہے:

''ہندوستان میں کچھ دینی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ اور ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے الہام شدہ کتابیں ہیں۔ ان مقدس کتابوں میں وید، پران، اپنشد اور دوسری کتابیں شامل ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ سب کتابیں ایک ہی نبی پر نازل ہوئی ہیں۔ ممکن ہے متعدد نبیوں پر نازل ہوئی ہوں۔ بشرطیکہ وہ نبی

---

[1] اگر اب بھی نہ جاگے تو، ص: ۸۹-۹۰

[2] ایضاً، ص: ۹۲

ہوں، ان میں خصوصاً ''پران'' نامی کتاب میں کچھ دل چسپ اشارے ملتے ہیں ''پران'' وہی لفظ ہے جو اردو میں پرانا یعنی قدیم ہے۔ اس کی طرف ہمیں قرآن مجید میں ایک عجیب وغریب اشارہ ملتا ہے انہ زبر الاولین (اس چیز کا پرانے لوگوں کی کتابوں میں ذکر ہے) میں نہیں جانتا کہ اس کا پران سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ بہر حال دس پران ہیں ان میں سے ایک میں یہ ذکر آیا ہے کہ آخری زمانہ میں ایک شخص ریگستان کے علاقے میں پیدا ہوگا اس کی ماں کا نام قابل اعتماد اور باپ کا نام اللہ کا غلام ہوگا، وہ اپنے وطن سے شمال کی طرف جا کر بسنے پر مجبور ہوگا اور پھر وہ اپنے وطن کو متعدد بار دس ہزار آدمیوں کی مدد سے فتح کرے گا۔ جنگ میں اس کی رتھ کو اونٹ کھینچیں گے اور وہ اونٹ اس قدر تیز رفتار ہوں گے کہ آسمان تک پہنچ جائیں گے۔ (شاید معراج مبارک کی طرف اشارہ ہے) اس کتاب میں جو مذکورہ الفاظ ہمیں ملتے ہیں اس سے ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف اشارہ مستنبط کیا جا سکے'' [1]

اس تناظر میں اگر ہم دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کے یہاں جو دینی کتابیں خصوصاً وید پائے جاتے ہیں۔ ان میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اسلام کی تعلیمات سے پورے طور پر یکسانیت رکھتی ہیں۔ اس طرح کی بہت سی چیزوں کو شمس نوید عثمانی نے جمع کیا ہے ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، جو اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ ہوسکتا ہے یا قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ہندو جن کتابوں کے الہامی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ الہامی ہوں۔ اب ان میں تحریف کر دی گئی ہو، سورہ طہٰ کی آیت ۱۳۳ کے ضمن میں مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے:

وَقَالُوا لَوْلَا يَأْتِينَا بِآيَةٍ مِّن رَّبِّهِ أَوَلَمْ تَأْتِهِم بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْأُولَى۔ [2]

وهو البينه والشاهد على صحة ما فى الكتب المقارمة، كالتوراة و الانجيل و الزبور و سائر الكتب

[1] خطبات بہاول پور، ص: ۲۔۳ [2] سورۃ طہٰ: ۱۳۳

المنزلة المشتملة على العقيدة و الاحكام الشريعة''۔[1]

''صحف اولیٰ سے مراد توراۃ، انجیل اور تمام کتب مراد ہیں جو آسمانی ہیں، اور اس میں عقائد صحیحہ اور احکام شرعیہ موجود ہیں۔''

علامہ سید سلیمان ندوی نے اس بابت بڑی عمدہ بات لکھی ہے:

''اس بنا پر انبیاء کی طرح ان کتابوں پر بھی مسلمان کا تفصیلی اور اجمالی ایمان ہے، جن کتابوں کے نام مذکور ہیں۔ ان ناموں کے ساتھ اور جن کے نام مذکور نہیں ان پر بالاجمال ایمان لانا ضروری ہے۔ کسی قوم میں اگر کوئی آسمانی کتاب ہے جس کا وجود قرآن سے پہلے ہے۔ لیکن اس کا تصریحی نام قرآن میں مذکور نہیں ہے اور اس میں توحید الٰہی کی دعوت اور طاغوت سے بچنے کی نصیحت بھی ہے اگرچہ ہم اس کو خدا کی کتاب تسلیم نہیں کر سکتے، تاہم بالتصریح اس کا انکار بھی نہیں کر سکتے اس بناء پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب یہی حال دوسری مشکوک کتابوں کا ہے''۔[2]

اب ذرا مولانا مناظر احسن گیلانی کی رائے بھی ملاحظہ کرتے چلیے وہ اپنی کتاب 'النبی الخاتم' میں تحریر کرتے ہیں:

''ہمارے ملک میں وید کی صورت میں اوتاروں کا نام پیش کیا جاتا ہے، لیکن لاپرواؤ! تم سے جب ان کے ناموں کا بھی بوجھ نہ اٹھایا گیا تو ہمیں کیا دکھاتے ہو کہ یہ ہے ان کے کاموں کا پشتارہ۔ تاریخ کے تحقیقی ہاتھوں نے ہندوستان کے رہنماؤں اور ان کی امتوں کے درمیان جو اندھیری کھائیاں ہیں اور مسلسل کھدی چلی جارہی ہیں، کیا اب آدمی کے بس میں ہے کہ ان کو پاٹے کن پر اتری؟ کہاں اتری؟ کن زبانوں میں اتری؟ نظم میں اتری کہ نثر میں اتری؟ صدیوں میں اتری؟ جگوں میں اتری؟ جب ان تمام بنیادی سوالات پر جن کی

---

[1] زحیلی وھبہ (ڈاکٹر) التفسیر المنیر فی العقیدہ والشریعۃ والمنھج، دارالفکر دمشق، ۲۰۰۹، ج۸، ص:۶۷۲

[2] سیرۃ النبی، جلد۴، ص:۵۷۷

تحقیق کے بغیر کسی چیز کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ اٹکا ہوا ہے، تم خود جانتے ہو کہ ان پر اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ بتاؤ کہ شک کی ان دلدلوں میں یقین کا قدم کس طرح اٹھایا جائے گا''۔[1]

یعنی مولانا کی اس بات میں پوری طرح سچائی کہ ہندوازم کا جو دینی ادب ہے آج اس کی حالت پوررری طرح مشتبہ ہوگئی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج خود ہندو علماء، ہندوازم کا دائرہ حدود اور اس کی کوئی ایک تعریف تک نہیں بتا پاتے ہیں۔ یہی حال ان کی مذہبی کتابوں کے ساتھ ہوا، مذہبی کتابوں کو اس قدر بدل دیا گیا کہ ان کی جو اصل روح تھی اب تقریباً مفقود ہو چکی ہے۔ تاہم کچھ چیزیں اب بھی ایسی ملتی ہیں جو اسلامی تعلیمات سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔

علاوہ ازیں اہل حدیث عالم رفیق احمد رئیس سلفی سے جب اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ قرآن میں ویدوں کا ذکر موجود ہے تو انہوں نے کہا:

''اسلام جس رواداری کا قائل ہے اس رواداری کے دائرہ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ اگر اپنے پاس موجود کسی مقدس کتاب کو الہامی کتاب کہتا ہے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ ان کے اس عقیدے کا احترام کریں۔ چہ جائے کہ اس میں کچھ باتیں بہت سی ان کے اپنے عقیدے کے خلاف ہوں۔''

ذیل میں اس بابت چند باتیں گوش گزار کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ قرآن کے اولین مفسرین کا تعلق برصغیر سے نہیں ہے اس لیے انہیں اس بات کا علم ہی نہ تھا کہ برصغیر خصوصاً ہندوستان میں کوئی گروہ ایسا بھی ہے جو یہ دعوی کرتا ہے کہ ہمارے پاس الہامی کتب موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ان تفاسیر کا مطالعہ کرتے ہیں تو کہیں بھی یہ بحث نہیں ملتی ہے کہ زبر الاولیں یا صحف اولیٰ سے مراد وید یا ہندوؤں کی کتب مقدس ہیں۔ اس بنا پر یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اسلام عالم گیر رواداری اور امن کا مذہب ہے۔ اسلام نہ کسی کی دینی کتب، مذہبی شخصیات اور نہ دینی مراکز کی بے توقیری کرتا ہے۔ اس تناظر میں اگر ہم دیکھیں تو پھر یہ بات

[1] گیلانی، مناظر احسن (مولانا)، النبی الخاتم، مکتبہ اخوت، بدون سن، ص: ۱۰-۱۱

تسلیم کرنی ہوگی کہ اگر ہندوؤں کا ایک گروہ اگر یہ دعوی کرتا ہے کہ ہمارے پاس موجود دینی ادب الہامی ہے تو اسے تسلیم کیا جائے۔ الا یہ کہ اس دینی ادب میں مسلمانوں کے خلاف باتیں موجود ہوں۔

اسلام نے رواداری اور ہم آہنگی و بین الاقوامی تعلقات کے جو رہنما اصول مرتب کیے ہیں ان کی افادیت ومعنویت سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ویدوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں بہت ساری باتیں ایسی ہیں جو اسلامی تعلیمات سے کما حقہ مماثلت وممارست رکھتی ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ وہ کتابیں جن میں توحید، رسالت، آخرت یا اسلامی احکام کے مطابق چیزیں پائی جاتی ہوں تو انہیں الہامی تسلیم کیا جائے۔ اگر چہ اس وقت وہ تحریف شدہ ہیں۔ اسی کے ساتھ اس بات پر بھی غور کرنا ہوگا کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جو اتنی پرانی کتابوں کا دعوی مذہبی کتاب کی حیثیت سے کرتی ہو، صرف ہندو قوم ایسی ہے جن کا یہ دعوی ہے کہ دنیا کی قدیم ترین کتاب وید ہیں اور یہ خدا کی طرف سے الہام کی گئی ہیں۔ بہر حال ہندوؤں کے دینی ادب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی تعلیمات کی ان کی کتابوں میں بہت ساری باتیں موجود ہیں۔ جو اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ ہندوستان جیسے تکثیری سماج میں ان کے اس دعوی کو تسلیم کیا جائے ان سے جہاں دعوت دین کے تقاضے پورے ہوں گے، وہیں سماجی اور معاشرتی سطح پر بھی اس کے دور رس نتائج مرتب ہوں گے، معاشرہ میں امن وامان اور رواداری کا فروغ ہوگا جو تکثیری سماج کی بنیادی ضرورت ہے۔

وحدت دین کا تصور:

دنیا ادیان، تہذیبوں اور مذاہب کی کہکشاں ہے۔ ہر ایک اپنے مذہب اور دھرم کی صداقت پر اور اپنے مذہب کی تعلیمات پر ایمان ویقین رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں مذاہب وادیان کے درمیان آج جو کشمکش اور تصادم وٹکراؤ کی کیفیت نظر آتی ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہر مذہب والا دوسرے مذہب کا نہ صرف انکار کرتا ہے بلکہ اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذہب کی تعلیمات، تاریخ وروایات اور احکام ومسائل کو پوری طرح باطل قرار دیتا ہے۔ یقیناً اس سے

معاشرے میں روز افزوں تشویش بڑھتی ہے۔ غلط فہمیاں اور نفرتوں میں اضافہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے معاشرہ میں مذہب و مسلک کے نام جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ یقیناً یہ صورت حال کسی مہذب، باشعور معاشرے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اسلام نے اس حوالے سے وحدت دین کا جو تصور پیش کیا ہے۔ اس کو ذیل میں پیش کیا جائے۔ تاکہ مطالعۂ ادیان کا مفہوم واضح ہو سکے۔ چنانچہ مسلمانوں کے یہاں مطالعۂ ادیان کی جو خوشگوار روایت شروع سے اب تک ملتی ہے اس کی اہمیت سے قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وحدت ادیان کا جو تصور اسلام پیش کرتا ہے۔ اس سے بھی مطالعۂ ادیان کے لیے بنیادی طور پر ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے وحدت دین کا مفہوم اس طرح پیش کیا ہے:

> ''تمام رسولوں اور ان کے صحیفوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ محمد ﷺ کی تعلیم یہ ہو کہ آدمؑ سے لے کر محمد علیہ السلام تک جتنے سچے مذہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے۔ چنانچہ درحقیقت آپ ﷺ کی یہی تعلیم تھی۔ اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے جو آدم سے محمد ﷺ تک باری باری پیغمبروں کے ذریعہ سے آتا رہا ہے اور انسانوں کو اس کی تعلیم دی جاتی رہی''۔[1]

وحدت دین پر قرآن نے جو شہادت پیش کی اس کو ذیل میں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

> شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحاً وَالَّذِيَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ اللَّهُ يَجْتَبِيَ إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِيَ إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ. وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءهُمُ الْعِلْمُ بَغْيَاً بَيْنَهُمْ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ مِن بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ

[1] سیرۃ النبی، جلد۴، ص:۷۶۹

مُرِيبٍ . فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ آمَنتُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِن كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ۔[1]

''اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس پر آپ کے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو (مع ان سب کے اتباع کے) حکم دیا تھا (اور ان کی امم کو یہ کہا تھا) کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔ مشرکین کو وہ بات بڑی گراں گزرتی ہے جس کی طرف آپ ان کو بلا رہے ہیں۔ اللہ اپنی طرف جس کو چاہتا ہے کھینچ لیتا ہے۔ اور جو شخص (خدا کی طرف) رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دے دیتا ہے اور وہ لوگ بعد اس کے کہ ان کے پاس علم پہنچ چکا تھا۔ آپس کی ضد سے باہم متفرق ہو گئے اور اگر آپ کے پروردگار کی طرف سے ایک وقت متعین تک (کے لیے مہلت دینے کی) ایک بات پہلے قرار نہ پا چکی تو (دنیا ہی میں) ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ اور جن لوگوں کو ان کے بعد کتاب دی گئی (مراد اس سے مشرکین عہد نبوی کے ہیں) اس کی طرف سے ایسے شک میں پڑے ہیں جس نے (ان کو) تردد میں ڈال رکھا ہے۔ سو آپ اس طرف (ان کو برابر) بلاتے رہیے اور جس طرح آپ کو حکم ہوا ہے (اس پر) مستقیم رہیے اور ان کی (فاسد) خواہشوں پر نہ چلیے اور آپ کہہ دیجیے کہ اللہ نے جتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ میں سب پر ایمان لاتا ہوں اور مجھ کو یہ (بھی) حکم ہوا ہے کہ (اپنے اور) تمہارے درمیان عدل رکھوں۔ اللہ ہمارا بھی مالک اور تمہارا بھی مالک ہے۔ یہ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، ہماری تمہاری کچھ بحث نہیں اللہ ہم سب کو جمع کرے گا اور

[1] سورۃ الشوریٰ: ۱۳۔۱۵

(اس میں شک ہی نہیں کہ) اس کے پاس جانا ہے۔''

علامہ سید سلیمان ندوی نے درج بالا آیت کے ذیل میں لکھا ہے:

''ان آیات مبارکہ میں کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہی ایک دین ہے جو نوح کو ابراہیم کو موسیٰ کو اور تم کو اے محمد ﷺ عطا کیا گیا''۔[1]

یعنی یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلام کسی بھی دین کو نیست و نابود کرنے نہیں آیا۔ ان کو مٹانے یا ان کو ختم کرنے نہیں آیا بلکہ اسلام وہی دین ہے جو حضرت آدمؑ سے چلا آیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸۔ ۱۹۵۸) نے اپنی تفسیر 'ترجمان القرآن' میں وحدت دین کے حوالے سے نہایت جامع اور مفصل گفتگو کی ہے اسی مناسبت سے انہوں نے لکھا ہے:

''دنیا میں کوئی مذہب بھی ایسا نہیں ہوا ہے جس نے ایک دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ و اختلاف سے بچنے کی تعلیم نہ دی ہو۔ سب کی تعلیم یہی تھی کہ خدا کا دین بچھڑے ہوئے انسانوں کو جمع کر دینے کے لیے ہے۔ الگ الگ کر دینے کے لیے نہیں ہے۔ پس ایک پروردگار عالم کی بندگی و نیاز میں سب متحد ہو جائیں اور تفرقہ و مخاصمت کی جگہ باہمی محبت و یک جہتی کی راہ اختیار کریں''۔[2]

آگے لکھتے ہیں:

''خدا کے جتنے رسول بھی پیدا ہوئے سب کی تعلیم یہی تھی کہ ''الدین'' پر یعنی بنی نوع انسانی کے ایک ہی عالم گیر دین پر قائم رہو اور اس راہ میں ایک دوسرے الگ نہ ہو جاؤ''۔[3]

علامہ سید سلیمان ندوی نے تمام مذاہب کے متعلق جو روادار اور معتدل الفاظ کہے

---

[1] سیرۃ النبی، جلد ۴، ص: ۶۱۷

[2] آزاد ابوالکلام احمد (مولانا)، ترجمان القرآن، اسلامی اکیڈمی، الفضل مارکیٹ لاہور، بدون سن، جلد ۱، ص: ۲۲۲

[3] ایضاً، ص: ۲۲۳

ہیں ان سے بھی وحدت دین کے تصور اور اس کی روح کو جلا ملتی ہے:

''صحیفۂ محمدی نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کیے ایک دین اور دوسرا شرعہ، منسک اور منہاج، شرعہ اور منہاج کے معنی راستہ کے ہیں اور منسک کے معنی عبادت کے ہیں۔ دنیا میں یہ راز سب سے پہلے محمد ﷺ کے قلب پاک پر منکشف ہوا کہ دین الٰہی ہمیشہ سے ایک تھا۔ ایک رہا اور ایک رہے گا۔ نور معرفت ایک ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قندیلوں میں روشن ہو۔ اصل دین میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی۔ ایک ہی دین تھا جس کو لے کر اول سے آخر تک تمام انبیاء آتے رہے۔ اس میں زمان و مکان کے تغیر کو کوئی دخل نہ تھا۔ اور نہ قوم و ملک کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا۔ وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں آیا اور وہاں کے ہر پیغمبر نے اس کی یکساں تعلیم دی، یہ دائمی حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے؟ یہ مذہب کے اصل اصول ہیں۔ یعنی خدا کی ہستی اس کی توحید اس کے صفات کاملہ، انبیاء اور رسولوں کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوق انسانی، اخلاق فاضلہ، اچھے اور برے اعمال کی باز پرس اور جزا و سزا۔ یہ تمام مذاہب کے وہ بنیادی امور ہیں۔ جن پر جملہ مذاہب حقہ کا اتفاق ہے۔ اگر ان میں سے کسی جہت سے کوئی اختلاف ہے تو طریقہ تعبیر کی غلطی ہے اور یا باہر سے آ کر اس تعلیم میں کوئی نقص شامل ہو گیا ہے''۔[1]

یہ اقتباس اس بات پر بین ثبوت ہے کہ تمام مذاہب کی تعلیمات یکساں ہیں ان میں جو بنیادی اور دائمی تعلیمات ہیں وہ تمام مذاہب میں ایک ہی رہی ہیں۔ اب تک جتنے بھی صحیفے اور کتابیں نازل کی گئی ہیں ان کی حکمت و مصلحت کیا ہے اس حوالے سے علامہ سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

''انبیاء کی سوانح پر نظر کرنے سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ ایک

[1] سیرۃ النبی، جلد۴، ص:۷۵۹۔۷۶۰

صاحب شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحب شریعت نبی اس وقت مبعوث ہوا جب کہ اگلا صحیفۂ وحی جو دین وشریعت کا محافظ تھا کھو گیا یا انسانی دست برد سے ایسا بدل گیا کہ اس کی اصلیت مشتبہ ہوگئی۔ صحیفۂ ابراہیم کے گم ہوجانے کے بعد جس کا نہایت ناقص خلاصہ تورات کے سفر تکوین میں ہے، صحیفۂ موسیٰ نازل ہوا۔ صحیفہ موسیٰ کے نور سے پیدا اختلاف کو دور کرنے کے لیے زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے۔ پھر انجیل آئی اور انجیل میں انسانی تصرفات کے راہ پانے کے بعد قرآن۔ چونکہ قرآن دنیا کے اخر تک کے لیے آیا ہے اس لیے یہ ہر تحریف اور انسانی تصرف سے اس کی حفاظت کی، البتہ اس کے معانی کی صحیح تشریح اور بدعات کے انسداد کے لیے ائمہ خلفاء، مجددین اور علماء راسخین پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے اور ان کی اصلاح کی صداقت کی پہچان سنت محمدی کا احیاء اور اور بدعات کا قلع قمع ہے''۔[1]

مولانا مناظر احسن گیلانی نے وحدت ادیان کا جو خاکہ اور تصویر پیش کیا ہے اس میں بڑا توسع اور اعتدال جھلکتا ہے۔ وہ اپنی معروف کتاب 'تدوین قرآن' میں لکھتے ہیں:

''آج کروڑہا کروڑ کی تعداد میں مسلمان دنیا کے اکثر علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یقیناً ان میں عیسائی یہودی اور اس قسم کے دوسری مذہبی امتوں کے لوگ بھی شریک ہیں۔ پھر کیا قرآن کو مان کر جو عیسائی تھے مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے حضرت مسیحؑ اور ان کی کتاب انجیل کی تکذیب کی، یا جو یہودی تھے مسلمان ہونے کے بعد موسیٰؑ یا انبیاء بنی اسرائیل کی توہین کر رہے ہیں، یا تورات اور تورات کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کی جو کتابیں ہیں انہیں جھٹلا رہے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مسیح کی تعلیم سے جو دور ہوگئے تھے قرآن شریف کو مان کر وہی عیسائی حضرت عیسیٰؑ اور ان کی صحیح تعلیم سے پھر قریب ہوگئے اور یہی حال ان ساری قوموں کے ساتھ پیش آیا ہے جو گزشتہ تیرہ

[1] سیرۃ النبی، جلد۴، ص:۶۰۷

ساڑھے تیرہ صدیوں میں قرآن کو مان مان کر اسلامی حلقے میں داخل ہوتی رہی ہیں، یعنی اپنے آبائی اور موروثی دین کے جن اجزاء وعناصر کو لگ کھو بیٹھے تھے یا تاریخی حوادث و واقعات نے ان کے دین کے جن حقائق و مسائل کو مشتبہ و مشکوک بنا کر رکھ دیا تھا۔ قرآن شریف کی راہ سے ان کی کھوئی ہوئی چیزوں کو انہوں نے پالیا اور شک وریب کی تاریکیوں میں جو باتیں رل مل گئی تھیں قرآن کی روشنی میں اب یقین کی آنکھوں سے دیکھنے اور پا لینے میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ پس حقیقت یہی ہے کہ اپنے آباء اولین اور گزشتہ باپ دادوں کے دین سے قرآن پاک کو مان کر قطعاً کوئی الگ نہیں ہوا ہے بلکہ جو الگ ہوئے تھے بلاخوف تردید دعوی کیا جاسکتا ہے کہ ان کے آبائی دین ہی کی طرف خدا کی آخری کتاب نے ان سب کو واپس کر دیا ہے۔ اس نے توڑا نہیں بلکہ جو ٹوٹے ہوئے تھے ان کو اپنے بزرگان سلف اور ان کی سچی تعلیم، صحیح زندگی کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ واقعہ یہی ہے خواہ دنیا اس کو مانے یا نہ مانے قرآن کی دعوت وتبلیغ کا یہی محوری نصب العین ہے۔ بکھری ہوئے منتشر اور پراگندہ انسانیت کو اسی راہ سے وحدت ووفاق کے مرکزی نقطہ پر سمیٹ کر لے آنا چاہتا ہے''۔[1]

یعنی متذکرہ اقتباسات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام جس دین کی طرف نوع انسانی کو بلاتا ہے وہ کبھی بھی انسانیت کو ان کے آبائی دین اور موروثی دین سے جدا نہیں کرتا ہے۔ بلکہ وہ تو تمام انسانیت کو اس نقطہ پر جمع کرنے کا خواہاں ہے جو اب تک سابقہ تمام ادیان میں چلا آرہا ہے۔ اس لیے یہ بات بھی عرض کی جاسکتی ہے کہ قوموں، امتوں میں دین کے نام پر جو اختلاف پیدا ہوا ہے وہ اصل میں نہیں بلکہ شرعیہ اور منہاج میں پایا جاتا ہے۔

مولانا آزاد کا نظریہ یہ ہے کہ تمام ادیان کی روح اور حقیقت ایک ہے تاہم جس دور اور جس زمانے میں جیسی ضرورت پڑتی گئی اسی طرح اللہ تعالیٰ عبادت کے طریقے انسانیت کو بتاتا رہا ہے۔ عبادت وریاضت اور رضائے خداوندی کے طریقے ہر مذہب ودین اور دھرم میں

[1] تدوین قرآن، ص: ۴۱۔۴۲

جدا جدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن اصل سرچشمہ تمام مذاہب کا ایک ہی ہے۔ مولانا آزاد نے جو نظریہ وحدت ادیان کا پیش کیا ہے اس پر بہت سارے اہل علم اعتراض کرتے رہے ہیں اور ان کے اس نظریہ پر اعتراضات روا بھی ہیں۔ مولانا کے نظریہ وحدت ادیان کے تناظر میں اگر ہم برادان وطن کو دیکھیں تو ان کے یہاں مورتی پوجا کا تصور ہے۔ جو یقیناً شرک جلی ہے اس کے متعلق سخت ترین ممانعت وارد ہوئی ہے۔ اگر مولانا آزاد کی بات مان لی جائے تو ہندوؤں یا دیگر ادیان کے ماننے والوں کے یہاں جو طریقہ عبادت کا ہے وہ بھی درست ہے۔ یعنی وہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہے۔ اس بابت اہل علم وفکر کو غور کرنے کی ضرورت ہے؟ یہ بحث اس کتاب میں اس لیے اٹھائی گئی ہے تاکہ ہمارے اہل علم اس بحث کو آگے بڑھائیں اور کسی مثبت نتیجہ تک پہنچیں۔ البتہ اسی سے ملتی جلتی رائے علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی پیش کی ہے:

> ''شرعہ، منہاج اور منسک وہ جزئیات احکام اور متفقہ مقصود کے حصول کے جدا جدا راستے ہیں، جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً عبادت الٰہی ہر مذہب کا جز ولازم ہے لیکن طریقہ عبادت کے لیے کوئی خاص سمت ہر مذہب نے مقرر کی ہے۔ مگر وہ سمت خاص مصلحتوں کے لحاظ سے مختلف مقرر کی ہے۔ اس طرح اعمال قبیحہ کا انسداد تمام مذاہب کا متفقہ نصب العین ہے۔ مگر اس انسداد کے راستے اور طریقے جدا جدا ہیں۔ غرض یہ راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانہ میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہے۔ مگر اصل دین جو ازلی سچائی اور ابدی صداقت ہے نا قابل تبدیل تغیر رہا ہے۔ انبیاء کا دنیا میں وقتاً فوقتاً ظہور اس ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اس ازلی وابدی صداقت کو ہمیشہ اہل دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں اور دین کو اس کے اصل مرکز پر ہمیشہ قائم رکھیں اور ساتھ ہی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو قوم کے مناسب حال ہوں وہ اس کو بتائیں اور سکھائیں''۔[1]

[1] سیرۃ النبی، جلد۴، ص: ۷۶۰

راقم کی رائے اس سلسلہ میں یہ ہے کہ وحدت دین کا جونظریہ اسلام پیش کرتا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر مذہب خواہ اس کا اعتقاد و یقین کسی پر ہو، اس کا طریقہ عبادت کچھ بھی ہو، وہ برحق اور اخروی نجات کے لیے کافی ہے، بلکہ وحدت دین کا اسلام نے جو جامع تصور پیش کیا ہے وہ یہ کہ اسلام نے اس بات کی تکمیل فرمائی جو حضرت آدمؑ سے شروع ہوئی تھی یعنی توحید، آخرت، رسالت جیسی جامع چیزوں اور عقائد کی تائید و حمایت کر کے انسانون کو اس ایمان و یقین کی تبلیغ و تلقین فرمائی۔ یہ بات درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو مختلف عہد میں مختلف انبیاء و رسل کے ذریعہ لوگوں تک پہنچایا ہے۔

شرائع میں قبلنا کا حکم:

تقابل ادیان اور مکالمہ بن المذاہب کا ایک گوشہ یہ ہے کہ سابقہ شریعتوں سے اب استدلال کی گنجائش ہے یا نہیں؟ چنانچہ علماء نے اس مسئلہ پر بڑی تفصیل سے کلام کیا ہے جو قابل مطالعہ ہے۔ البتہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ شرائع من قبلنا کے متعلق دونوں آراء پائی جاتی ہیں۔ ہمارے بعض اکابر اس بات کے قائل ہیں کہ شرائع من قبلنا کا حکم باقی ہے اور بعض اسلاف اس بات کا انکار کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں شریعت محمدی ﷺ کے آنے کے بعد سابقہ تمام شریعتیں منسوخ ہیں۔ تاہم تاریخ و سیر اور ماخذ میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ سابقہ شریعتوں کے متعلق کئی مرتبہ حکم نافذ کیا گیا ہے۔ خواہ سابقہ شریعتوں کا حکم باقی ہو یا نہ ہو۔ اصل مدعا اس سے ضرور حاصل ہوتا ہے اور وہ ہے کہ مطالعۂ ادیان یعنی ممکن ہے کہ مسلمانوں نے اس وجہ سے بھی مطالعۂ ادیان کی طرف توجہ مبذول کی ہو کہ سابقہ شریعتوں اور ان کے احکام و مسائل کا ذکر شریعت محمدی میں ملتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ تمام آسمانی شرائع کی حقانیت، تمام آسمانی شرائع کا منزل من اللہ ہونا، اسی طرح اپنے اپنے زمانے میں قابل عمل اور واجب الاتباع ہونا، مسلمات دینیہ اور حقائق شرعیہ میں سے ہے۔ ایک مسلمان کے لیے اس بات کا ماننا صرف ایک تاریخی اور عملی حقیقت کے اعتراف کے طور پر نہیں ہے بلکہ اس کے ایمان کے معتبر ہونے کے لیے بنیادی شرط ہے اس وجہ

سے امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاوی (۳۲۱ھ م) نے اپنی معروف کتاب 'عقیدۃ الطحاویہ' میں لکھا ہے:

انومن بالله و الملائكة والنبيين و الكتب المنزلة على المرسلين و نشهد انهم كانوا على الحق المبين۔[1]

''ہم فرشتوں، انبیاء کرام اور رسل عظام پر اتاری گئیں کتابوں پر ایمان لاتے ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ سب واضح حق پر تھے۔''

بات دراصل یہ ہے کہ شرائع من قبلنا کے متعلق ہمیں چار اقوال ملتے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ شرائع من قبلنا کے تمام احکام کی اتباع ہمارے اوپر واجب ہے جب تک ناسخ نہ آئے۔

۲۔ شرائع من قبلنا کے کسی بھی حکم کی اتباع ہمارے اوپر واجب نہیں یہ کہ عمل کرنے کا حکم دلیل سے ثابت ہو جائے۔

۳۔ شرائع من قبلنا کے ان احکام کی پیروی ہمارے اوپر لازم ہے لیکن اس حیثیت سے کہ ہماری شریعت بن گئی۔

۴۔ شرائع من قبلنا کے ان احکام کی پیروی ہمارے اوپر لازم ہے جن کو قرآن مجید یا احادیث نبویہ میں انکار یا تردید کے بغیر نقل کیا جائے۔

اس بابت علماء میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے لیکن احناف کا مسلک یہ ہے کہ شریعت محمدیہ اصل ہے دیگر شرائع اس کے تابع ہیں۔ ہمارے اوپر شرائع کی پیروی اس حیثیت سے لازم ہے کہ وہ ہمارے نبی کی شریعت ہے۔ الا یہ کہ ان شرائع کا نسخ صراحتاً ثابت ہو، اس کے علاوہ ذخیرۂ احادیث میں ایسی بہت سی روایات ملتی ہیں جو اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ شرائع من قبلنا سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ امام بخاری (۸۱۰ء-۸۷۰ء) اپنی معروف کتاب ''الصحیح البخاری'' میں ایک حدیث لائے ہیں:

'' عن ابی هريرة رضی الله عنه عن رسول ﷺ انه ذكر

[1] طحاوی، امام ابوجعفر احمد بن محمد، العقیدۃ الطحاویہ، مکتبہ البشری کراچی، ص:۱۳

رجلا من بنی اسرائیل، اخذ خشبه فنقرها فادخل فیها الف دینار و صحیفة منه الیٰ صاحبه و قال عمر بن ابی سلمه عن ابیه سمع ابا هریرة قال النبی ﷺ، بخدخشبة فجعل المال فی جوفها و کتب الیه صحیفة من فلان الی فلان''۔[1]

اس حدیث کے ذیل میں شارحین حدیث نے لکھا ہے:

''شرائع من قبلنا سے استدلال کیا جا سکتا ہے جب اس کو علی سبیل الانکار ذکر نہ کیا جائے، بالخصوص جب اس فعل کے کرنے والے کی مدح کے طور پر ذکر کیا جائے''۔[2]

شرائع من قبلنا کے درج ذیل امور فقہاء اور اصولیین کے نزدیک متفق ہیں:

۱۔ اگر شریعت محمد ﷺ کا کوئی حکم شرائع سابقہ کے کسی حکم کے لیے ناسخ بن کر آئے تو بالاتفاق شرائع سابقہ کا حکم منسوخ ہوگا۔

۲۔ اگر شریعت محمد ﷺ میں نصوص یا حکم شرائع سابقہ کے کسی حکم کی تائید ہے تو شرائع سابقہ کا وہ حکم برقرار رہے گا، تاہم شریعت محمد ﷺ کی حیثیت سے نہ شرائع من قبلنا کی حیثیت سے۔

۳۔ اس وقت موجود کتاب مقدس میں مذکور کسی حکم کو اگر کتاب اللہ اور سنت رسول میں ذکر نہ کیا گیا ہو، تو وہ شریعت محمد یہ کا حکم نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ قرآن مجید کے مطابق ان کی کتابوں میں تحریف ہو چکی ہے۔

کتب احادیث اور مطالعۂ ادیان:

مطالعۂ ادیان کی تحریک کا ایک ابتدائی اور اہم سبب کتب احادیث ہیں۔ چنانچہ اس

---

[1] الصحیح البخاری، کتاب الاستئذان، کتاب بمن یبدأ فی الکتاب

[2] قسطلانی، احمد بن محمد بن ابی بکر، ارشاد الساری صحیح البخاری، المکتبۃ الوقفیۃ، ۱۹۹۶، جلد ۹، ص: ۱۹۲

حوالے سے جب ہم امام بخاری (۸۱۰۔۸۷۰) کی 'الصحیح البخاری' کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک کتاب ''کتاب الانبیاء'' کے عنوان سے بیان کی ہے۔ اس کے تحت جن احادیث کا ذکر کیا ہے یا جن انبیاء کے واقعات کو پیش کیا گیا ہے ان کا تعلق تقابل ادیان سے ہے۔ اسی طرح انہوں نے اپنی کتاب میں دیگر مقامات پر بہت ساری سابقہ اقوام، ان کی تہذیب، معاشرت، طریقہ عبادت وغیرہ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مثلاً امام بخاری نے کتاب العلم کے تحت حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضر کے متعلق ایک باب قائم کیا ہے۔ اس طرح کتاب الجنائز میں ایک باب ''یہودی کا جنازہ دیکھ کر کھڑا ہونا'' باندھا ہے۔ گویا یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ذخیرہ احادیث میں اچھا خاصا مواد مطالعۂ ادیان کے حوالے سے ملتا ہے۔ امام مسلم (۸۲۱۔۸۷۵) نے اپنی کتاب 'الصحیح المسلم' میں تقابل ادیان کی بابت کافی تفصیل بہم پہنچائی ہیں۔

کتب احادیث میں بخاری کے بعد مسلم کا درجہ بتایا جاتا ہے، اس طرح یہ بات مزید صاف ہوجاتی ہے کہ محدثین عظام کے یہاں کافی ذخیرہ ہے جو انہوں نے تقابل ادیان کے عنوان سے تو جمع نہیں کیا اگر غور سے دیکھا جائے تو اس طرح کی احادیث سے مطالعۂ ادیان کی تحریک بخوبی ملتی ہے۔

امام ترمذی (۸۲۴۔۸۹۲) نے اپنی سنن ترمذی، امام ابوداؤد (۸۱۷۔۸۸۹) نے اپنی سنن ابوداؤد میں، امام نسائی (۸۲۹۔۹۱۵) نے سنن نسائی میں، ابن ماجہ (۸۲۴۔۸۸۷) نے سنن ابن ماجہ میں اور امام احمد (۷۸۰۔۸۵۵) نے اپنی مسند میں، امام مالک (۷۱۱۔۷۹۵) نے اپنی مؤطا، عبدالرزاق (۷۴۴۔۸۲۶) نے اپنی مصنف میں اور دیگر کتب احادیث میں مطالعۂ ادیان پر کافی مواد ملتا ہے۔ محدثین نے خصوصاً انبیاء کرام کے واقعات، سابقہ اقوام کی سرگزشت اور دیگر اہم مباحث بیان کیے ہیں، جو تقابل ادیان کے طالب علموں کے لیے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

کتب تفاسیر اور مطالعۂ ادیان:

مطالعۂ ادیان پر کام کرنے کی مسلمانوں میں اس وجہ سے بھی تحریک پیدا ہوئی کہ قرآن کے اولین مفسرین نے یہود و نصاریٰ، صابئین وغیرہ کے احوال، ان کی معاشرت، تہذیب، بود و باش، مذہب و دھرم، رسم و رواج، عقائد و فلسفہ اور طریقہ عبادت کو بڑی تفصیل سے بیان کیا۔ مثلاً جب ہم امام محمد بن احمد بن ابوبکر بن فرح ابوعبداللہ انصاری (۱۲۱۴۔۱۲۷۳) کی الجامع الاحکام القرآن، ابوبکر احمد بن علی رازی (۹۱۷۔۹۸۱) کی احکام القرآن، قاضی محمد بن عبداللہ ابوبکر بن محمد المعافری (م۵۴۳ھ) کی احکام القرآن لابن العربی، ابوالحسن علی بن حبیب البصری (۹۷۲۔۱۰۵۸) کی النکت والعیون، ابوجعفر محمد بن جریر طبری (۸۳۹۔۹۲۳) کی جامع البیان عن تاویل آی القرآن، ابوالفداء عماد الدین اسماعیل (۱۳۰۱۔۱۳۷۳) کی تفسیر القرآن العظیم، ابوالقاسم جاراللہ محمد عمر الزمخشری (۱۰۷۵۔۱۱۴۴) کی الکشاف عن حقائق التنزیل، ناصر الدین ابوسعید عبداللہ بن عمر بن محمد بیضاوی (م ۱۲۸۶) کی انوار التنزیل اسرار التاویل، شہاب الدین محمد البغدادی (۱۸۰۲۔۱۸۵۴) کی روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، قاضی ثناءاللہ (۱۷۳۰۔۱۸۱۰) کی التفسیر المظہری اور اردو تفاسیر میں سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳۔۱۹۷۹) کی تفہیم القرآن، امین احسن اصلاحی (۱۹۰۴۔۱۹۹۷) کی تدبر قرآن، مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۲۔۱۹۷۷) کی تفسیر ماجدی وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے سابقہ شریعتوں کی پوری تفصیل قلم بند کی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بتانا ہے کہ سابقہ شریعتوں میں تحریف و تبدیلی کس طرح واقع ہوئی۔ اور ان کی شریعتوں کی اب کیا اہمیت و افادیت ہے۔ مولانا مودودی امین احسن اور مولانا عبدالماجد دریادی وغیرہ نے تو اپنی تفسیر میں یہودیت عیسائیت، صابئین اور ہندوؤں کے متعلق بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ بنابریں ان تمام اشارات و نکات نے ابتدا ہی سے مسلم مفکرین و اصحاب علم کو اس بات پر آمادہ کیا کہ مطالعۂ ادیان پر کام کیا جائے اور اس کا تحقیقی معروضی و تقابلی مطالعہ کر کے معاشرہ میں افہام و تفہیم کی طرح ڈالی۔

کتب تواریخ اور مطالعۂ ادیان:

تاریخ ایک اہم اور دلچسپ موضوع ہے۔ ہر قوم اور معاشرہ کی اپنی تاریخ اور اس کے خدوخال ہیں۔قوم یا معاشرہ اپنی تاریخ وتہذیب کو بھلا ڈالے اس کی دنیا میں کوئی وقعت نہی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے مسلم مورخین نے عربی، فارسی، اردو میں مسلمانوں کی تاریخ کو بڑا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ان میں چند معروف اور اہم کتب تواریخ درج ذیل ہیں۔ابوعبداللہ بن سعد منیع الزبری (۷۸۴۔۸۵۴) الطبقات الکبری، عبدالملک بن ہشام الحمیری (م ۸۲۸) کی سیرۃ النبی، عزالدین ابوالحسن علی بن محمد عبدالکریم الجزری (۱۱۶۰۔۱۲۳۳) کی الکامل فی التاریخ، ابوالفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر (۱۳۰۱۔۱۳۷۳) کی البدایہ والنہایہ، ابوجعفر محمد بن جریر طبری (۸۳۹ء-۹۲۳ء) کی، تاریخ الرسل والملوک وغیرہ وغیرہ۔

خاص بات یہ ہے کہ درج بالا کتابیں اگرچہ علم تاریخ وغیرہ پر مشتمل ہیں۔لیکن ان کتابوں کا جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں مطالعۂ ادیان اور تقابل ادیان کے متعلق بھی مباحث کو جمع کیا ہے۔اس لیے تاریخ میں جہاں مورخین نے مسلمانوں کی تاریخ کو قلم بند کیا ہے وہیں سابقہ امتوں کی تاریخ ان کے واقعات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس حوالہ سے مسلمانوں کے یہاں کتب تواریخ میں بھی مطالعۂ ادیان پر کافی مواد ملتا ہے۔

اس تناظر میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں نے دیگر ادیان کا مطالعہ ہر دور اور ہر زمانہ میں نہایت ایمان دارانہ کیا ہے۔اگر آج کوئی مسلمانوں پر اعتراض کرتا ہے کہ ان کے یہاں تنگ نظری پائی جاتی ہے وہ اپنے خول میں رہتے ہیں۔صرف اپنے دین و دھرم کا مطالعہ کرتے ہیں۔تو یہ بات کسی بھی اعتبار سے درست نہیں ہے۔گزشتہ سطور میں راقم نے جو شواہد اور اشارات پیش کیے ہیں اس بات پر بخوبی استدلال کرتے ہیں کہ مطالعۂ ادیان کو مسلمانوں نے اپنی بحث وتحقیق کا موضوع شروع سے ہی بنایا ہے۔صرف ضمنی بحثیں نہیں کی ہیں بلکہ باقاعدہ علماء اسلام نے کتابیں تحریر کی ہیں۔

مطالعۂ ادیان کی سماجی ضرورت:

سماج کوئی بھی ہو، کسی بھی نظریہ، فکر اور دھرم سے وابستہ ہو، وہی معاشرہ صحیح معنوں میں ہر میدان اور موڑ پر کامیاب و کامران ہوتا ہے جن کے یہاں رواداری، توسع، اعتدال اور فکری بالیدگی پائی جاتی ہو۔ اس تناظر میں اگر ہم عالمی منظرنامے پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس وقت دنیا میں ہر طرح کی فکر اور خیال کا حامل طبقہ موجود ہے، لیکن تمام احوال کو جاننے کے بعد یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ آج کسی بھی معاشرہ کی جو بنیادی ضرورت ہے وہ امن ہے، سکون و اطمینان اور امن و سلامتی ہے اور یہ اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جب کہ ہم ایک دوسرے کی تہذیب، تاریخ، عقائد، افکار و نظریات اور دین و دھرم کے ساتھ ساتھ اس کے رسوم و رواج کا پورا خیال رکھیں گے۔ اگر چہ دوسرے طبقہ کی باتیں اس کے دھرم و مذہب کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ جب ہمارے معاشرہ میں اس کا باہمی امتزاج پروان چڑھنے لگے گا تو یقین جانیے کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ اس لیے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم مطالعۂ ادیان کو اپنے معاشرہ میں رواج دیں۔ مزید یہ کہ علماء کو چاہیے کہ وہ اپنے دھرم کے ساتھ ساتھ دیگر ادیان کے مطالعہ کو بھی آج کی ضرورت سمجھیں۔ اس کے معاشرہ پر مفید اثرات مرتب ہوں گے۔ ان میں ایک اہم فائدہ یہ بھی ہوگا کہ عام طور پر معاشرے میں کچھ ناعاقبت اندیش لوگ دوسرے دین و دھرم سے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں۔ جب معاشرہ میں مطالعۂ ادیان پر کام ہوگا تو باہم طبقوں اور معاشروں کے مابین دین و دھرم کے نام پر جو غلط فہمیاں رائج ہو چکی ہیں ان کو نابود کرنا آسان ہو جائے گا۔ مطالعۂ ادیان کے فوائد پر گفتگو شیخ احمد دیدات (۱۹۱۸۔ ۲۰۰۵) نے اپنی کتاب ''تقابل الادیان السماویہ'' میں کی ہے، واضح رہے کہ شیخ احمد دیدات تقابل ادیان کے ماہرین میں شمار کیے جاتے ہیں ان کی اس موضوع پر کئی اہم کتب موجود ہیں۔ انہوں نے مطالعۂ ادیان کی سماجی اور معاشرتی ضرورت کو اجاگر کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''مطالعۂ تقابل ادیان سے ہمارے مطالعہ میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں، جن سے رواداری، تحمل اور مخالف نقطہ کو برداشت

کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، نیز پتہ چلتا ہے کہ مختلف مذاہب میں بعض مشترک تعلیمات پائی جاتی ہیں جو ازلی اور ابدی انسانی اقدار ہیں اور فی الحقیقت یہی صداقتیں اور اقدار پائدار ہیں جو ہر زمانے اور ہر مذہب میں موجود رہی ہیں۔ اسی طرح تقابل ادیان کے مطالعہ سے تمام مذاہب کی خوبیوں سے آشنا ہوتے ہیں اور عملاً انہیں اپنا سکتے ہیں جس سے بلند کرداری، فکری بالیدگی اور روحانی سکون حاصل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں مطالعۂ مذاہب سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ عموماً عالی ہمت راست گو مستقل مزاج اور نسل انسانی کا بہترین گروہ تھا جو ہم سب کے لیے قابل فخر طبقہ ہے۔ اس کے برعکس ان کے مخالفین، کینہ پرور، خودغرض، دنیا پرست، کم ہمت، بے صبر اور گھٹیا کردار کے حامل تھے۔ لہذا ہمیں رزائل اخلاق سے پرہیز اور فضائل اخلاق کو اپنانا چاہیے۔

مطالعۂ تقابل ادیان سے ہمیں حق و باطل کے مابین اس کشمکش کا پتہ چلتا ہے جو ازل سے خیر و شر اور انسان و شیطان میں برپا ہے۔ مطالعۂ ادیان ہمیں بتاتا ہے کہ ہر قوم اور ہر ملک میں ہادیان برحق آتے رہے جو نوع انسانی کو خالق حقیقی کی عبادت کی طرف دعوت دیتے رہے لیکن انسانوں کی اکثریت ہمیشہ بے شمار باطل معبودوں اور فطری مناظر کے سامنے سجدہ ریز رہی ہے۔ اسی طرح ہمیں پتہ چلتا ہے کہ زندگی حق و باطل کی رزم گاہ ہے اور اس میں حق پرستوں کے لیے مخالفت ابتلاء و آزمائش لازمی ہے۔ نیز انسانوں کی اکثریت ہمیشہ حق پر نہیں ہوتی۔

مذاہب کی تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں نہ صرف اس زمانہ یا علاقے کے لوگوں کی ثقافتی اور تمدنی حیثیت کے تعین میں مدد ملتی ہے بلکہ فی الحقیقت اس عہد کے انسان کی ذہنی، علمی، اور فکری صلاحیتوں کا اندازہ لگانا مذہبی عقائد کی روشنی میں نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں مذہبی عقائد کا تمدن اور

تہذیب کے ساتھ تعلق بھی گہرا ہوتا ہے۔ پھر مختلف مذاہب کی عبادت گاہیں مختلف تہذیبوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

تقابل ادیان سے نہ صرف ہماری دینی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ علم واستدلال کی نئی راہ کھلتی ہے۔ ہر مذہب کا اپنا فلسفہ اور علم الکلام ہوتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے درست اور نادرست خوب اور خوب تر کا فرق واضح ہوتا ہے۔ ہم مسلمان ہیں، ہمارا دین بفضل تعالیٰ عقل وخرد کا دین ہے۔ جو عقلی معیار پر پورا اترتا ہے۔ اس طرح تقابل ادیان سے غیر شعوری ایمان کو شعوری اور عقائد کو مستحکم بنانے میں مدد ملتی ہے۔ نیز قوت استدلال میں اضافہ ہوتا ہے اور تنقیدی نظر کو جلا ملتی ہے۔ نیز تعصب وتنگ نظری کا خاتمہ ہوتا ہے۔

مذاہب عالم کے مطالعہ میں ہادیان مذاہب کے کارناموں کا ذکر پڑھتے ہیں، جو انہوں نے فلاح فرد اور فلاح انسانیت کے لیے انجام دینے اور معلمانہ انداز، روحانی، اخلاقی، سیاسی اور اجتماعی انقلاب برپا کرنے میں سخت مصائب اٹھائے۔ اس کے ساتھ ہی ہم گزشتہ اقوام کا کردار اور ان کے عروج و زوال کی داستانیں پڑھتے ہیں جن کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جن اقوام نے نیکی اور بھلائی کی راہ اختیار کی انہوں نے فلاح وسعادت پائی اور جو قومیں ظلم وعدوان، بغاوت اور سرکشی کرتے ہوئے شیطان کی راہ پر چلیں وہ اپنی مادی قوت اور اقتصادی خوشحالی کے باوجود تباہی اور ہلاکت سے دوچار ہوئیں۔

تقابل ادیان کے مطالعہ سے مختلف اقوام میں پھیلی ہوئی حکایات، روایات اور مذہبی کتب میں مذکور مواد میں جو غلط اجزاء شامل تھے ان میں صحیح و غلط کے امتیاز کا فرق واضح ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پیروان مذاہب اپنی خوش عقیدگی اور لاعلمی سے شعوری طور پر اپنے مذاہب میں ترمیم اور اضافے کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح مختلف مذاہب میں حقیقی اور افسانوی

معلومات میں تمیز کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ الغرض مطالعۂ ادیان متعدد فوائد کا حامل ہے''۔[1]

اقتباس اگرچہ طویل ہوگیا ہے لیکن اس سے جن حقائق کا انکشاف ہوتا ہے وہ باتیں بڑی اہم ہیں یہ سوال عام طور پر اٹھتا رہا ہے کہ مطالعۂ ادیان کیوں ضروری ہے اس کے کیا فوائد و ثمرات ہیں متذکرہ سطور میں اس پر شیخ احمد دیدات نے بڑی سنجیدہ اور علمی گفتگو کی ہے۔

مطالعۂ ادیان سے جہاں سماج میں ہم آہنگی اور توازن و اعتدال قائم ہوتا ہے۔ وہیں اس سے علمی فکری اور تحقیقی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں، بنابریں مطالعۂ ادیان ایک ایسا مثبت مرکز ہے جس میں ادیان و مذاہب اور اقوام وملل میں جاری پرخاش اور تصادم وٹکراؤ ختم ہوجاتا ہے اگر ہم اس موضوع کی اہمیت وافادیت اور اس کے عصری تقاضے ہندوستانی تکثیری سماج میں سمجھنے کی کوشش کریں تو اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

اس لیے وطن وطن عزیز میں جب ہمارے مدارس دینیہ، مسلم اسکالرس اور ہندو یا دیگر مذاہب کے ماہرین ومحققین تقابل ادیان پر کام کریں گے، تو یقیناً ہندوستانی معاشرہ سے بہت ساری غلط فہمیاں زائل ہوں گی۔ امن وامان اور اخوت و رواداری کا پیغام جائے گا۔ آج جن معاشروں میں کسی دوسرے مذہب کے تئیں شدت۔ نفرت یا پھر کسی بھی طرح کی بدنیتی پائی جاتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ شخص دوسرے دھرم کی تعلیم کو جانتا نہیں یا اس نے دوسرے دین و دھرم کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ تکثیری سماج کو پرامن روایات میں باندھنے کے لیے ضرروی ہے کہ اب مطالعۂ ادیان پر ازسرنو کام ہو۔ دنیا کا ہر معاشرہ امن اور سکون کا متلاشی ہے اور مطالعۂ ادیان کا مقصد بھی یہی ہے کہ معاشرہ میں امن اور رواداری قائم ہو۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محبوب علی شاہ نے اپنے ایک ''مقالہ'' میں لکھا ہے:

> ''مکالمہ بین المذاہب کا مقصد سماج میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہو۔ مقامی اور عالمی سطح پر سیاسی برتری پیدا کرنا نہ ہو۔ اس کا مقصد انسانی حقوق کا دفاع اور امن عالم کا قیام ہو۔ مکالمہ بین المذاہب کے ذریعہ کسی بھی مذہب کو کسی دوسرے

[1] شیخ احمد دیدات، تقابل الادیان السماویۃ (مترجم مصباح اکرم)، آر آر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص: ۳۰-۳۲

مذہب پر غالب کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے اور کسی بھی مذہب، برادری اور قوم کے لوگوں کے ساتھ امتیازی سلوک نہ کیا جائے، عالمی سطح پر دیکھا جائے تو مغربی اقوام کا ایجنڈا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سیاسی برتری حاصل کی جائے۔ کمزور عوام کو مزید دباؤ میں نہ لایا جائے''۔[1]

مطالعۂ ادیان اور مکالمہ بین المذاہب کی ضرورت کی طرف مذکورہ مقالہ نگار نے علی نذیر مائکل کی کتاب Mission and Dialogue London Socity for Promoting Ehristian Knowledge کے حوالے سے لکھا ہے:

''دنیا میں اس وقت تک امن و امان کا قیام ممکن نہیں جب تک مذاہب کے درمیان امن قائم نہیں ہوگا۔ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حوصلۂ مذہبی شعار کا احترام اور عبادت گاہوں کا احترام نہیں ہوگا۔ جب خالق کائنات نے لوگوں کو مختلف رنگ و نسل، سوچ اور عقائد دیئے تو یہاں اختلاف کیوں ہو رہے ہیں، ان تمام باتوں سے بالائے طاق ہو کر دنیا میں پر امن فضا پیدا کرنا مکالمہ کا اولین مقصد ہے''۔[2]

گویا یہ بات کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مطالعۂ تقابل ادیان یا مکالمہ بین المذاہب کا مقصد و منشا یہ ہے کہ سماج میں تمام طرح کی نفرتیں ختم ہو جائیں اور معاشرہ اتحاد و یگانت کی لڑی میں سما جائے۔ مطالعۂ ادیان کے ذریعہ تکثیری معاشروں میں اجتماعی عدل کا قیام ممکن ہے۔ دیگر مذاہب اور مکتب ہائے فکر کے لوگوں کے بارے میں صحیح فہم اور اظہار پسندیدگی اس وقت ترویج پا سکتی ہے جب ان کے عقیدے اور فلسفہ کے بارے میں صحیح علم اور آگاہی ہو۔ مطالعۂ ادیان سے دوسروں کی عزت کرنا اور ان کے دین و دھرم کی تمام باتوں کا حترام کرنا بھی اس کا حصہ

---

[1] مجلّہ التبین، موضوع، مکالمہ بین المذاہب، شرائط، مقاصد، اقسام، اور رکاوٹیں، مضمون نگار، ڈاکٹر محبوب علی شاہ، ڈاکٹر محمد شاہد حبیب، پاکستان، ۲۰۱۹، جلد ۳، شمارہ ۲، ص: ۱۴۱،

[2] ایضاً، ص: ۱۴۲

ہے۔ نیز دوسروں کی ثقافت وتاریخ اور دیگر عوامل کے بارے میں علم ہونا ضروری ہے۔ تبھی جا کر معاشرہ میں سچی ہم آہنگی پیدا ہوسکتی ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے ہندوستانی معاشرے میں ایک دوسرے کے دین و دھرم اور عقائد وافکار کو لے کر گزشتہ کچھ برسوں سے نفرت وشدت پڑھنے لگی ہے۔ اس کو فوری طور پر روکنے کی ضرورت ہے اور تحمل وبرداشت سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

باب دوم

ہندوستان کی مسلم حکومتوں میں ہندو دھرم کا احیاء اور تحفظ

ہندوستان تکثیری سماج اور ادیان و مذاہب کی شاندار کہکشاں کے طور پر جانا جاتا رہا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ہندوستان کے دامن میں شروع سے لے کر آج تک سیکڑوں تہذیبیں، زبانیں، افکار ونظریات، مذاہب اور ادیان نے نشو ونما پائی ہے۔ ہندوستان کو جہاں ہمیشہ ادیان و مذاہب کے مرکز کے طور پر جانا گیا ہے۔ وہیں وطن عزیز کو علم وفضل اور فہم و فراست کے لیے بھی جانا جاتا ہے۔ ہندوستان میں کئی خاندانوں اور مختلف مذاہب کے حاملین کی حکومتیں رہی ہیں۔ جس کی تفصیل کے لیے تاریخ ہند پر لکھی گئی کتابوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ البتہ برصغیر پاک و ہند میں مسلم حکمرانوں کا آغاز محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے ہوا ہے۔ اور اس کا اختتام ۱۸۵۷ء شاہ جہاں کے زمانے میں ہوا۔ اس دور میں مسلم حکومت کے زمانے میں ہندو ازم کے حوالے سے جو خدمات مسلمانوں نے انجام دی ہیں، سطور ذیل میں ان کا جائزہ لیا جائے گا۔

ہندوستان کی مسلم حکومتوں میں بین المذاہب مکالمہ:

جب ہندوستان مسلمانوں کے زیر قیادت ہوا تو اس وقت یہاں کئی مذاہب کے لوگ آباد تھے۔ انھیں مسلمان حکمرانوں نے ہر طرح کی آزادی سے نوازا، وہ اپنے مذہب اور دین کی تعلیمات کے مطابق عمل کیا کرتے تھے، اور یہ عمل وہ بلا روک ٹوک انجام دیتے تھے، اسی پر بس نہیں بلکہ مسلم حکمرانوں کے عہد میں بین مذہبی مذاکرات بھی منعقد ہوتے تھے۔ چنانچہ محمود غزنوی (۹۷۱-۱۰۲۹) نے اپنی مدت حکومت (۹۹۹-۱۰۳۰) کے دوران کئی بین مذہبی مکالموں کی صدارت کی تھی۔ اس بابت مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن (۱۹۱۱-۱۹۸۷) نے اپنی کتاب 'ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک' میں لکھا ہے کہ محمود غزنوی کے دور میں بین مذہبی مذاکرات ہوا کرتے تھے، اور محمود غزنوی ان کی سرپرستی فرماتے، لیکن یہ نہیں لکھا کہ یہ مذاکرات و مکالمات کن کن مذاہب وادیان کے حاملین کے درمیان واقع ہوئے تھے۔

''مذہبی مجلسوں کا ذکر ملتا ہے جن میں مناظرے ہوا کرتے تھے۔ محمود ان کی

صدارت کیا کرتا تھا اور اس کی موجودگی سے مناظرانہ مباحث میں اعتدال رہتا تھا، اس لیے انھوں نے مذہبی تعصب میں کوئی غیر انسانی اور ظالمانہ حرکت نہیں کی''۔[1]

جلال الدین محمد اکبر کے دور میں مکالمہ:

یہ بات معروف ہے کہ اکبر نے دین الٰہی کے نام سے ایک نیا دین قائم کیا تھا۔ دراصل اس حوالے سے علماء کی آراء مختلف ہیں۔ منتخب التواریخ کے مصنف ملا عبدالقادر بدایونی (۱۵۴۰-۱۶۱۵) نے ثابت کیا ہے کہ جلال الدین محمد اکبر (۱۵۴۲-۱۶۰۵) نے واقعی ایک نیا دین ''دین الٰہی'' کے نام سے ایجاد کیا تھا۔ وہیں اکبری عہد کے ایک بڑا فاضل اور انشاء پرداز ''آئین اکبری'' اور ''سواطع الالھام'' جیسی کتابوں کے مصنف ابو الفضل فیضی (۱۵۴۷-۱۵۹۰) نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''آئین اکبری'' میں بدایونی کے افکار کا رد کیا ہے ان تمام مباحث کے لیے ملاحظہ ہو تو سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی کتاب 'ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری' جلد اول دیکھیے۔ دراصل بات یہ ہے کہ اکبر بادشاہ مغلیہ سلطنت کا تیسرا فرماں روا تھا۔ مذہبی اور دینی معاملے میں بڑا روادار تھا اس کی وسیع المشربی کی مثالیں کتب تواریخ میں جابجا ملتی ہیں۔ اسی مقصد کے تحت اس نے دسویں صدی ہجری کے آخر میں فتح پور سیکری میں شیخ سلیم چشتی کے مزار کے پاس Interfaith Understanding کے لیے ایک عمارت تعمیر کروائی تھی۔ اس کی بابت مولانا سید عبدالحی حسنی (۱۸۴۹ء-۱۹۲۳ء) نے اپنی کتاب 'الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند' میں لکھا ہے:

''دسویں صدی ہجری کے آخر میں بادشاہ اکبر بن ہمایوں ہندوستان کا بادشاہ تھا، اس نے فتح پور سیکری میں عبادت خانے کے نام سے ایک عالیشان عمارت بنوائی وہ متعین اوقات اس عمارت میں آ کر بیٹھتا تھا اور یہودی وعیسائی، مجوس، ہندو وشیعہ اور اہل سنت والجماعت کے علماء اس کی مجلس میں بیٹھے تھے اور یہ

[1] سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء، ص ۵۴-۵۵

سب لوگ مسائل دینیہ پر گفتگو کرتے تھے، خاص طور سے ابوالفضل بن المبارک ناگوری (م ۱۵۹۰) ابوالفتح گیلانی (م ۱۵۸۹) شیخ محمد یزدی راجہ بیربل (م ۱۵۸۶) ان مذاہب کے علماء سے گفتگو کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ گفتگو اور مباحثے مسائل فرعیہ سے ہٹ کر عقائد واصول کے بارے میں ہونے لگے''۔[1]

اکبر کے دور میں ایک مکالمہ منعقد ہوا اس کی تفصیل پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی نے اپنی کتاب 'مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت' میں قلم بند کی ہے:

''اکبر کے عہد میں ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر یورپ کے پرتگیز قبضہ جما چکے تھے اور گوا کو انھوں نے اپنا تجارتی اور تبلیغی عیسائیت کا مرکز بنا لیا تھا۔ مغل حکمرانوں کی اپنی پالیسی نہ تھی، نہ بحری فوج تھی اور نہ بحری ساز وسامان، اس لیے بیشتر ساحلی علاقوں پر پرتگیز ہی قابض تھے۔ گوا سے کیرالہ تک وہ عیسائیت کی تبلیغ کرتے، مسلمانوں پر ظلم وزیادتی کرتے، لوگوں کو عیسائی بناتے اور مسجدوں کو مسمار کرتے۔ اکبر نے ۱۵۷۹ء میں گوا کے حاکم کو خط لکھا کہ دو عیسائی پادری اکبر کے دربار میں بھیجے جائیں اور قانون کی کتابیں بالخصوص انجیل کی کتابیں ارسال کی جائیں تاکہ وہ ان سے استفادہ کر سکے۔

اکبر نے ۱۵۸۰ء میں گوا سے عیسائی پادریوں کو پھر بلایا جس نے آگرے میں چرچ اور عیسائی مشن کی بنیاد ڈالی۔ ۱۵۹۱ء میں پادری ایڈورڈ اور پادری کرسٹوفر اکبر کے دربار میں لاہور پہنچے۔ اکبر نے ان کے رہنے کا انتظام کیا۔ اکبر نے اپنے وزیر ابوالفضل کو حکم دیا کہ وہ بائبل کا ترجمہ کریں، چنانچہ ۱۵۸۷ء میں انھوں نے پادریوں کی مدد سے بائبل کا فارسی ترجمہ کیا۔

اسی عہد میں میں جروم زیویر نے حضرت عیسی علیہ السلام کی سوانح اور تعلیمات پر مشتمل

---

[1] حسنی، سید عبدالحی، (مولانا) الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، مترجم مولانا ابوالعرفان ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۶، ص ۲۹۳)

کتاب 'سیرت مسیح' لکھی جو داستان مسیح کے نام سے بھی موسوم ہے۔[1]

اکبر بادشاہ کے عہد میں شمالی ہندوستان میں عیسائیوں کی آمد ہوئی اور مسلمانوں کے درمیان عیسائیت کی تبلیغ شروع ہوئی، عیسائی مبلغ صرف عیسائی مذہب کی تبلیغ پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ مسلم حکمرانوں کو اسلام سے بدظن کرتے اور مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کے لیے اسلامی تعلیمات کو تنقید کا نشانہ بناتے۔ اسلامی عقائد پر حملہ کرتے اور پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخیاں کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ اکبر کے دربار میں پادری جروم زیویر کی تقریر ہوئی۔ اس نے اسلامی شعار پر حملے کیے اور پیغمبر اسلام کی توہین کی۔ زیویر تقریر کے بعد ایک مسلمان امیر نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

> ''یہاں مسلمانوں کے سوا کوئی موجود نہیں اور تم شریعت اسلامی کی مذمت کرتے ہو تو وہ تمہارے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ اگر چہ میں تمہارا ولی اور دوست ہوں، مگر جب تم ہمارے نبی کی بے ادبی کرتے ہو تو میرا بھی جی چاہتا ہے کہ تمہارے جسم میں خنجر بھونک دوں''۔[2]

علاء الدین خلجی اور مکالمہ بین المذاہب:

علاء الدین خلجی (۱۲۶۶ء-۱۳۱۶ء) نے ۱۲۹۶ء سے ۱۳۱۶ء تک دہلی میں حکومت کی۔ ان کے دور میں بھی ہندو علماء اور فضلاء سے مباحثے ہوئے۔ اور ہندوؤں کے ساتھ رواداری کا معاملہ روا رکھا گیا۔ چنانچہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ہے:

> ''علاؤالدین خلجی ایک متعصب حکمران سمجھا جاتا ہے، لیکن اس نے ہندوؤں کی مذہبی پیشواؤں کی بڑی عزت اور توقیر کی، جینیوں کے مآخذ سے پتہ چلتا ہے کہ علاء الدین خلجی نے اچاریہ مہاسین کو کرناٹک سے اپنے دربار میں مدعو کیا، اس

---

[1] اس کتاب کا عبدالستار لاہوری کے تعاون سے فارسی ترجمہ ۱۶۰۲ء میں اورا کبر بادشاہ کے نام معنون کیا گیا۔ اس کتاب کے قلمی نسخے آصفیہ لائبریری حیدرآباد اور لاہور میوزیم وغیرہ میں موجود ہیں۔

[2] قاسمی، محمد سعود عالم، (پروفیسر) مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۹ء، ص ۵۶-۵۷

سے مذہبی مناظرے کیے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فرقہ دیگمبر کے پیشوا پورنا چندر جو دہلی میں رہتے تھے اور سوئمبر یوگی رام چندر سوری کی پذیرائی سلطان کے یہاں بہت تھی''۔[1]

اسی طرح تاریخ میں یہ بھی ملتا ہے کہ سلطان جینی فضلاء سے تعلق رکھتا تھا، ان میں سے ایک جیناپر بھاسوری نے اس سے آدھی رات تک مذہبی گفتگو کی۔ جس کے بعد سلطان نے اس کو ایک ہزار گائیں دوسرے تحفوں ساتھ دیں۔ سلطان نے اور دوسرے جینی فضلاء میں راجہ سیکھارا اور جیناپر بھاسوری کی بھی سرپرستی کی۔ سلطان ہندوؤں کے تہوار ہولی سے بھی دلچسپی لیتا رہا۔[2]

اسی کے ساتھ یہ بھی ملاحظہ کرتے چلیے کہ سلطان غیر معمولی ذہانت کا مالک تھا، اس کا علم بھی وسیع تھا، قرآن، حدیث، کلام اور فلسفہ وغیرہ سب پر اس کی نظر تھی۔ اس لیے اپنی مجلسوں میں کبھی خالق کائنات، کبھی واجب الوجود کی وحدت، کبھی نبوت کی صداقت پر بحث اٹھ کھڑی ہوئی تو اس میں فلسفیانہ اور متکلمانہ رنگ پیدا ہو جاتا، قدامت پسند مقلدوں کے حلقے میں یہ رنگ پسند نہیں کیا جاتا ہے۔[3] چنانچہ مذکورہ آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ علاؤالدین کے یہاں بھی مذہبی مباحثے ہوا کرتے تھے۔

عہد جہاں گیری میں مکالمہ:

مغلیہ سلطنت کا ایک اور فرماں روا جسے ہم نورالدین جہانگیر (۱۵۶۹-۱۶۲۷) کے نام سے جانتے ہیں ان کی مدت حکومت ۱۶۰۵ تا ۱۶۲۷ ہے۔ انھوں نے بھی اپنے والد اکبر کے طرز کو باقی رکھا اور صلح کل کے راستے پر عمل کیا، اس وجہ سے یہ پنڈتوں اور دیگر ادیان کے حاملین سے مذہبی مکالمہ بھی کیا کرتے تھے۔ سید صباح الدین نے 'تزک جہانگیری' کے حوالے سے لکھا ہے:

''ایک مرتبہ پنڈتوں سے جو ہندوؤں کے داتاں میں سے ہوتے ہیں، میں

---

[1] ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ج ا، ص ۹۷

[2] ایضاً، ص: ۹۹

[3] ایضاً، ص: ۱۰۰

نے پوچھا کہ اگر تمہارے دین کی منشا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات مقدس دس مختلف پیکروں میں حلول کرتی ہے تو ارباب عقل اس بات کو رد کر کے قبول نہیں کرتے، اس سے یہ فساد لازم آتا ہے کہ بات جب حق تعالیٰ میں جو تمام تعینات سے پاک ہے، طول، عرض اور عمق پایا جائے اور اگر مراد ان جسموں میں نور خداوندی کا ظہور ہے، تو خدا کا نور تو تمام موجودات میں جاری ہے۔ ان دس پیکروں میں کوئی خصوصیت نہیں۔ اگر اس سے مراد خدا کی صفات میں کسی صفت کا اثبات ہے تو اس صورت میں تخصیص کی کوئی وجہ نہیں، اس لیے ہر دین آئین میں صاحبان معجزات و کرامات ہوتے ہیں جو اپنے زمانے کے دوسرے لوگوں سے دانش و فراست میں ممتاز تھے۔ جب کچھ کہنے سننے اور بہت ردوبدل کے بعد وہ خدا کی خدائی کے قائل ہو گئے جو جسم اور چون چگون سے پاک ہے، تو یہ کہنے لگے کہ ہماری فکر ذات مجرد کی دریافت میں ناقص ہے۔ ہم صورت کے وسیلے کے بغیر اس کی معرفت حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہم نے دس اوتاروں کو اپنی دریافت اور معرفت کا ذریعہ بنالیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ اوتار معبود حقیقی تک رسائی کا ذریعہ نہیں ہو سکتے ہیں''۔[1]

انگریزوں کے عہد میں بین المذاہب مذاکرے:

ہندوستان پر انگریزوں کا جب اچھی طرح اقتدار ہو گیا اور اندرونی ہند میں امن و امان کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ۴۳ سال تک انگریزوں نے دین عیسوی کی دعوت اپنے پادریوں کے ذریعے عوام الناس تک پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے ساتھ تبلیغ و دعوت کا کام شروع کیا اور اس کو برابر بڑھاتے رہے یہاں تک کہ مذہب اسلام کی تردید و مخالفت میں کتابیں اور رسالے لکھ کر شہروں میں تقسیم کرنا شروع کیا۔ عیسائی پادری سڑکوں پر اور مجمعوں میں وعظ و تقریر کرنے لگے۔ ابتدا میں عام مسلمان پادریوں کے وعظ بالکل نہیں سنتے تھے اور نہ ان کی کتابوں کو دیکھتے تھے، اس لیے علماء نے پادریوں کی تردید کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔ عام مسلمانوں کو ابتدا میں

[1] ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ج ا، ص: ۱۲۳-۱۲۴

عیسائی مذہب سے نفرت و کراہیت تھی، کچھ دنوں کے بعد وہ کیفیت قائم نہیں رہی اور اس بات کا خطرہ ہوا کہ گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں اور کچھ لوگ مبتلا بھی ہو گئے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر کچھ علماء نے ان کی تردید و مخالفت کی خدمت شروع کی۔ مثلاً سیّد آل حسن رضوی مہانی، مصنف 'الاستبصار' اور شیخ رحمت اللہ کیرانوی مصنف 'اظہار الحق' وغیرہ۔ ان علمائے کرام نے عیسائی مذہب کی تردید میں کتابیں اور رسالے تصنیف کیے۔ شیخ رحمت اللہ کیرانوی نے پادری فنڈر کو جو اس وقت عیسائی مذہب کا ایک ممتاز عالم اور 'میزان الحق' نامی کتاب کا مصنف تھا، مناظروں کی دعوت دی۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ عام لوگوں کے سامنے حق بات واضح ہو جائے اور لوگ یہ جان جائیں گے کہ اب تک علماء اسلام نے جو توجہ نہیں کی تھی وہ نا اہلی کی وجہ سے نہیں تھی جیسا کہ بعض عیسائی مبلغین اعلان کیا کرتے تھے۔ چنانچہ دونوں فریق مناظرے کے لیے تیار ہو گئے اور یہ طے ہوا کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو پانچ بنیادی اختلافی مسائل ہیں ان پر مناظرہ ہوگا وہ پانچ بنیادی مسائل یہ ہیں۔ تحریف انجیل، عقیدہ تثلیث، حقیقت قرآن، نبوت محمدی، بالآخر رجب ۱۲۷۰ھ میں آگرہ میں یہ مجلس مناظرہ قائم ہوئی۔ مولانا کیرانوی کے معاون اس مجلس میں ڈاکٹر محمد وزیر خاں تھے اور پادری فنڈر مصنف 'میزان الحق' کی مدد کچھ اور پادری کر رہے تھے۔ مولانا کیرانوی کو اس مناظرے میں نسخ انجیل اور تحریف انجیل کے مسئلے میں کھلی ہوئی فتح حاصل ہوئی، پادری فنڈر نے جب یہ دیکھا کہ وہ مناظرے میں شکست کھا گیا تو پھر آئندہ سے اس نے مناظرہ کرنا چھوڑ دیا اور مولانا کیرانوی کی عزت و آبرو اور جان کے درپے آ گیا۔

مولانا کیرانوی نے اس موضوع پر درج ذیل کتب تصنیف فرمائیں۔

۱- اظہار الحق، بزبان عربی، مسئلہ تحریف نسخ، حقیقت تثلیث، قرآن اور نبوت محمدی۔ یہ کتابیں، زینی وحلان شافعی مکی کے ایماء سے تصنیف کی، اس کتاب کا ترجمہ فرانسیسی جرمن، انگریزی، ترکی اور اردو زبان میں ہوا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے 'ازالۃ الاوہام' بزبان فارسی، 'ازالۃ الشکوک' بزبان ہندی، اعجاز عیسوی، مسئلہ تحریف اور بھی بہت ساری کتابیں تحریر فرمائیں۔[1]

[1] اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں، ص ۲۹۴-۲۹۶

اس دور میں عیسائیت کی تردید میں جن علماء نے کام کیا اور جو کتابیں تحریر کیں، ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔ سید ناصر الدین محمد علی ابو منصور دہلوی نے انگریزی زبان سیکھی اور تورات وانجیل پادریوں سے پڑھی۔ انھوں نے اسلام کی مدافعت میں بہت سی کتابیں لکھیں، مثلاً نوید جاوید، دولت فاروقی، عقوبۃ الضالین۔ عماد الدین عیسائی کی کتاب 'ہدایۃ المسلمین' کی تردید میں 'الاستیصال'، رام چندر عیسائی کی کتاب 'المسیح دجال' کی تردید میں 'رقیمۃ الوداد'، صفدر عیسائی کی کتاب نیاز نامہ کی تردید میں 'انعام العام' وغیرہ وغیرہ لکھی گئیں، دوسرا نام سرسید کا ہے انھوں نے عیسائیت کی تردید میں خطبات احمدیہ لکھی، مولوی چراغ علی حیدرآبادی، ان کے علاوہ اور بھی کئی مصنفین نے کتابیں تصنیف کیں۔[1]

اس کے علاوہ آریوں سے بھی مکالمات کے ثبوت ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آریہ مذہب کا بانی دیانند سرسوتی نے ایک کتاب لکھی تھی۔ اس میں انبیاء کرام کے خلاف افتراء پردازیاں کی ہیں۔ اس سے مکالمہ ہوا، جن مسلم علماء نے مناظرہ کیا ان میں مرزا غلام احمد قادیانی، حکیم نورالدین خلیفہ مرزا قادیانی، مولانا قاسم نانوتوی، حسن میرٹھی، مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہ ہیں۔

درج بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات عرض کی جاسکتی ہے کہ ہندوستان میں ادیان کی کثرت رہی ہے اور ان کا احترام ہندوستان کی مسلم حکومتوں میں کافی ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم بادشاہوں کے دربار میں بین مذہبی مذاکرات کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ اس کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ جو مذاہب وادیان موجود ہیں ان میں کسی بھی طرح کی نفرت و بیزاری دین دھرم کے نام پر پیدا نہ ہو، بلکہ باہمی افہام وتفہیم سے مسئلے کا حل نکال لیا جائے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ مذہبی افہام وتفہیم کی محفلیں آراستہ اس وقت ہوتی تھیں جب حکومت واقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے یہ بات کہنا کہ اسلام کی تبلیغ زور زبردستی ہوئی ہے سراسر غلط ہے۔

---

[1] ان کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں، ص ۲۹۷-۲۹۸

ہندوؤں کے دینی ادب کے تراجم:

یہ بات بڑی اہم ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی تہذیب وتمدن اور دین دھرم کو سمجھنے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کی غرض سے ہندوؤں کے دینی ادب اور ان کے مقدس نوشتوں کے اپنی زبان میں تراجم کیے۔اس حوالے سے مغل حکمرانوں نے بڑی دلچسپی دکھائی۔ جب مغلیہ عہد کی تاریخ پڑھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اکبر نے اپنے دور اقتدار میں ہندوؤں سے رواداری اور ان کے مذہب سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے مہابھارت، رامائن اور ویدوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا، کیونکہ اس وقت ملک کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ ہندوستان میں اب بھی اسی چیز کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے درمیان پائی جانے والی بیزاری اور نفرت کے خاتمے کے لیے باہمی افہام وتفہیم کو فروغ دیں اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ ایک دوسرے کے ادیان کا مطالعہ ایمانداری سے کیا جائے گا۔مغل حکمرانوں میں یہ قدر مشترک رہی کہ انھوں نے ہندوستان میں پائے جانے والے ادیان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا بلکہ ان کے دینی ادب اور مقدس صحیفوں کے تراجم بھی کرائے۔چنانچہ اکبر کو علوم وفنون سے بھی خاصا لگاؤ تھا،اسی وجہ سے اس کے عہد میں بڑے بڑے علمی وفکری کارنامے انجام دیے گئے۔

اتھروید،۱۵۷۵ء میں اکبر نے چوتھے وید کو فارسی میں ترجمہ کرانے کی کوشش کی، ملا عبدالقادر بدایونی کو حکم ملا کے اس کا ترجمہ کریں، ملا صاحب نے اس کی تفصیل اپنی کتاب میں اس طرح لکھی ہے:

> ''اس کے بعض احکام،اسلام کے مطابق ہیں،مثلا اس کے احکام میں ایک حکم یہ ہے کہ جب تک ایسی عبادت جس میں لام بہت آتے ہیں جیسے کلمہ لا الہ اللہ پڑھی نہ جائے تو نجات نہیں ہوگی۔ایک حکم یہ بھی ہے کہ میت کو دفن کیا جائے ،جلایا نہ جائے،جب اس کا ترجمہ شروع کیا تو اس کی عبارت بہت پیچیدہ معلوم ہوئی،ایک نومسلم عبارتوں کی تعبیر کے لیے ان کی مدد میں تھا،مگر اس میں بھی اس کی پیچیدگی دور نہیں ہوئی تھی، ملا صاحب نے اپنی مشکل اکبر سے بیان کی تو

اس نے ترجمے کا کام پہلے فیضی کے سپرد کیا وہ بھی اس کا ترجمہ نہ کر پایا، تو حاجی ابراہیم سرہندی کے حوالے کیا گیا وہ بھی اس کا ترجمہ خاطر خواہ نہ کر سکے'' [1]

مہا بھارت: اسی سال ۹۹۰ھ میں اکبر کی خواہش پر مہابھارت کا ترجمہ کیا گیا اس بابت جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ اس طرح ہیں:

''یہ ہندوستان کی بہت پرانی کتاب ہے اس میں قصے ہیں، مواعظ ہیں، ملکی امور کی باتیں، اخلاق وادب کی نصیحتیں ہیں، معارف واعتقادات ہیں، ہندو مذہب اور عبادت کی تفصیل ہے، یہ تمام چیزیں ہندوستان کے پرانے فرما رواؤں کی جنگ کے سلسلے میں بیان کی گئی ہیں، بعض لوگوں کی رائے ہے کہ یہ واقعات کم از کم چار ہزار برس پہلے کے ہیں اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسی ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ گذرا، جو بظاہر آدم سے پہلے کا دور معلوم ہوتا ہے، ہندوستان کے لوگ اس کتاب کے لکھنے اور پڑھنے کو عبادت عظیم سمجھتے ہیں اور اسے مسلمانوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں'' [2]

اس کے ترجمہ کے سبب پر بدایونی نے اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

''بادشاہ نے شاہنامہ اور امیر حمزہ کے قصے کو سترہ جلدوں میں ۱۵ سال کی مدت میں لکھوا آیا تھا، اس موقع پر روپیہ بھی خرچ ہوا تھا، اسی طرح ابومسلم کا قصہ جامع الحکایات وغیرہ کو بادشاہ نے متعدد بار پڑھ کر سنا تھا، ان کتابوں کے متعلق اس کا خیال تھا کہ یہ سب حقیقی واقعات نہیں بلکہ فرضی ہیں اور شاعری کی گئی ہے۔ یہ کتابیں چوں کہ اچھے وقت میں لکھی گئی تھیں اور لکھنے والوں کی قسمت اچھی تھی کہ ان کو شہرت عام نصیب ہوگئی۔ اکبر کو خیال ہوا کہ ان کتابوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی کتابوں کو جنہیں عبادت گزار دانشوروں نے لکھا ہے اور وہ سب کے سب حقیقی اور نص قاطع ہیں۔ ہندوؤں کی عبادتوں، واعتقاد اور

---

[1] ملا، عبدالقادر، بدایونی، منتخب التواریخ، اُردو ترجمہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۸، ج ۲، ص ۱۶۲-۱۶۳ [2] ایضاً، ص ۲۶۹

مذہب کا سرچشمہ بھی ہیں، ہندی ترجمہ کرا کے کیوں نہ اپنے نام سے منسوب کرایا جائے۔ یہ واقعات فارسی میں اب تک بیان نہیں کیے گئے ہیں اس لیے دلچسپ اور نئے رہیں گے۔ اس کے علاوہ جس طرح ان کتابوں کے مقدمہ میں درج ہے کہ ان کی اشاعت دینی اور دنیاوی سعادت کا موجب اور شان و شوکت کے بقاء اور اولاد و اموال کی کثرت کا باعث بھی ہوگا۔ چنانچہ اکبر نے خود بھی ذاتی طور پر وقت دینے کا فیصلہ کیا، ہندو اہل علم کو جمع کر کے حکم دیا کہ وہ ماہورت کی تعبیر ترجمانی کریں۔ چند راتوں تک اکبر نقیب خان کی مدد سے اس کے مضامین کو سمجھتا رہا اور اس کے مطالب کو فارسی میں لکھواتا رہا۔ تیسری رات بادشاہ نے مجھے بلایا اور حکم دیا کہ میں نقیب خان کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کرتا رہوں، تین چار مہینے کی مدت اس مجموعے کے اٹھارہ فنون میں سے جن میں اٹھارہ ہزار عالم کا تذکرہ کیا گیا ہے صرف دو فن لکھے جا سکے۔ نہ معلوم مجھ سے کیا گناہ ہوا تھا کہ اس ترجمے سے پالا پڑا اور اور طرح طرح کے اعتراضات برداشت کرنے پڑے۔ اس کام میں مجھے سوائے طعن و تعرض کے کچھ نہیں ملا۔ بعد میں اس کے ایک حصے کو ملا شیری اور نقیب خان نے پورا کیا اور ایک حصے کی تنہا سلطان حاجی تھانیسری نے تکمیل کی۔ اس کے بعد شیخ فیضی نے اس کے دو فنون کی نظم و نثر مرتب کی پھر تھانیسری نے دو حصے اور لکھے اور پہلے جو فروگذاشتیں ہوئی تھی ان کی تصحیح کر دی۔ اس طرح کتاب کے سو جز مکمل ہو گئے۔ بادشاہ کو اصل اور نقل کی مطابقت پر کچھ ایسا اصرار تھا کہ مکھی کا داغ بھی چھوٹ نے نہ پائے۔ اکبر نے اس ترجمہ کا نام ''رزم نامہ'' رکھا، اس کے دو مصور نسخے تیار کرائے اور جب یہ تیار ہو گئے تو امراء کو حکم دیا گیا کہ وہ اس پر ہاتھ رکھ کر برکت حاصل کریں۔ ابوالفضل جس نے اس سے پہلے آیت الکرسی کی تفسیر لکھی تھی اس کفرنامے پر اس نے دو جز کا خطبہ لکھا'' [1]

[1] ملا عبدالقادر، بدایونی، منتخب التواریخ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۸، ج ۲، ص ۲۶۹-۲۷۱

مہا بھارت کے دو مصور نسخے بھی تیار ہوئے اس کی تفصیل مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی کتاب 'مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے' میں اس طرح لکھی ہے:

''مہا بھارت کے فارسی ترجمے کو بھی خواجہ عبدالصمد شیریں قلم کے لڑکے محمد شریف شیریں قلم کے اہتمام میں مصور کیا گیا۔ اس میں ۱۶۵ تصویریں تھیں، جن کی تیاری میں ایک فرنگی مؤرخ کے حساب کے مطابق چالیس ہزار پونڈ خرچ ہوئے تھے۔ یہ اب جے پور کے پوتھی خانہ میں ہے، اس میں سے ۱۴۸ تصویریں ڈاکٹر کرنل، ایچ، ٹی، ہنڈلے نے علیحدہ سے شائع کر دی ہیں۔ رزنامہ کے بعض مصور نسخے شملہ بڑودہ اور لندن کے کتب خانوں میں بھی موجود ہیں، جو شاید بعد میں تیار ہوتے گئے۔ اس کتاب کو مختلف مصوروں نے مل کر مصور کیا جن کے نام ان تصویروں میں درج ہیں، ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں مسکین، احمد کشمیری، باہن، بھوانی، دھانو، بلاقی جمشید نائک، میرک، سرجو، نرائن، مادھو۔ ان تصویروں میں ایک تو سوئمبر کا منظر ہے جس سے آنکھوں کے سامنے اس زمانے کا پورا نقشہ آجاتا ہے، کئی لڑائیوں کی بھی مرقع آرائی کی گئی ہے، رتھ، ہاتھی اور گھوڑوں پر سپاہیوں کو لڑتے دکھایا گیا ہے، رتھ پر صرف دو آدمی ہوتے تھے، ایک تو وہ جو ہانکتا اور دوسرا وہ جو لڑتا۔ وہ منظر جس میں یدھشتروں اور دروپد بلدان کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں بڑا جاذب نظر ہے ایک میں شیو جی کی پوجا کا منظر بھی ہے۔ رزم نامے کی جتنی تصویریں اکبر کے زمانے میں تیار ہوئیں ان میں مشہور مصور بہزاد کے تکنیک کے اثرات زیادہ ہیں، مگر ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مقامی اثرات بھی پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے''۔[1]

رامائن کا ترجمہ: ۹۹۲ھ (۱۵۸۴ء) میں ملا عبدالقادر بدایونی نے شاہی حکم کی بموجب

---

[1] سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۰۹ء، ص ۴۸۵

رامائن کا ترجمہ شروع کیا اور ۱۶۶۹ء میں تمام ہوا۔ اس کی تفصیل بدایونی نے اس طرح لکھی ہے:

''اس زمانے میں بادشاہ نے مجھے ''رامائن'' کے ترجمہ کا حکم دیا جو تصنیف کے لحاظ سے مہا بھارت سے پہلے کی کتاب ہے، اس میں ۲۵ ہزار شلوک ہیں، ہر شلوک ۶۵ حروف کا ایک طویل فقرہ ہے۔ ''رامائن'' میں اودھ کے راجہ رام چندر جسے عام طور پر رام کہا جاتا ہے، انہی کی داستان ہے ہندو ان کو خدا کا اوتار سمجھتے ہیں کہ اللہ نے رام کی شکل میں حلول کیا تھا۔ اس داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ لنکا کے جزیرے پر راون نامی دس سروں والا ایک دیو حکومت کرتا تھا وہ رام کی بیوی سیتا کو اغوا کر کے لنکا لے گیا۔ رام نے اپنے بھائی لچھمن کے ساتھ اس جزیرے کا رخ کیا بے شمار بندروں اور ریچھوں کا لشکر تیار کیا اور سمندر پر ۴ کوس لمبا پل بندھوایا۔ بعض ہندوؤں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ اس فاصلے کو ایک چھلانگ میں طے کر گئے اور بعض ایسے بندر تھے کہ سمندر پر چلتے ہوئے وہاں پہنچے، اگر ایسی بہت سی باتیں اس میں درج ہیں۔ بہر حال رام چندر ایک بندر پر سوار ہو کر اس پل پر سے گزرے اور ایک ہفتے تک جنگ کر کے راون کو اس کے اہل وعیال کے ساتھ قتل کر دیا اور لنکا کو راون کے بھائی کے حوالے کر کے اپنے شہر واپس آ گئے، ہندوؤں کا خیال ہے کہ رام نے سارے ہندوستان پر دس ہزار سال تک حکومت کرنے کے بعد وفات پائی۔ ہندوؤں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ دنیا کافی قدیم ہمیشہ سے ہے اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا ہے جب انسان اس دنیا میں نہیں رہا ہو، ظاہر ہے کہ رامائن کے یہ واقعات محض افسانہ اور خیالی داستانیں ہیں جیسے شاہنامہ اور امیر حمزہ کی داستانیں جو درندوں اور جنون کے اقتدار کے زمانے میں گزرا تھا'' [1]

بدایونی نے اس کا ترجمہ کر کے چار سال میں اکبر کی خدمت میں پیش کیا تو اس میں یہ شعر لکھا:

---

[1] منتخب التواریخ، (اُردو ترجمہ) ج ۲، ص ۲۸۴

ماقصہ نوشتیم بہ سلطان کہ رساند
جاں سوختہ کردیم بہ جاناں کہ رساند

اکبر کو یہ شعر بہت پسند آیا۔ اس نے پوچھا یہ کتنے جز میں مکمل ہوا، تو بدایونی نے بتایا کہ پہلی بار اختصار کے ساتھ تقریباً ستر جز اور دوسری میں تفصیل کے ساتھ ایک سو بیس جزوں میں تمام ہوا۔ اکبر نے مصنفوں کے دستور کے مطابق اس پر ایک دیباچہ لکھنے کی فرمائش کی لیکن انھوں نے اس کے لکھنے سے اغماض کیا۔ پھر اکبر ان کو ایک شال اور گھوڑا انعام میں عطا کیا اور ان کی مدد معاش کے لیے فرمان بھی جاری کرنے کو کہا۔ اس ترجمے کے نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔[1]

اپنشدوں کا فارسی ترجمہ:

یہ حقیقت ہے کہ دارا شکوہ (۱۶۱۵ء-۱۶۵۹ء) علم وفضل کے اساطین میں شمار ہوتا ہے۔ وہ بہترین مصنف، شاعر اور خطاط تھا اس نے اپنی زندگی میں کئی باکمال علمی، فکری اور تہذیبی کارنامے انجام دیے۔ جن میں سفینۃ الاولیاء، سکینۃ الاولیاء، رسالہ حق نما، حسنات العارفین، شطحیات، مجمع البحرین وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اس نے جو سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، وہ ہندوؤں کی اہم تصانیف اپنشدوں کا ترجمہ ہے جسے سِرِ اکبر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اپنشدوں کے ترجمہ کے متعلق 'بزم تیموریہ' کے مصنف نے لکھا ہے:

> ''سر اکبر اپنشدوں کے پچاس ابواب کا فارسی ترجمہ ہے۔ جو دارا شکوہ نے ۱۰۶۷ھ میں بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے کیا، اس کتاب میں بسم اللہ کے بجائے گنیش جی کی تصویر ہے اور دیباچہ میں لکھا ہے کہ اصل قرآن مجید یہی ہے (واللہ اعلم بالصواب) پھر اس کی وجہ تصنیف پر روشنی ڈالی ہے۔
>
> ''جب یہ فقیر بے اندوہ محمد دارا شکوہ ۱۰۵۰ھ میں کشمیر جنت نظیر گیا، تو میں نے عنایت الٰہی اور اس کے فضل سے لامتناہی کاملوں کے کامل عارفوں کے خلاصہ، استادوں کے استاد پیشواؤں کے پیشوا اور حقائق آگاہ کے معتقد یعنی حضرت ملا

[1] سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم تیموریہ، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۸ء، ص ۱۲۰

شاہ سلمہ اللہ سے سیادت اور ارادت حاصل کی، مجھ کو ہر گروہ کے عارفوں کو دیکھنے اور توحید کے متعلق اعلیٰ باتیں سننے کا ذوق تھا اور تصوف کی بہت سی کتابیں نظر سے گزر چکی تھیں اور کچھ رسالے بھی تصنیف کیے تھے، لیکن طلب توحید میں جو ایک بحر بیکراں ہے اور بھی تشنگی ہر وقت بڑھتی گئی، دقیق مسائل ذہن میں آتے تھے جن کا حل بجز کلام الٰہی اور استاد ذات نامتناہی کے ناممکن تھا، چونکہ قرآن مجید عظیم اور فرقان کریم کی اکثر باتیں رمزکی ہیں اور آج کل ان کے جاننے والے کم ہیں اس لیے میں نے چاہا کہ تمام آسمانی کتابوں کو پڑھوں، کیونکہ کلام الٰہی اپنی تفسیر آپ ہے، یعنی جو بات مجمل ہوگی دوسری کتابوں میں مفصل جانی جائے گی، اس تفصیل کا اجمال معلوم ہو جائے گا، میں نے تورات، انجیل، زبور اور دوسری کتابیں پڑھیں لیکن ان میں توحید کا بیان مجمل اور اشارات میں تھا اور ان آسان ترجمہ سے جن کو اہل غرض نے کیا ہے مطلب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اس بات کی فکر میں ہوا کہ ہندوستان میں وحدت ادیان میں توحید کی گفتگو کیوں بہت زیادہ ہے اور قدیم ہند کے ظاہری اور باطنی علماء وحدت نے انکار اور موحدوں پر کوئی اعتراض نہیں، بلکہ ان پر اعتبار ہے، برخلاف اس کے جہلائے وقت خداشناسوں اور موحدوں کے قتل، کفر اور انکار میں مشغول ہیں اور توحید کی تمام باتوں کو جو کلام پاک اور صحیح احادیث نبوی سے ظاہر ہیں رد کرتے ہیں، وہ خدا کے راستے کے راہزن ہیں، ان باتوں کی تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اس قوم قدیم (یعنی ہندوؤں) کے درمیان تمام آسمانی کتابوں سے پہلے چار آسمانی کتابیں تھیں، رگ وید، سام وید، اتھرین کی بید، یجر وید اور اسی وقت کے سب سے بڑے نبی برہما یعنی آدم صفی اللہ پر یہ تمام احکام نازل ہوئے اور یہ باتیں ان کتابوں سے ظاہر ہیں۔ اور محض توحید کے اشغال اس میں درج ہیں جس کا نام اپنکہت ہے، اس زمانے کے انبیاء ان کو علیحدہ کر کے ان پر شرح وبسط کے ساتھ تفسیریں لکھی ہیں اور ہمیشہ ان کو بہترین

عبادت سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ اس خاکسار کی نظر چوں کہ وحدت ذات کی اصل پر تھی، نہ کہ عربی، سریانی، عراقی اور سنسکرت زبان پر، اس لیے چاہا ان اپنکہت کو جو کہ توحید کا خزانہ ہیں اور جس کے جاننے والے اس قوم میں بھی کم رہ گئے ہیں، فارسی زبان میں بغیر کسی کمی بیشی اور نفسیاتی غرض کے لفظ بلفظ ترجمہ کر کے سمجھوں کہ یہ جماعت اس کو اہل اسلام سے پوشیدہ اور پنہاں کیوں رکھتی ہے، اس کا کیا بھید ہے؟ شہر بنارس جو اس قوم کا دارالعلم ہے اور جہاں پنڈت تھا اور سنیاسی جو کہ سرآمد وقت اور بید اور اپنکہت جاننے والے تھے، اس خاک سار سے تعلق رکھتا تھا ۱۰۶۷ھ میں بے غرضی کے ساتھ اس کا ترجمہ کیا اور توحید کے متعلق ہر قسم کی مشکل اور اعلیٰ باتیں جن کا میں طلب گار تھا لیکن نہیں پاتا، اس قدیم کتاب کے ذریعے معلوم ہوئیں جو بلاشبہ پہلی آسمانی کتاب ہے اور بحر توحید کا سرچشمہ ہے اور قدیم ہے اور قرآن مجید کی آیت بلکہ تفسیر ہے اور صراحتاً ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت بعینہٖ اس کتاب آسمانی سرچشمۂ بحر توحید قدیم کے حق میں ہے۔ انہ لقران کریم فی کتب مکنون لا یمسہ الا المطہرون تنزیل من رب العالمین، یعنی قرآن کریم ایسی کتاب میں ہے جو پوشیدہ ہے اور اس کو نہیں چھوتے مگر وہ جو کہ پاک ہیں، وہ نازل ہوئی ہے خداوند عالم کی طرف سے، متعین طور سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ توریت اور انجیل کے حق میں نہیں، لفظ تنزیل سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ لوح محفوظ کے حق میں ہے، چوں کہ اپنکہت ایک مخفی راز ہے اور قرآن مجید کی آیتیں بعینہ اس میں پائی جاتی ہیں، پس تحقیق کی چھپی ہوئی کتاب یہی کتاب قدیم ہے اس فقیر کا جس نے بے جانی ہوئی چیز کو جان لیا اور بے سمجھی ہوئی چیز کو سمجھ لیا اس ترجمہ کرنے میں اس کے سوا کوئی مطلب اور مقصد نہ تھا کہ وہ اور اس کی اولاد اس کے دوست اور حق کے طلب بگار فائدہ اٹھائیں''۔[1]

[1] بزم تیموریہ، ج ۳، ص ۱۹۶-۱۹۸

بھگوت گیتا: داراشکوہ کی جانب بھگوت گیتا کا ترجمہ بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ اس ترجمے کے متعلق درج ذیل باتیں ملتی ہیں۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی تحقیق کے مطابق بھگوت گیتا کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے۔ جس کے شروع میں یہ عبارت ہے:

''گیتا بزبان فارسی تصنیف شیخ ابوالفضل علائی از کتاب مہابھارت از فن ششم کہ آں را بحلم پرپ گویند سر کرشن جیودار جن سنیار۔ اس تحریر کے مطابق تو پتہ چلتا ہے کہ بھگوت گیتا کا فارسی ترجمہ شیخ ابوالفضل نے کیا ہے۔ البتہ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں بھی ہے۔ اس کے فہرست نگار نے اسی نسخے کے ترجمے کو داراشکوہ کی طرف منسوب کیا اور یہ بھی واضح طور سے بتایا ہے کہ برٹش میوزیم کے نسخے کو ابوالفضل کی طرف منسوب کرنا درست نہیں ہے۔ اسی طرح لاہور سے آرٹ پیپر پر بھگوت گیتا کو شائع کیا ہے اور اس کو فیضی کا ترجمہ بتایا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ ملتا ہے کہ اکبری عہد کے مختلف تراجم کی جو فہرست معاصر تاریخوں میں درج ہے اس میں یہ نہیں ہے کہ فیضی نے بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ کیا تھا''۔[1]

متذکرہ کتب ہندوؤں کے دینی ادب میں شمار کی جاتی ہیں، اب ذرا تصور کیجیے کہ اس قدر توسع اور رواداری سے مسلم حکمرانوں نے کام کیا کہ ہندوؤں کے دینی ادب کا ترجمہ بلا کسی کمی بیشی اور ردوبدل کے کرایا۔ علاوہ ازیں ہندوؤں کے دینی ادب یعنی وید، گیتا، مہابھارت، رامائن اور اپنشد وغیرہ کے اردو ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ غوث سیوانی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ مہابھارت کا عربی میں بھی ترجمہ ہوا تھا، اس کی تفصیل اس طرح ہے:

''مہابھارت کا عربی ترجمہ گیارہویں صدی عیسوی میں موجود تھا اور یہ فرانس کے ایک کتب خانے میں دستیاب ہوا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں کسی شہزادی کے حکم سے کیا گیا تھا اور مترجم کا نام ابو صالح تھا، اس سے فارسی میں مہابھارت کا ترجمہ کیا گیا اور فارسی سے فرنچ میں ترجمہ ہوا۔ جس کا نام غالباً ''مجمل التواریخ'' تھا، اس میں ایک مقام پر تحریر تھا'' بھارت کے بادشاہوں کی تاریخ

[1] بزم تیموریہ، ج ۳، ص ۱۹۹

اور اس کی فہرست جانکاری کے لیے دی جارہی ہے جو ہمیں دستیاب ہوئی''

اصل میں مہابھارت کا عربی ترجمہ وسط ایشیا کے شہر جرجان میں دستیاب ہوا تھا، جس کی جانکاری وہاں کے لائبریرین ابوالحسن علی نے دی تھی۔ ۱۸۴۵ء میں پہلی بار فرنچ میں مہابھارت کا ترجمہ شائع ہوا، جو سنسکرت نہیں بلکہ عربی کے اسی نسخے سے کیا گیا تھا اور اسے Membre de l'Institut, M.Reinaud, Paris نے شائع کیا تھا۔ مہابھارت کا عربی ترجمہ گیارہویں صدی عیسوی میں کیسے ہوگیا، جب کہ دلی میں مسلم سلطنت کا قیام بھی اس وقت تک نہیں ہوا تھا؟ اس سوال کا بالکل ٹھیک ٹھیک جواب ملنا مشکل ہے مگر اس عہد میں سندھ میں مسلمانوں کی کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں اور جاٹوں کا ایک بڑا طبقہ عرب وایران میں آباد تھا، ایسے میں سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ اہل عرب اکثر سمندری راستے سے بھارت، چین، لنکا وغیرہ کے سفر پر قدیم دور سے آتے رہے ہیں، ایسے میں ان کی مہابھارت تک رسائی ناممکن نہیں لگتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مہابھارت کا سنسکرت سے عربی میں ترجمہ بغداد کے ان ترجمہ گاہوں میں ہوا ہو جو خلفاء بنو عباسیہ کے عہد میں قائم کیے گئے تھے اور سرکار ان کی سرپرستی کیا کرتی تھی۔ یہاں ہندوستانی اہل علم کو ترجمہ کی ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں''۔[1]

بالائی سطروں سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے اس کی اپنی اہمیت وافادیت ہے۔ ایک تو یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں کے دینی نوشتوں اور صحیفوں کے تراجم کس دور میں ہوئے؟ دوسرے یہ کہ اس وقت ان تراجم کے معاشرے پر جو اثرات مرتب ہوئے ہوں گے وہ کسی کی نظروں سے اوجھل نہیں ہے۔ غور کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی اعلیٰ ظرفی اور ان کی وسعت فکر ونظر کی بات ہے کہ مسلم تہذیب اور مسلم معاشرے میں، دوسرے دین کے افکار وخیالات کو ترجمے کی شکل میں پہنچایا جارہا ہے۔ آج ہندوستان میں یہ رواج عام ہوگیا ہے کہ مسلم حکمرانوں

[1] غوث سیوانی کا مضمون جو ریختہ پر موجود ہے

نے ہندوؤں کے ساتھ زیادتی کی ،ان کے حقوق کو غصب کیا ، یا پھر ان کی تہذیب و دین پر پابندی عائد کی ۔ یہ تمام خدشات و اعتراضات بے بنیاد ہیں۔حقیقت سے ان کا دور کا بھی رشتہ نہیں ہے۔ بلکہ سچائی یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے ایسا سماج اور معاشرہ تشکیل دیا تھا کہ جس میں تمام ادیان و افکار کے حاملین پوری آزادی اور حریت کے ساتھ رہ سکیں۔ یہ تراجم بتاتے ہیں کہ مسلم حکمرانوں نے تکثیری سماج کی تشکیل وتعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

ہندوؤں کی تہذیبی اور فکری کتابوں کے تراجم:

مذہبی اور دینی کتابوں کے علاوہ کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جو ہندوؤں کی تہذیب و شناخت، ان کی تاریخ اور طرز معاشرت سے بحث کرتی ہیں۔لہٰذا ہندوؤں کے پورے نظام کو سمجھنے،ان کی تاریخ کو جاننے کے لیے ایسی کتابوں کے بھی تراجم ہوئے۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی کتاب 'منتخب التواریخ' میں لکھا ہے کہ سلطان فیروز شاہ تغلق (۱۳۰۹-۱۳۸۸) کے دور اقتدار ۱۳۵۱-۱۳۸۸ میں ہندوؤں کی بہت ساری کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا:

> ''سلطان نگرکوٹ گیا اور لڑائی کے بعد قلعے کا محاصرہ کیا آخر وہاں کا راجہ امن کا طالب ہوا اور حاضر بارگاہ ہوا، بادشاہ نے مرحوم کے نام نگرکوٹ کا نام محمد آباد رکھ دیا۔اس مقام پر پہاڑی لوگ بادشاہ کے لیے برف لے کر حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ اسی مقام پر سلطان محمد مرحوم کے لیے بھی لوگ برف لے کر آئے تھے۔کیونکہ اس وقت میں حاضر نہیں تھا اس لیے سلطان نے بھی اس برف کا شربت نہیں پیا تھا۔اس واقعے کو یاد کر کے بادشاہ نے اس برف میں مصری ڈلوائی جو کئی ہاتھیوں اور اونٹوں پر لدی ہوئی ہمراہ تھی اور شربت تیار کرایا اور سلطان محمد کی فاتحہ کے لیے قرآن ختم کرا کے سارے لشکر میں تقسیم کر دیا۔ اس موقع پر لوگوں نے بادشاہ کو بتایا کہ جب سکندر ذوالقرنین ہندوستان آیا تھا اس وقت سے اس علاقے کی لوگ نوشابہ کی تصویر اپنے گھروں میں رکھتے

ہیں، اور اس کی پرستش کرتے ہیں، اس کے علاوہ یہاں کے بت خانے میں جسے لوگ ''جوالامکھی'' کہتے ہیں پیچھے زمانے کی برہمنوں کی ۱۳۰۰ کتابیں رکھی ہوئی ہیں، اس جگہ سے آگ کے شعلے کافی نکلتے رہتے ہیں کہ ہزاروں مشک پانی ڈالا جائے تو یہ آگ نہیں بجھ سکتی۔

بادشاہ نے وہاں کے برہمنوں کو بلا کر وہ کتاب منگوائی اور ان کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا، ان کتابوں میں سے ایک کتاب کو اعز الدین خالد قاضی نے جو اس کے عہد کے بڑے شاعروں میں سے تھا۔ علم نجوم کے بیان میں کیا اور اس کا نام ''دلائل فیروزی'' رکھا۔ بدایونی کا کہنا ہے کہ میں نے ان کتابوں کو لاہور میں ۱۰۰۰ھ اور ۱۵۹۱ء میں اول سے آخر تک دیکھا ہے''۔[۱]

یہ بات آچکی ہے کہ اکبر کو علوم وفنون سے خاصی دلچسپی تھی اور اس کے دور میں مذہبی کتابوں کے علاوہ ہندوؤں کی دیگر تہذیبوں پر مشتمل کتب کے تراجم سنسکرت سے فارسی میں کرائیے۔ جن کی تفصیل ذیل میں پیش ہے:

سنگھاسن بتیسی: ۱۵۷۴ء میں ملا عبدالقادر بدایونی نے سنسکرت کی مشہور کتاب سنگھاسن بتیسی کا فارسی ترجمہ کیا، اس سال اکبر کا جب قیام قنوج میں ہوا تو اس نے ملا صاحب کو اپنے یہاں بلایا اور ان کو حکم دیا کہ وہ طوطی نامہ کی طرح سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ کر کے اس کی نظم ونثر کو مرتب کریں۔ اس میں ہندوؤں کے مشہور راجہ بکرماجیت کے متعلق بیس قصے ہیں۔ اکبر کو حکم ہوا کہ اس روز ترجمہ شروع کر کے اس کا ورق اس کے سامنے پیش کیا جائے، ملا بدایونی کے لیے ایک پنڈت بھی مقرر کر دیا۔ انھوں نے ایک ورق ترجمہ کر کے پیش کیا تو اکبر نے ترجمے کی تعریف کی اور جب پوری کتاب تیار ہوئی تو اس کا نام ''خرد افزا'' رکھا گیا۔[۲]

---

۱ منتخب التواریخ، (اُردو ترجمہ) ج ۱، ص ۱۹۲-۱۹۳

۲ بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۱۴- بحوالہ منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۱۸۴

لیلاوتی: یہ حساب کی مشہور کتاب ہے جو پنڈت بھسکر اچاریہ نے سنسکرت میں لکھی اور اپنی لڑکی کے نام پر اس کا نام رکھا۔ ۹۹۹ھ میں اکبر کی فرمائش پر ابوالفضل فیضی نے اس کا ترجمہ پنڈتوں کی مدد سے فارسی میں کیا۔[1]

کلیلہ ودمنہ: قصہ کے پیرائے 'حکمت عملی' کی سنسکرت میں ایک مشہور کتاب ہے۔ ملا حسین واعظ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، لیکن مشکل الفاظ اور عجیب وغریب استعارات سے یہ ترجمہ اس قدر پیچیدہ ہوگیا تھا کہ اس کا سمجھنا آسان نہ تھا، اس لیے اکبر نے ابوالفضل کو حکم دیا کہ اصل سنسکرت کو سامنے رکھ کر ایسی عبارت میں ترجمہ کیا جائے کہ بآسانی سمجھ میں آجائے۔ ۹۹۶ھ میں ابوالفضل نے اس کو انجام دیا اور کتاب کا نام ''عیار دانش'' رکھا اس کے اختتام پر ایک خاتمہ لکھا جس میں بعض نادر معانی اور نکات بیان کیے گئے ہیں۔[2]

تاجک: علم نجوم میں ایک بہترین تصنیف ہے، اکبر کی فرمائش پر مکمل خاں گجراتی نے اس کا فارسی ترجمہ کیا۔

ہربنس: اس میں کرشن جی کے حالات ہیں۔ اکبر کی خواہش پر مولانا شیری نے اس کا فارسی ترجمہ کیا۔ اسی طرح اکبر نے نہ صرف سنسکرت کی کتابیں فارسی میں منتقل کرائیں بلکہ اس کی خواہش تھی کہ فارسی اور عربی کی کتابوں کو بھی سنسکرت میں منتقل کردے۔ چنانچہ ''زیچ مرزائی'' کا ترجمہ سنسکرت میں ہوا۔ اس کے ترجمہ میں میر فتح اللہ شیرازی، ابوالفضل، کشن جوتشی، گنگا دھر اور مہیش مہانند شریک رہے۔[3] دارا شکوہ نے جن سنسکرت کتابوں کے تراجم کیے ان میں جگ بشست معروف ہے، یہ کتاب یوگ واس شست کا فارسی ترجمہ ہے، جو دارا شکوہ کے حکم سے اس کے ایک درباری نے ۱۰۶۶ھ میں کیا ہے۔ اس ترجمہ کی وجہ مقدمہ 'رقعات عالمگیری' میں اس طرح لکھی ہے:

''اس کتاب کے انتخاب کا ترجمہ شیخ صوفی کے ساتھ منسوب ہے ہم نے

---

[1] بزم تیموریہ، ج ۱، ص: ۱۲۰

[2] ایضاً، ص ۱۲۰-۱۲۱

[3] ایضاً، ص: ۱۲۳

(دارا) مطالعہ کیا، تو رات کو خواب میں دیکھا کہ دو بزرگ قبول صورت ایک اونچے پر اور دوسرے کسی قدر دان سے نیچے کھڑے ہیں معلوم ہوا ہے جو اونچے پر کھڑے تھے وہ بشست تھے اور دوسرے رام چندر (میں) بے اختیار بشست کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بشست نے نہایت مہربانی سے ہاتھ میری پیٹھ پر رکھا اور فرمایا کہ اے رام چندر یہ سچا طالب ہے، اور سچی طلب میں تیرا بھائی ہے۔ اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے۔ رام چندر جی کمال محبت کے ساتھ مجھ سے ملے اس کے بعد بشست نے رام چندر کے ہاتھ میں مٹھائی دی تا کہ مجھے کھلا دے، میں نے وہ شیرینی کھائی، اس خواب کے دیکھنے پر اور ہندوستان کے پنڈتوں سے، اس کتاب کے لکھنے میں انتظام وانصرام کیا''۔[1]

اس کے علاوہ دارا شکوہ نے اپنے ملازم منشی چندر بھان سے ایک کتاب تصنیف کرائی۔ جو مکالمہ دارا شکوہ بابا لعل کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس مکالمے کی روح اس خیال کی تائید ہے کہ حق کی صداقت کسی ایک خاص مذہب کی ملکیت نہیں ہے۔[2]

متذکرہ سطور میں ذکر کی گئیں کتابیں ہندوؤں کی مذہبی فکر کے ساتھ ساتھ ان کی تہذیبی، سماجی اور معاشرتی قدروں کو واضح کرتی ہیں، نیز ان کے رسوم ورواج کیا ہیں؟ خصائل و عادات کیسے تھے؟ گویا پورا تہذیبی اور معاشرتی نظام پیش کرتی ہیں۔ ان کتابوں کے فارسی زبان میں تراجم کرانے کے پس پردہ جو مقاصد ہیں ان میں نمایاں مقصد یہ ہے کہ ہندوؤں کی تہذیب اور ان کے سماجی ومعاشرتی نظام سے واقفیت حاصل ہو سکے۔ تا کہ معاشرے میں مذہب ودھرم کے نام پر کسی طرح کا خلفشار واقع نہ ہو، سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ تمام بنیادی اور اہم وشیں اس وقت انجام دی گئیں جب مسلمانوں کا اقتدار تھا، ان کی حکومت تھی۔

اس کام کا پیغام، اس کی افادیت اس وقت بھی کافی تھی اور آج بھی اس کی معنویت جوں کی توں برقرار ہے۔ آج معاشرے میں رواداری اور بقائے باہم بے حد ضروری ہے۔

---

[1] ندوی، سید نجیب اشرف، (مولانا) مقدمہ رقعات عالم گیری، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ص ۳۶۹

[2] ایضاً، ص ۳۶۰

کیونکہ اب معاشرے میں تفریق مذہب و دھرم کے نام پر پیدا کی جارہی ہے۔ ہندو مسلم میں تصادم بپا کرنے کی مذموم سعی ہورہی ہے۔ تو ایسے پرآشوب دور میں ضرورت ہے کہ اپنی تاریخ کا مطالعہ نظریاتی اور فکری طور پر کریں۔ یقیناً ہماری تاریخ میں رواداری، اخوت و اتحاد اور یک جہتی کے لیے مسلم امراء اور بادشاہوں نے جو گراں قدر کارنامے انجام دیے ہیں ان پر نوع انسانی کو بجا طور پر فخر ہوسکتا ہے۔ ورنہ اعتراض کرنے والے تو اعتراض کرتے رہیں گے اور شفاف تاریخ کو دھندلا کیا جاتا رہے گا۔ لیکن یہ ذمہ داری ان انصاف پسند اہل علم کی ہے۔ جو سیکولر روایات اور باہمی مشترک قدروں پر ایمان و یقین رکھتے ہیں اور معاشرہ کی سالمیت کے خواہاں ہیں کہ وہ ان غلط باتوں اور بے بنیاد یا افتراء آمیز باتوں پر یقین نہ کریں اور سماج کو بتائیں کہ مسلمانوں نے اپنے دور اقتدار میں ہندوستان جیسی مقدس سرزمین پر جہاں ہندوؤں سے مباحثہ کیے اور فکر وعقیدے کی حریت کو جلا بخشی تو وہیں ان کی تہذیب وثقافت اور سماجی و معاشی نظام کے تحفظ کے لیے مثبت اور قابلِ ذکر اقدامات کیے۔ ان کی ان کاوشوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ جن کا ہمیں انصاف اور ایمانداری سے تجزیہ وتحلیل کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندوؤں کی زبان اور علوم کا تحفظ:

اگر ہم ہندوستانی مسلم حکمرانوں کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے دور اقتدار میں ہندوؤں کے علوم وفنون اور زبان و بیان کی پوری قدر کی۔ اسی کے ساتھ اس کے تحفظ کے لیے بھی خدمات انجام دیں۔ اکبر کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ہندو فضلاء، شعراء، ادباء اور علماء کی بڑی قدر کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دربار میں ہندو شعراء کی ایک بڑی تعداد رہتی تھی۔

نرہری بندی جن چیبل آسی، ضلع فتح پور (یوپی) کا رہنے والا تھا، ۱۵۰۵ء میں پیدا ہوا، اکبر نے اس کے شاعرانہ کمال سے متاثر ہوکر اس کو مہا پتر کا خطاب دیا اور یہ کہا کہ اور شعراء گن کے پتر ہیں۔ مگر ترہری مہا پتر ہے۔ ایک بار اس کی نظم پڑھ کر ایسا متاثر ہوا کہ اپنی مملکت

میں گاؤکشی بند کردی۔ راجہ اسکرن کچھواہہ اکبری دربار کا سہ ہزاری منصب دار تھا، ہندی کا اچھا شاعر تھا۔

بلبھد رآچاریہ کیشو داس کا بڑا بھائی تھا، سنسکرت اور ہندی دونوں زبانوں میں مہارت رکھتا تھا، سنسکرت میں اس کی دو کتابیں 'بھگوت بھاشیا' اور 'بلبھد ردیا کرن' ہیں ہندی میں بھی دو کتابیں لکھی ہیں 'دوش وچار' اور 'نکھشیش' ابوالفضل نے اس کا ذکر بلبھد ر برہمن کے نام سے کیا ہے۔

بیکانیر کے راجہ کا بھائی اکبر کے دربار سے وابستہ رہا، برج بھاشا کا اچھا شاعر تھا، اس کی تصانیف میں 'پریم پرادمپکا' بہت مشہور ہیں۔

راجہ ٹوڈرمل اور راجہ مان سنگھ بھی ہندی میں اشعار کہتے تھے۔ راجہ مان سنگھ تو ہندی شعراء کا بڑا سرپرست رہا، ایک موقع پر اس نے ایک دوہے پر ایک لاکھ روپیہ انعام میں دیے۔ ان کے علاوہ اکبر کے دربار میں دوسرے ہندو شعراء میں منوہر لال رائے جگن ناتھ، راجہ کمند سنگھ ہاڈا، گنگ، گنگ بھٹ اور تان سین تھے جو اکبر کے ساتھ رزم اور بزم دونوں میں شریک رہتے تھے۔[1]

گویا متذکرہ سطور سے یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اکبر کے دور حکومت میں ہندی شاعری اور زبان وادب کو بڑا عروج ملا۔

ہندوؤں کی زبان اور ان کے علوم وفنون کے تحفظ و بقا کے اعتبار سے جہانگیر کا نام بھی بڑی قدر سے لیا جاتا ہے اور وہ جتنی وقعت فارسی شعراء کی کرتا تھا اتنی ہی وقعت ہندی شعراء کی بھی کرتا تھا:

> ''جہانگیر اپنی رواداری میں فارسی زبان کے شعراء کے ساتھ سنسکرت اور ہندی کے عالموں اور کویوں کی بھی سرپرستی کرتا رہا، سنسکرت کا ایک بڑا عالم شری کرشن جہانگیر کا بڑا معتمد علیہ تھا، اس نے بھاسکر اچاریہ کے 'الجبرا' کی ایک شرح 'بے چنون کور' کے نام سے لکھی۔ سنسکرت کے ایک شاعر 'رودر' نے جہانگیر کی سرپرستی

[1] ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ج ۲، ص ۳۸-۳۹

سے متاثر ہو کر ایک مدحیہ نظم نواب خاں چرت لکھی، جس میں جہاں گیر کی تعریف ہے۔ اسی نے اکبر کے دوسرے بیٹے شہزادہ دانیال کی شان میں 'دانا شاہ چرت' کے نام سے ایک مدح لکھی اس کی ایک مدح جہانگیر کے لڑکے شہزادہ خرم کے لیے بھی ہے اس کا نام سملا سہ ہے۔ اس کے دور میں ہندی شاعری نے بڑی ترقی کی۔''[1]

شاہجہاں کا جب دور آیا تو ان کے زمانے میں بھی ہندی بڑی مضبوط ہوئی اور ہندی کے بڑے بڑے شعراء پیدا ہوئے:

''شاہ جہانی عہد میں ہندی کا ماہر ادیب و شاعر چندر بھان برہمن تھا، لاہور میں پیدا ہوا، شروع میں میر عبدالکریم، میر عمارت لاہور کے یہاں ملازمت کی، پھر امیر الامراء افضل خان دیوان کل کے دربار میں ملازم ہوا۔ شاید اس کی سرکار کا دیوان مقرر ہوا۔ افضل خاں کی وفات کے بعد شاہجہاں کے ایک امیر افضل خاں کی وساطت سے دربار میں پہنچا اور خط شکستہ میں ایک رباعی لکھ کر شاہی خدمت میں پیش کی۔ شاہ جہاں نے اس کو وقائع نویس کے عہدے پر مقرر کیا۔ اس عہدے پر برہمن فخر کرتا تھا کیونکہ وہ روزانہ بارگاہ شاہی میں حاضر ہو کر ہر روز کے واقعات و حالات سناتا تھا۔ یہ صاحب تصنیف شاعر تھا اس کی معروف تصنیف 'منشات برہمن' ہے''۔[2]

شاہ جہاں اہل کمال ہندوؤں کی برابر سرپرستی کرتا رہا ۱۰۶۱ھ میں ایک شاعر نے اس کے نام پر ایک کبت کہی تو اس کو دو ہزار روپیہ اور ایک ہاتھی مرحمت کیا، ہندی شعراء میں 'سندر' اس کے دربار کا ملک الشعراء تھا، اس کی تصانیف 'سندر سرنگار' اور 'سنگھاسن بتیسی' برج بھاشا میں مشہور ہیں. ہندی کے مشہور شعراء چنتامنی اور راجا شمبھو ناتھ سنگھ بھی اس کے دربار سے منسلک رہے۔ چنتامنی سہتا یعنی ترکیب نظم کا استاد تھا، راجہ شمبھو ناتھ نے شاہ جہاں کی فرمائش پر 'کدنداکلب لتا'

---

[1] ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ج ۲، ص ۱۴۵

[2] بزم تیموریہ، ج ۲، ص ۲۱۱-۲۱۲

لکھی اس کتاب میں شاہ جہاں، داراشکوہ، اور جہاں آرا پر مدحیہ نظمیں ہیں۔[1]

اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۱۸-۱۷۰۷) مدت حکومت ۱۶۵۸-۱۷۰۷ء نے بھی ہندو شعراء اور فضلاء کی بڑی قدر کرتا تھا۔ ان کے دربار کا معروف رزمیہ شاعر 'بیر داس' اور 'بھوشن کوی" تھے بان کے عہد میں ہندوؤں کے علوم وفنون کو فارسی زبان میں منتقل کرنے کی جو کوشش ہوئیں وہ بڑی اہم ہیں۔ چنانچہ میرزا خاں بن فخر الدین محمد نے شہزادہ اعظم شاہ کے مطالعہ کے لیے 'تحفۃ الہند' تصنیف کی اس کا موضوع ہندوؤں کا فن بلاغت اور عروض قافیہ ہے۔ ابوسعید الحسینی رضوی شیرازی نے 'ہندو علوم ہیئت ونجوم' پر 'نظام انجم' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اسی عہد کی دو اور عجیب کتابیں ملتی ہیں۔ 'مت اچھرا' اور 'ردالکفر' دونوں ہندوؤں کے رسوم وعقائد پر ہیں۔ پہلی کتاب ایک ہندو کی لکھی ہوئی ہے جس کا مقصد سنسکرت نہ جاننے والے ہندوؤں کو ان کے مذہب سے آگاہ کرنا ہے، اس کا لکھنے والا 'لعل بہاری ولد کاہید سنگھ' ہے جو بھوج پور ضلع شاہجہاں آباد قنوج کا رہنے والا تھا اور اورنگزیب کے درباری امیر اللہ کا متوسل تھا، لعل بہاری نے اس کتاب کے دیباچہ میں عالم گیر کو جن الفاظ اور خلوص وعقیدت سے یاد کیا ہے وہ ہندوؤں کے پڑھنے کے لائق ہے۔ دوسری کتاب 'ردالکفر' ایک نومسلم کی لکھی ہوئی ہے، جس میں ہندوؤں کے عقائد پر تبصرہ ہے۔[2]

اس کے علاوہ مسلم حکمرانوں کے دور میں مسلمانوں نے بھی ہندی زبان کے فروغ میں کافی حصہ لیا، چنانچہ عثمان کی مشہور تصنیف 'چتر اولی' ۱۶۱۳ء میں لکھی گئی، جس میں پد ماوت کے انداز ے کی تمثیلیں اور مسائل ہیں۔ اسی دور میں قصبہ مئو کے شیخ نبی، ہندی کے مشہور شاعر ہوئے، جنھوں نے 'گیان دیپ' کے نام سے ایک اعلی پایہ کی صوفیانہ عشقیہ کہانی لکھی۔ اسی عہد میں نعمت خاں بھی ہندی کا ایک شاعر گزرا ہے اس کی تصانیف کی تعداد ۷۰ تک پہنچتی ہے، جن میں سے ایک کا شمار پریم گاتھاؤں میں کیا جاتا ہے ۱۶۲۰ء میں ایک مسلمان ہندی شاعر طاہر نے ایک کتاب 'کوک سار' لکھی۔ جہاں گیر کے عہد، احمد نے ہندی میں اپنی کتاب 'سامدریکا' لکھی تو

---

[1] بزم تیموریہ، ج ۲، ص ۲۱۱

[2] ایضاً، ج ۳، ص ۸۵-۸۶

اس کی ابتداء 'گنیش' سے کی۔ اسی طرح احمد اللہ کی اپنی تصنیف 'نایکا بھید' میں شری رام جی، سرسوتی اور گنیش جی کے نام ملتے ہیں یعقوب نے 'راشن بھوشن' لکھی تو اس میں 'شری گنیش' سرسوتی، رادھا کرشنن اور گوری شنکر کے فضل اور رحمت کا طالب ہوا ہے۔[1]

شیخ سعد اللہ نے رامائن کو فارسی میں منظوم کیا اور اس کا نام 'رام دستبار' رکھا، صوفی شریف نے 'یوگ وشست' کا خلاصہ فارسی میں 'اطوار در حل اسرار' کے نام سے کیا اور یہ جہانگیر کے نام سے معنون ہوئی۔ عبدالشکور بزمی نے ۱۶۱۷ء میں پدماوت کا ترجمہ فارسی میں کیا۔

متذکرہ سطور کی روشنی میں یہ بات کہنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی زبان اور ان کی لسانی حیثیت کو نہ صرف تسلیم کیا گیا بلکہ ہندی اور سنسکرت زبان میں اس دور میں بڑی بڑی کتابیں تصنیف ہوئیں، اس طرح سے مسلمانوں نے ہندوؤں کی تہذیبی اور دینی نظام کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ بات پوری طرح درست ہے کہ اگر کسی قوم کے دھرم اور اس کے دینی شعار و آداب کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنی ہے تو ضروری ہے کہ اس قوم کی زبان و ادب سے واقفیت حاصل کی جائے۔ کیونکہ کسی بھی قوم کا دینی اور فکری لٹریچر اسی زبان میں ہوتا ہے جو اس قوم کی مادری زبان ہوتی ہے۔ اس تناظر میں جب ہم برادران وطن کو دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کا پورا مذہبی، دینی اور علمی اور فکری سرمایہ سنسکرت زبان میں ہے۔ اور یہ ان کی عام بول چال کی زبان ہے۔ بہر حال ہندوؤں کی زبان سمجھنے، ان کی کتابوں کے تراجم کرانے اور اسی طرح ان کے لسانی ورثے کو بقا فراہم کرنے میں مسلمانوں نے ہر دور اور ہر زمانے میں بلا تعصب و تنگ نظری اور بھید بھاؤ کے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ یاد رکھیے یہ وہ شواہد ہیں جنہیں کبھی بھی صفحہ تاریخ سے نابود نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قوموں کی تہذیب اور ان کا فلسفہ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قومیں اسی وقت پوری حیثیت کے ساتھ زندہ رہتی ہیں جب کہ ان کی زبان کو محفوظ رکھا جائے، لہٰذا مسلم حکمرانوں نے ہندوؤں کی زبان کو اسی لیے بھی زندہ رکھا تا کہ وہ اپنی پوری روایات و عادات اور تہذیبی و مذہبی نظام کے ساتھ رہ سکیں۔ جب کہ دوسری طرف اس معاملے میں مسلمانوں کے ساتھ سوتیلا سلوک ہوتا ہے

[1] بزم تیموریہ، ج ۳، ص: ۱۴۵-۱۴۶

اور اردو کو مسلمانوں سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔ جب کہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی زبان ہے۔ اسی لیے جو لوگ اس معاملے میں کسی بھی طرح کے تعصب اور امتیاز کا شکار ہیں تو انہیں اس حقیقت کو سمجھنا ہوگا، تبھی کوئی درست فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

مسلم حکمرانوں کی دیگر ادیان کے اہل علم سے ملاقاتیں:

یہ بات سو فیصد درست ہے کہ کسی بھی مذہب کی جانکاری کے لیے ضروری ہے کہ اس قوم کے مذہبی اور اہل علم افراد سے ملاقاتیں کی جائیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب متضاد یا مختلف افکار کے لوگ آپس میں ملتے ہیں تو یقیناً بہت سارے مسائل کا حل خود بخود نکل آتا ہے۔ نیز دوسرے مکتب فکر اور دبستان فکر کی صحیح باتیں آسانی سے پتہ چل جاتی ہیں۔ اس حوالے سے اگر ہم ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی سیرت وسوانح کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے بلا تعصب ہر مذہب اور فکر کے لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ عبدالقادر بدایونی نے اس سلسلے میں بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ بدایونی نے لکھا ہے کہ اکبر نے تقریباً تمام ادیان کے علماء سے ملاقاتیں کی ہیں۔

> ''سب سے پہلے اکبر نے ''پرکھوتم'' نامی برہمن کو جو ''نامہ خرد وافزا'' کی ترجمانی پر مقرر تھا تنہائی میں بلا کر موجودات اور اشیاء کے ہندی اسماء معلوم کیے۔ اس کے بعد دیوی برہمن خلوت شاہی میں حاضر ہوا۔ دیوی برہمن سے مذاکرات کے لیے ایک خاص انتظام کیا گیا تھا ایک چارپائی کو رسیوں سے اوپر کھینچ کر بادشاہ کی خواب گاہ کے جھروکے برابر لگا دیا جاتا تھا اور وہ راتوں میں اس معلق حالت میں بیٹھا ہوا اپنے دیومالائی قصے سنایا کرتا تھا دیوی برہمن ان مترجمین میں ملازم تھا جو بھارت پر کام کر رہے تھے۔ ان نشستوں میں اس نے بادشاہ کو ہندو مذہب کے اسرار بت پرستی کے طریقے، آگ اور آفتاب کی پوجا اور ستاروں کی تعظیم کے رموز بتائے۔ اور مشرک بادشاہوں اور خیالی دیوتاؤں جیسے برہما، مہادیو، بشن، کشن، رام اور مہامائی (جن میں سے بعض کو ہندو خدا اور بعض کو فرشتہ کہتے ہیں) کی عظمت واحترام پر دلیل پیش کی''۔[1]

[1] منتخب التواریخ، ج ۲، ۲۰۴

اسی زمانے میں دربار میں عیسائیوں کی بھی آمد و رفت ہونے لگی تھی۔ یورپ کے اہل علم کو پادری کہا جاتا ہے اور ان کے مجتہد کامل کو ''پاپا'' کہتے ہیں۔ جسے مصلحت اور وقت کے لحاظ سے امور دینی میں تغیر و تبدل کا اختیار حاصل رہتا ہے اور بادشاہ وقت بھی اس سے روگردانی نہیں کرسکتا۔ جب عیسائی پادری بھی بادشاہ کی عنایت کی نظر سے نوازے گئے تو انھوں نے انجیل پیش کی اور عقیدۂ تثلیث کے حق ہونے پر مباحثے کیے۔ اکبر نے ان کی عیسائیت کی تصدیق کی اور عیسائی مذہب کو پھیلانے کی ہمت افزائی کی۔ حسب الحکم شہزادہ مراد نے عیسائی پادری سے انجیل کے چند سبق پڑھے۔ شیخ ابوالفضل کو انجیل کے ترجمے کے لیے حکم دیا گیا۔ اس نے ترجمہ شروع کیا تو اس پر بسم اللہ کے بجائے یہ فقرہ لکھا ''ایک نامی وی ژژو کرستو'' فیضی نے قافیہ پر ردیف چڑھائی اور دوسرا مصرعہ کہا سبحانک کالاسواک یاہو۔[1]

اسی طرح دربار میں گجرات کے شہر نوساری سے آتش پرستوں کا بھی ایک گروہ دینی خراج لینے کے لیے پہنچ گیا۔ انھوں نے زردشت کے دین کو حق بنا کر پیش کیا اور آگ کی تعظیم کو سب سے بڑی عبادت بتلایا۔ گیانی بادشاہوں کی راہ روشن کے قصے بیان کرکے اکبر کو اپنے معتقدات کی طرف جھکا لیا۔ چنانچہ اکبر نے حکم دیا کہ سلاطین عجم کی طرح جو اپنے آتش کدے کو ہمیشہ دہکتا ہوا رکھتے ہیں۔ ہمارے محل میں بھی شب و روز آگ جلتی رہنی چاہیے۔[2]

ان تمام تفصیلات کو بدایونی نے لکھا ہے۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اکبر کے یہاں ہندوانہ رسوم پر عمل کیوں ہوتا تھا؟ اسی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ اکبر حد سے زیادہ روادار رہا ہو۔ جو اسلامی نقطہ نظر سے مطلوب و محبوب نہیں، ہمارا مقصد یہ ہے کہ مسلم حکمراں ہندوؤں کے مقتدا اور دیگر ادیان کے پیشواؤں سے ملاقات کرتے تھے اور ان سے ان کے مذہب کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اسی طرح نورالدین جہانگیر کے متعلق 'تزک جہانگیری' کے مصنف نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ جب وہ ہندوؤں کی مقدس مقام اجین گیا تو اس نے ایک سنیاسی سے ملاقات کی۔

---

[1] منتخب التواریخ، ج ۲، ۲۰۷

[2] ایضاً، ص ۲۰۸

''میں نے بارہا سنا تھا کہ جدروپ نامی ایک سنیاسی اوجین کے پاس جنگل میں مدت سے عبادت وریاضت میں مشغول ہے، اس لیے مجھے اس کو دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا، جن دنوں میں دارالحکومت آگرہ میں قیام پذیر تھا اسے اپنے پاس طلب کرنا چاہتا تھا، مگر سنیاسی کی ناراضگی کے پیش نظر طلب نہ کیا، اس مسافت میں جب میں اجین کے قریب پہنچا تو اس سے ملنے کے لیے پاپیادہ گیا، اس نے اپنی رہائش پہاڑ کے ایک غار میں بنائی ہوئی ہے۔ اس کا دروازہ اتنا تنگ ہے کہ ایک دبلا پتلا آدمی مشکل تمام اس میں سے گزر سکتا ہے۔ وہ اس گھر میں بغیر کسی بستر اور چٹائی کے شدید سردی میں صرف ایک لنگوٹی میں دن بسر کرتا ہے اور کبھی آگ نہیں جلاتا ہے۔ اس کے غار کے پاس ایک دریا ہے جس میں وہ دن میں دو مرتبہ نہاتا ہے، روزانہ ایک مرتبہ اجین شہر میں اپنے منتخب معتقدوں کے گھر جاتا ہے اور ان میں سے دو تین کے یہاں سے بھیک کے طور پر پانچ لقمے مانگ کر اپنی ہتھیلی پر رکھ کر کھالیتا ہے۔ وہ لقمے بجائے چبانے کے نگل جاتا ہے، تاکہ اس کے ذائقے سے محروم رہے۔ اگر ان معتقدوں کے کسی گھر میں وضع حمل ہوا ہے، یا اس گھرانے پر کوئی مصیبت آپڑی ہو، یا کوئی عورت حائضہ ہو، تو اس گھر سے نہیں مانگتا۔ وہ خود کسی سے نہیں ملتا جلتا لیکن اپنی شہرت کی بناء پر لوگ اس سے ملنے کے لیے کثرت سے آتے ہیں۔ اس سنیاسی سے میری ملاقات چھ گھڑی (دو گھنٹے اور چوبیس منٹ کے برابر) تک ملا اس کی باتوں کا میرے دل پر بہت اثر ہوا''۔[1]

ان روایات سے جو پیغام ملتا ہے اس کی اس وقت بہت ضرورت ہے۔ یاد رکھیے ہندوستان جیسی سرزمین جو تعدد اور رنگارنگی کے لیے جانی جاتی ہے اور کثرت میں وحدت جیسی صفت ہمارے ملک کی کوئی آج سے نہیں ہے بلکہ صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ نورالدین جہانگیر کا ایک سنیاسی کی خدمت میں حاضر ہونا اس کی ایک مثال ہے۔ البتہ آج اس بات کی سخت

[1] جہاں گیر نورالدین (بادشاہ) مترجم سید احمد علی رام پوری، مکتبہ الحسنات، دہلی، ۲۰۰۱، ص ۲۰۶-۲۰۷

ضرورت ہے کہ ہمارے اکابر نے جو ورثہ ہمارے لیے چھوڑا ہے اس کو ہم آگے بڑھائیں۔ کوئی بھی معاشرہ بہت دنوں تک نفرت وعداوت جیسی بیماری کا تحمل نہیں کرسکتا ہے۔ اس لیے نفرت کا خاتمہ کرنا ہوگا اور اس کے لیے مطالعۂ ادیان و مذاہب ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جو ہمارے درمیان رشتۂ اتحاد کو مضبوط و مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ سماجی اعتبار سے بھی ان مشترک اقدار پر عمل کیا جائے جن سے معاشرے کا امن قائم ودائم رہے۔

مسلم حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کے دینی پروگرام:

ہندوستان چونکہ دینی تنوع اور کثرت ادیان کی آماجگاہ ہے اس لیے یہاں ہر مذہب کے ماننے والے اپنے اپنے دین دھرم کے اعتبار سے تہوار مناتے رہے ہیں۔ یہ تہوار کسی بھی قوم کا ہو اور اس کا طریقہ کار کوئی بھی ہو اس کے لیے بڑا عزیز ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اگر کوئی مخلوط معاشرہ ہو تو پھر تہوار میں رنگا رنگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ بہر حال دوسرے مذہب کو سمجھنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے دینی و مذہبی تہوار کو سمجھا جائے۔ اس معاملے میں ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے بڑی وسعت اور فکری رواداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہندوؤں کے تہوار کے متعلق بہت سارے مسلمانوں نے لکھا ہے۔ لیکن ان میں دو نام بڑے نمایاں ہیں، ایک ابوالفضل اور دوسرا نام ابوریحان البیرونی کا۔ مسلم حکومتوں میں جب باہم دونوں قوموں کا میل جول بڑھتا گیا تو پھر ایک دوسرے کے مذہبی تہوار میں دلچسپی پیدا ہوتی گئی۔

ہولی: ہندوؤں کا ایک بڑا تہوار ہے اس کے متعلق سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ہے:

> اکبر اور جہانگیر کے محل میں راجپوت شہزادیاں آتیں تو ان کے ساتھ ہندو کنیزیں اور سہیلیاں بھی ہوتی تھیں، اس لیے شاہی محل میں وہ ہولی کھیلتیں۔ ان کے ساتھ اکبر اور جہانگیر بھی ہولی کھیلتے۔ چڑ پٹی لندن کے مجموعہ میں ایک ایسی تصویر محفوظ ہے، اس میں جہانگیر اپنے محل کے اندر بیگمات اور شہزادیوں کے ساتھ ہولی کھیلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کنیزیں گا بجا رہی ہیں، لیکن بیگمات اور

شہزادیاں پچکاری بھر بھر کر ایک دوسرے پر رنگ پھینک رہی ہیں۔ اُردو کے معروف شاعر میر تقی میر (۱۷۱۳-۱۸۱۰) نے جو اشعار کہے ہیں وہ ہندوؤں کے تہوار ہولی کی بڑی شاندار ترجمانی کرتے ہیں۔

پھر لبا لب ہیں آ ب گیر رنگ
اور اڑے ہے گلال کس کس ڈھنگ
پاس آتے ہیں مرغ گلشن پھول
تھے وہ دلیر گلاب کے سے پھول
پگڑیاں جامہ بھیگی سو سو ہیں
ان کو گلہائے ترکہیں تو ہیں
جھڑیاں پھولوں کی دلیروں کے ہاتھ
سیکڑوں پھولوں کی چھڑی ہے ساتھ
قمقمے جو گلال کے مارے
مہوشاں لالہ رخ ہوئے سارے
خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں
گل کی پٹی ملا اڑاتے ہیں
جشن نو روز نہو ہولی ہے
راگ رنگ اور پول ٹھول ہے[1]

دیوالی: صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں کہ دیوالی اکبر اور جہانگیر کے عہد میں بھی منائی جاتی تھی۔ اس کا اندازہ بہادر شاہ کے عہد کی اس قلمی تصویر سے ہوگا جس کو منشی فیض الدین دہلوی نے اپنی کتاب بزم آخر میں پیش کیا ہے:

"آج پہلا دیا ہے دیکھ محل میں سب کی آمد و رفت بند ہوگئی، ستفنیاں، دھوبنیں، مالنیں، کہاریاں، حلال خوریاں تین دن تک محل کے باہر نہ نکلنے پائیں گی اور نہ

[1] مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص ۴۰۷

کوئی ثابت ترکاریاں محل میں آنے پائیں گی، بیگن، مولی کدو، گاجر وغیرہ اگر کسی نے منگائی تو باہر سے ترشی ہوئی آئی، اس لیے کہ کوئی جادو نہ کرے تیسرے دیے کو دیکھو۔ آج بادشاہ سونے چاندی میں تلیں گے۔ ایک بڑی سی ترازو کھڑی ہوئی، ایک طرف پلڑے میں بادشاہ بیٹھے، دوسری طرف چاندی سونا نقد وغیرہ بادشاہ کے برابر تول کے محتاجوں میں بانٹ دیا۔ قلعے کے برجوں کی روشنی کا حکم ہوا، کھیلیں، بتاشے، کھانڈ اور مٹی کے کھلونے کہار کی سر پر رکھے، جسولنیاں ان کے ساتھ گھر گھر بانٹتی پھرتی ہیں، نوبت روشن چوک اور باجا بجنے لگا، چاروں کونوں میں ایک گنا کھڑا کیا۔ نیبوں میں ڈورے ڈال کران میں لٹکا دیے، صبح کو وہ گئے اور نیبو حلال خوری کو دے دیے، رتھ بان بیلوں کو بنا سنوار پاؤں میں مہندی لگا رنگ برنگ کی اس پر نقاشی کر کے سینگوں پر قلعی اور سنگوڑیاں، ہاتھوں پر کار چوبی پٹے اور سنگھ گلوں میں گھنگھرو اور کار چوبی بانا تی، جھولیں پڑی ہوئی، چھم چھم کرتے ہوئے چلے آتے ہیں، بیلوں کو دکھا انعام واکرام لے اپنے کارخانوں میں آئے دیوالی ہو چکی''۔[1]

البتہ عام مسلمانوں نے دیوالی کو کیسے دیکھا اس کا اندازہ نظیر اکبرآبادی (۱۷۴۰-۱۸۳۰) کی نظموں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

ہر ایک مکان میں جلا پھر دیا دیوالی کا
ہر اک طرف کو اجالا ہوا دیوالی کا
سبھی کے دل میں سماں بھا گیا دیوالی کا
کسی کے دل کو مزہ خوش لگا دیوالی کا
عجیب پیار کا ہے دن بنا دیوالی کا

دسہرہ: اکبر اور جہانگیر کے دربار میں بھی دسہرہ کا جشن منایا جاتا اور دستور کے مطابق گھوڑوں اور ہاتھیوں کی آرائش کی جاتی ہے اور ان کے سامنے پیش کیے جاتے اور انعامات تقسیم

[1] منشی فیض الدین دہلوی، بزم آخر، اردو ترجمہ، اُردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۲، ص ۸۴-۸۵

کیے جاتے۔ یہ تہوار روایتی طور پر عالمگیر کے دربار میں بھی منایا جاتا۔[1] البتہ بہادر شاہ کے دربار میں اس تہوار کا جشن درج ذیل طریقے کے مطابق منایا جاتا تھا۔

''دسہرہ کے دن بادشاہ نے دربار کیا۔ دیکھو پہلے ایک نیل کنٹھ بادشاہ کے سامنے اڑایا۔ باز خانے کا داروغہ باز اور شکرا لے کر آیا۔ بادشاہ نے باز کو لے کر ہاتھ پر بٹھایا اور دربار برخاست ہوا۔ تیسرے پہر کو اصطبل خاص گھوڑوں کو مہندی سے رنگ رنگا، رنگ برنگ کی ان پر نقاشی کر کے لایا۔ بادشاہ نے گھوڑوں کا ملاحظہ کیا، داروغہ کو انعام دے کر رخصت کیا''۔[2]

رکھشا بندھن: اکبر اس تہوار کو اپنے دربار میں خاص طور پر مناتا، امراء اس کے ہاتھ پر جواہرات کی ڈوری باندھا کرتے تھے۔ جہانگیر نے بھی اس رسم کو اپنے دربار میں قائم رکھا وہ اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ ساون میں جب آفتاب برج سرطان میں ہو جاتا ہے تو برہمن دریا اور تالاب کے کنارے جاتے ہیں، افسوس پڑھتے ہیں، ڈوریوں اور دھاگوں پر دم دیتے ہیں اور ان کو دوسرے دن راجاؤں کے ہاتھوں پر باندھتے ہیں اور یہ مبارک چیز سمجھی جاتی ہے، دھاگے کو راکھی یعنی نگاہ داشت کہتے ہیں۔ میرے والد کے ہاتھوں پر ہندو امراء جو راکھی باندھتے تھے، ان میں لعل، موتی اور دوسرے بیش قیمتی جواہرات بھی ہوتے اور جب اس کے تکلفات حد سے زیادہ ہونے لگے تو میرے والد نے صرف ریشمی دھاگے باندھنے کا حکم دیا۔ میرے زمانے میں امراء نے پہلے تکلف کو راہ دیا لیکن پھر میں نے حکم دیا کہ وہ میرے ہاتھ میں صرف ریشمی دھاگے باندھیں۔[3]

بسنت: ابوالفضل نے اپنی معروف کتاب 'آئین اکبری' میں لکھا ہے کہ ماگھ کے مہینے میں تیسری، چوتھی، پانچویں اور ساتویں تاریخ کو چار تہوار مناتے ہیں۔ پانچویں تاریخ کو بسنت کا بڑا جشن ہوتا ہے، اس روز رنگ اور عبیر ایک دوسرے پر چھڑک کے جاتے ہیں اور گاتے ہیں۔ یہ ہندوستان میں موسم بہار کی ابتدا ہے۔ اگرچہ آج کل کے لوگ پانچویں کو تہوار مناتے

---

[1] مسلم حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص ۴۰۳

[2] بزم آخر، ص ۸۳

[3] تزک جہاں گیری، اُردو ترجمہ، ص ۱۴۰

ہیں مگر پہلے زمانے میں ساتویں کو یہ تہوار منایا جاتا تھا۔[1]

سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ہے کہ مسلمانوں میں بھی بسنت کا تہوار منایا گیا اور اس کی ابتدا اس طرح ہوئی:

''حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے محبوب بھانجے مولانا تقی الدین نوح کا عین شباب میں انتقال ہوگیا، حضرت خواجہ کو اس سے بڑا صدمہ پہنچا، چھ مہینے تک مہر سکوت طاری رہی، اس کی وجہ سے امیر خسرو بھی مغموم رہتے تھے اور برابر اس فکر میں رہتے تھے کہ مرشد کا غم دور ہو، بسنت کا میلہ تھا، ہندو دہلی میں کالکا جی کے مندر پر سرسوں کے پھول چڑھا رہے تھے اور مست ہو کر ترانے الاپ رہے تھے، خسرو بھی اس کو دیکھ کر بے خود ہو گئے، فارسی اور ہندی کے چند اشعار اسی وقت پڑھے۔ سرسوں کے پھول توڑے اور پگڑی کو کج کر کے مستانہ شان پیدا کی اور جھومتے جھامتے اشعار پڑھتے حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اس وقت اپنے بھانجے کے مزار پر تھے، امیر خسرو کی مستانہ ادا دیکھ کر اور ان کے اشعار سن کر تبسم فرمایا، تو امیر خسرو کا کام بن گیا، اس روز سے دہلی میں جب ہندو کالکا جی کے مندر پر جاتے تو دہلی اور قرب وجوار کے صوفیہ قوالوں کو لے کر سرسوں کے پھول ہاتھ میں لیے اشعار پڑھتے ہوئے مولانا تقی الدین کے مزار پر جاتے ہیں۔ وہاں سے حضرت خواجہ کے مزار اقدس پر آتے ہیں۔ ان اشعار میں ایک شعر یہ ہے:

اشک ریز آمد است ابر بہار
ساقیا گل ریز وبادہ بیار

ہندی کا ایک مصرع یہ پڑھا جاتا ہے:

عرب یار توری بسنت منائی

رفتہ رفتہ دہلی کی درگاہوں میں پندرہ دن تک بسنت کا میلا رہنے لگا، پھر اور

[1] ابوالفضل، آئین اکبری، مترجم مولوی محمد فدا علی، جامعہ عثمانیہ سرکار عالی، حیدرآباد دکن، ۱۹۳۹ء، ج ۲، ص ۲۹۳

دوسری جگہوں میں بھی مسلمان بسنت منانے لگے، جس میں حلوہ پوری پکواتے اور عورتیں بسنتی لباس پہن کر بسنتی گیت گاتی''۔[1]

اس کے علاوہ بھی اردو شاعری میں بہت سا ذخیرہ ملتا ہے جو بسنت کے تعلق سے ہے۔ مثلاً امانت لکھنوی (۱۸۱۵-۱۸۵۸ء) نے کہا ہے:

کیا فصل بہاری نے شگوفے ہیں کھلائے
معشوق ہیں پھرتے سر بازار بسنتی
گیندا ہے کھلا باغ میں میدان میں سرسوں
صحرا وہ بسنتی ہے یہ گل زار بسنتی
گیندوں کے درختوں میں نمایاں نہیں گیندے
ہر شاخ کے سر پر ہے یہ دستار بسنتی
منہ زرد دوپٹے کے نہ آنچل سے چھپاؤ
ہو جائے نہ رنگت گل رخسا بسنتی
ہے لطف حسینوں کی دورنگی کا امانت
دوچار گلابی ہوں تو درچار بسنتی

اسی طرح انشاء اللہ خان انشاء (۱۷۵۲-۱۸۱۷) نے بسنت کے حوالے سے جو غزل لکھی ہے وہ بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

شیوراتری: یہ ماگھ کے مہینے کا تہوار تھا، جب کہ شیو جی کی پوجا تمام رات ہوتی ہے۔ رات بھر ہندو پوجا کرتے ہیں اور جاگتے رہتے ہیں۔ سوتے نہیں اور بت پر خوشبو اور پھول چڑھاتے ہیں، عورتیں پھل اور پھول لے کر شیو جی کو بھینٹ چڑھاتی ہیں۔ شیو جی کی مورتی کو صندل اور عود سے دھوکر دل کی مرادوں کے برآنے کی دعائیں مانگتی ہیں۔ عوام آتش بازی چھوڑتے ہیں۔ اکبر بھی یہ رات ہندو جوگیوں کے ساتھ گزارتا تھا جو اس کے لیے درازی عمر کی دعائیں کرتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمان شب برات جس طرح مناتے ہیں، اس میں شیوراتری

[1] مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص ۴۰۵-۴۰۶

کی بھی بڑی حد تک نقل ہوتی ہے۔[1]

یہ تصویر ان مسلم حکمرانوں کے کردار اور اعمال و افعال کی ہے۔ جن کے متعلق عام طور سے یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے دور اقتدار میں ہندوؤں کے ساتھ زیادتی کی، یعنی زور زبردستی مسلمان بنایا، جب کہ حقیقت اور صداقت اس منفی اور جانب دار رویے کے بالکل برعکس ہے۔ متذکرہ سطور کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے ایسا سماج تشکیل و ترتیب دیا تھا جس میں تمام ادیان کے متبعین کے مذہبی و دینی تہوار بھی بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے، یہی نہیں بلکہ مسلم امراء و سلاطین ان تہواروں میں خود شرکت کرتے تھے۔ یہ ہے ہمارا ہندوستان اور اس کی حقیقی روح۔ گویا یہاں حکومت و اقتدار کسی کے بھی ہاتھوں میں رہا ہو، مگر یہاں کی تہذیب اور کلچر کو کسی نے بھی خرد برد نہیں کیا۔ مذکورہ باتیں شرعی نقطہ نظر سے غلط ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس کی معنویت کی اور یہاں بیان کرنے کی کئی وجوہات ہیں، ایک تو یہ کہ آج دانستہ طور پر کچھ لوگ سماج کی ہم آہنگی اور یہاں کی مشترکہ اقدار کو انہیں بزرگوں کا نام لے کر پامال کر رہے ہیں۔ ان پر طرح طرح کے اعتراضات عائد ہو رہے ہیں۔ اس لیے یقیناً اس طرح کی باتیں ماحول میں نرمی اور باہم شکایت غلط فہمیوں کو دور کرنے میں بنیادی کردار ادا کریں گی۔ ایک بار پھر ضرورت ہے کہ ہم تاریخ کے ان گوشوں کو اجاگر کریں جو سماج کو انسانیت کا مونس و غم خوار بنا سکیں۔

ہندومت کے متعلق مسلمانوں کی آراء:

یہ ایک ناقابل تردید صداقت ہے کہ ہندوازم ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر تہذیب اور مذہب کے متعلق مسلمانوں کی آراء نہایت متوازن اور معتدل رہی ہیں۔ یہ بڑا سخت مسئلہ ہوتا ہے کہ انسان دوسرے مذہب و دین کا پیروکار ہو اور اسے یہ بھی پتہ ہو کہ دوسرے افکار و نظریات یا ادیان میرے دین و دھرم کے متضاد ہیں۔ اس کے باوجود دوسرے فکر و نظریہ کی تعریف و توصیف کرنا، اس کے متعلق معتدل رویہ اپنانا بڑا جگر کا کام ہے۔ اس حوالے سے مسلمانوں کے

---

[1] مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص ۴۰۷-۴۰۸

اقدامات نہایت قابل ذکر اور لائقِ ستائش ہیں۔ چنانچہ دوسرے ادیان کی تاریخ وتہذیب کو سمجھنے اور ان سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے مسلمان علماء کی ایک بڑی تعداد نے سنسکرت، عبرانی، ہندی اور دیگر زبانیں سیکھیں۔

مولانا عنایت رسول چریاکوٹی (پ ۱۳۶۶ھ) جب کلکتہ میں عبرانی زبان سیکھنے کے لیے پہنچے تو جو یہودی وہاں موجود تھا اس نے عبرانی زبان سکھانے سے انکار کر دیا۔ پھر آپ نے ایک عیسائی سے استفادہ کیا، اس نے عذر کیا کہ میں اردو سے پوری طرح واقف نہیں ہوں، اس لیے آپ اتنی انگریزی سیکھ لیجیے کہ میں اس کی وساطت سے آپ کو عبرانی کی تعلیم دے سکوں۔ چنانچہ آپ کے شوق نے اس منزل کو بھی طے کیا اور آپ نے تھوڑے ہی دنوں میں اتنی انگریزی سیکھ لی کی معلم اور متعلم کے درمیان شرکت ہو سکے۔ اس سلسلے میں آپ نے یونانی زبان بھی سیکھی۔ اس وجہ سے کہ انجیل مقدس یونانی زبان میں ہے۔ اسی اثناء نصرانی نے آپ کو عبرانی زبان سکھانے سے انکار کر دیا۔ اس دوران آپ نے مختلف یہودیوں کے دروازے کھٹکھٹائے۔ اخیر میں ایک مستعد ہوا اور اس نے آپ کو عبرانی کی تعلیم دی۔ تین سال میں آپ نے عبرانی پر عبور حاصل کر لیا۔ اس بیچ آپ نے کلدانی زبان بھی سیکھی۔[1]

مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ حبر و (عبرانی) زبان میں مولانا کو جو دستگاہ حاصل تھی اس کا اندازہ ان کی کتاب 'بشریٰ' اور اس رسالہ سے ہو سکتا ہے جو حضرت ہاجرہ ام اسماعیل علیہ السلام کے متعلق آپ نے عبرانی حوالوں سے مرتب فرمایا تھا، سرسید احمد خان نے اپنی مشہور کتاب 'خطبات احمدیہ' کا جز بنا کر اسے شائع کیا ہے۔ ان کے علاوہ قاضی غلام مخدوم چڑیاکوٹی نے بنارس جا کر سنسکرت زبان حاصل کی۔ مولانا نصرت علی خان دہلوی نے علوم رسمی سے فراغت حاصل کرنے بعد فارسی، عربی، ترکی، انگریزی اور ہندی زبان میں مہارت پیدا کی۔ انھیں کے والد مولانا ناصر الدین جو عیسائیوں سے سب سے زیادہ مناظرہ کرنے والے تھے، انھوں نے بھی تورات انجیل ایرانی اور یونانی زبان میں پڑھی تھی۔ مولوی نجف علی جھجھر

[1] چریاکوٹی، عنایت رسول عباسی، ب (مولانا) بشری، ترجمہ اردو، ص ۲۰

کے رہنے والے نواب ٹونک محمد علی خان کے دربار کے مولوی تھے، انھوں نے عربی فارسی اردو کے سوا پاژندی زبان سیکھی انھوں نے پارسیوں کی مذہبی کتاب 'دساتیر' کی ایک شرح 'ویمز' نامی پاژندی زبان میں اور 'کرمان سفرنگ' دری زبان میں لکھی تھی۔

اسی طرح شاہ عبدالعزیز (۱۷۴۶-۱۸۲۳) نے عبرانی (حبرو) زبان سیکھی، ہوا یوں کہ ایک مرتبہ عبرانی زبان جاننے والا کوئی شاہ صاحب کے زمانے میں دلی آ گیا تھا۔ عمر کافی ہو چکی تھی اس کے باوجود شاہ صاحب نے براہ راست عبرانی زبان ہی میں تورات اس فاضل سے پڑھی تھی۔[1]

یہ شواہد اشارہ کرتے ہیں کہ مسلمان علماء کی وسعت ظرفی، کشادہ فہمی اور وسعت فکر و نظر کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ نیز ہمارے اکابر کی توسع، رواداری اور عدم تعصب کی وہ مثالیں ہیں جن سے ہمیں جلا ملتی ہے۔ آج بھی اسی سوچ اور فکر کے ساتھ آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے علماء نے اپنے دین اور دھرم کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے ادیان و مذاہب کو سمجھنے اور سمجھنے کے لیے ان کی زبان کو بھی سیکھا۔ اس کا دوسرا پہلو دھرم کے متعلق ہے۔ یعنی مسلمانوں نے ہندوازم کے متعلق رواداری اور وسعت ظرفی کا مظاہرہ کیا سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ہے:

''چشتیہ سلسلہ کی روادارانہ تعلیمات کی روشن مثالیں حضرت امیر خسرو اور امیر حسن سجزی کے یہاں ملتی ہیں۔ دونوں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے حلقہ بیعت میں داخل تھے، ان دونوں امیر خسرو اور امیر حسن سجزی کی تحریروں میں نیک نیتی، فراخ دلی، وسیع المشربی اور کشادہ ذہنی کا درس ملتا ہے۔ امیر خسرو ہی کی روایت ہے کہ ایک مسلمان حج کے لیے مکہ معظّمہ جا رہا تھا کہ راستے میں ایک برہمن ملا جو سومناتھ جا رہا تھا، یہ برہمن اپنے عقیدہ کی شدت میں زمین پر لیٹ لیٹ کر کرنا پتا جاتا، حاجی نے برہمن سے پوچھا دوست تم کہاں جا رہے ہو، برہمن نے کہا میں تو کئی سال سے اسی طرح سفر کر رہا ہوں، حاجی نے کہا خدا نے تم کو دو پاؤں دیے

[1] دیکھیے تفصیل، گیلانی، مناظر احسن (مولانا) پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، مکتبہ رحمانیہ اُردو بازار لاہور، ج ۲، ص ۳۷-۴۱

ہیں، تو چلنے کے بجائے اپنے سینہ کے بل کیوں رینگ رہے ہوں۔

اسی طرح امیر خسرو لکھتے ہیں کہ ہندو بت پرستوں پر طنز کیا جاتا ہے، لیکن ان کے عقیدہ میں جو اخلاص ہے اس سے سبق لیا جاسکتا ہے۔ اسی کو اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

اے کہ ز بت طعنہ ہندو پری
ہم زوے آمد ز پرستش گری[1]

سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے امیر خسرو کی مثنوی دیول رانی خان کے حوالے سے لکھا ہے:

''ایک آتش پرست ہندو سے سوال کیا کہ وہ آگ کی پرستش کیوں کرتا ہے اور اس کے لیے کیوں جان دیتا ہے، اس نے جواب دیا کے آگ کو دیکھ کر امید وصل فروزاں رہتی ہے، اور آگ میں فنا ہوکر بقا حاصل ہوتی ہے۔ امیر خسرو نے آگ کی پرستش کی تو نہیں لیکن اس آتش پرست کے جذبے کی قدر کرنے کا مشورہ دیا''۔

اسی طرح امیر خسرو کی رواداری کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے:

''امیر خسرو کا اپنا مذہب تو اسلام تھا، اس لیے ہندو مذہب کو اس پر کسی طرح کی ترجیح دینا پسند نہ کرتے، لیکن اپنے ہم وطن بھائیوں کی دل جوئی اور دل داری کی خاطر ان کے مذہب کو دنیا کے تمام مذاہب سے بہتر سمجھنے کے لیے تیار ہوگئے۔ ہندو مذہب کو اپنے دلائل شنویہ، عیسائیت، قوم مجسم، ستارہ پرست، قوم شبہ اور پارسی سے بہتر قرار دیا ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہندو پتھر، جانور، آفتاب اور درخت کو ضرور پوجتے ہیں لیکن ان کی پرستش میں اخلاص ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں، اس کی اطاعت کے منکر ہیں، ان چیزوں کی پوجا اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے آباء واجداد ان کی پوجا کرتے

[1] ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ج ا، ص ۱۱۸-۱۱۹

آئے ہیں''۔[1]

امیر خسرو ہندوؤں کے تصور وحدانیت کے بھی قائل ہیں۔ وہ خدا تعالی کی وحدت، اس کی ہستی کے معترف ہیں۔ اس کی قدرت ایجاد اور اس کے رازق، خالق، فاعل، مختار اور عالم جز وکل کے قائل ہیں۔[2]

حضرت امیر خسرو نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندو مرد اور عورت میں وفا شعاری کا جذبہ ہوتا ہے۔ اس سے بھی امیر خسرو متاثر ہوئے۔ کہتے ہیں کہ ہندو اپنی وفاداری میں تلوار اور آگ سے اپنی آگ دے سکتا ہے اور ایک ہندو عورت اپنے شوہر کی خاطر جل کر راکھ ہو جاتی ہے، ہندو مرد اپنے بت اور مالک کے لیے اپنی جان بھینٹ چڑھا دیتا ہے، اسلام نے ان چیزوں کو روا نہیں رکھا، لیکن یہ بڑی کارگزاری ہے، اگر ہماری شریعت میں اس کی اجازت ہو تو بہت سے لوگ اس سعادت کو حاصل کرنے میں اپنی جانیں قربان کر دیں۔ اس حوالے سے ان کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

گرچہ در اسلام روا نیست چنیں
لیک چو بس کار بزرگ بہ بیں
گر بہ شریعت بود ایں نوع روا
جان بدہند اہل سعادت سوا

امیر خسرو ہندوؤں کی ہر چیز کو محبوب سمجھتے ہیں لکھتے ہیں ان کی دانشور، معانی ہندوستانی انداز سے باہر ہے، یونان حکمت میں مشہور ہے لیکن ہندوستان اس میں بھی آگے ہے۔ یہاں منطق بھی ہے اور نجوم وعلم کلام بھی، البتہ ہندو فقہ سے واقف نہیں، لیکن وہ طبعیات، ریاضیات اور ہیئت کے ماہر ہیں۔[3]

مذہبی رواداری کی ایک اچھی مثال بنگال کے ایک حاکم کے یہاں ملتی ہے۔ جس کو عبد

---

[1] ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ج ۱، ص ۱۱۹

[2] سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۲، ص ۲۹

[3] ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ج ۱، ص ۱۲۰

القدوس گنگوہی نے شیخ احمد عبدالحق کے ملفوظات کے سلسلے میں بیان کیا ہے۔

شیخ احمد عبدالحق راہ سلوک کی منزلیں طے کرنے کے سلسلے میں بنگال جا کر پنڈوہ میں مقیم ہوئے تو اس زمانے میں وہاں کا حاکم ایک رات بھیس بدل کر شہر میں نکلا، ایک جگہ قلندروں کی ایک جماعت کھانا کھا رہی تھی، حاکم ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے اس کو پھٹکارا کہ تم ہمارے کھانے میں نظر لگا رہے ہو، اس نے اپنی غربت کا ذکر کیا تو وہ اور برہم ہوئے اور جب تک اس کو اپنے سامنے سے ہٹا نہ دیا خاموش نہیں ہوئے۔ حاکم وہاں سے ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں کچھ جوگی بھی رہتے تھے، وہ لوگ بھی کھانا کھا رہے تھے، آپس میں برابر تقسیم کرنے لگے، تو ایک حصہ حاکم کو بھی دیا، حاکم نے کہا میں ایک بیگانہ آدمی ہوں، میرے لیے اس کا حصہ کیوں لگاتے ہو، جوگی بولے ہمارا طریقہ یہی ہے، اگر کتا موجود ہوتا ہے تو ہم اس کو بھی برابر کا حصہ دیتے ہیں۔ تم تو آدمی ہو تم کو کیسے نہ دیں، حاکم یہ سن کر بہت متاثر ہوا، صبح کو اس نے حکم دیا کہ سارے قلندر اور درویش شہر بدر کر دیے جائیں۔ جوگی جیسے تھے ویسے رہنے دیے گئے۔ شہر میں ہنگامہ برپا ہوا، شیخ عبدالحق شہر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، وہ حاکم کی ڈیوڑھی پر جا کر بیٹھ گئے، کسی نے ان کو وہاں سے ہٹایا نہیں تو یہ کہہ کر اپنی قیام گاہ پر واپس آ گئے کہ یہ حاکم درویشوں کو نہیں بلکہ بے خبروں کو شہر بدر کرا رہا ہے۔[1]

امیر حسن دہلوی (م ۱۳۳۵ء) نے اپنی نظموں میں برادران وطن کے ساتھ اور ان کے مذہب کے متعلق نہایت متوازن اشعار کہے ہیں۔ ایک نظم میں وہ لکھتے ہیں کہ ایک کشتی پر ایک غیر مسلم (گبر) اور ننانوے مسلمان سوار تھے، وہ لکھتے ہیں کہ۔ یکا یک کشتی دریا میں ڈوبنے لگی، مسلمانوں نے کہا کہ ہم تو خدا تعالی کے نور سے آشنا ہیں، لیکن کسی بیگانے کی وجہ سے یہ کشتی ڈوب رہی ہے۔ اس لیے اس گبر کو دریا میں ڈال کر کشتی کو محفوظ کر لینا چاہیے، گبر نے یہ سنا تو نا امید ہو کر ایک آہ کھینچی اور بولا کہ ایک گبر کی بدبختی کی تاثیر سے سے بلا آ رہی ہے اور کشتی ڈوب رہی ہے تو پھر ننانوے مومنوں کی پاکی سے یہ محفوظ کیوں نہیں۔ ان میں ایک دانا بزرگ بھی، گبر کی یہ دردناک بات سن کر متاثر ہوئے اور اپنے ساتھیوں کو نصیحت کی ہر حال میں خداوند کی رضا

[1] چودھری خلیل الرحمٰن، انوار العیون فی اسرار المکنون، (ملفوظات شیخ عبدالحق ردولوی) مجتبائی لکھنو، ص ۳۳-۳۶

اور دست گیری پر بھروسہ کرنا چاہیے، اس کے بعد کشتی سلامت رہی، آخر میں امیر حسن لکھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے ملک بے نیازی میں سراندازی ہی میں سرفرازی ہے اور دوسروں کے فسق پر نظر رکھنا درست نہیں، بہر حال ہمیں خدا سے خیر اور ظلمت کے چراغ کی روشنی میں فضل الٰہی کی امید رکھنی چاہیے۔[1]

خواجہ نظام الدین اولیاء: حضرت خواجہ برہمنوں کی بعض خوبیوں کے معترف رہے ان کے چہیتے خلیفہ امیر حسن نے ان کے ملفوظات کو 'فوائد الفوائد' کے نام سے قلم بند کیا۔

وہ لکھتے ہیں کہ ایک بار ان کو شاہی دربار سے کچھ دنوں تک تنخواہ نہیں ملی جس سے وہ پریشان تھے، حضرت خواجہ کو ان کی پریشانی معلوم ہوئی تو امیر حسن کو یہ حکایت سنائی کہ ایک شہر میں ایک برہمن رہتا تھا، اس کے پاس بڑی دولت تھی لیکن اس شہر کے حاکم نے اس پر جرمانہ کر کے اس کا سارا مال و اسباب ضبط کر لیا۔ جس سے وہ تباہ و برباد ہو گیا ایک روز وہ کہیں جا رہا تھا کہ اس کا ایک دوست راستے میں ملا اس نے برہمن سے پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا اچھا ہے اور خوش ہوں، دوست نے کہا کہ تمہاری دولت تو تم سے لے لی گئی، اب تم خوش کیسے رہ سکتے ہو، برہمن نے جواب دیا میرا جنیو تو میرے پاس ہے زنار من بامنست۔ حضرت خواجہ نے حکایت سنا کر امیر حسن سے کہا 'تم نے سنا' امیر حسن نے جواب دیا، جی ہاں، اس حکایت سے مجھ کو بڑی باطنی تسکین اور تسلی ہوتی ہے۔[2]

اسی طرح شیخ نظام الدین اولیا (۱۲۳۸ء-۱۳۲۵ء) ہندو جوگیوں سے بلا تکلف ملتے اور ان کی باتیں غور سے سنتے 'فوائد الفوائد' کے حوالے سے سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی کتاب 'ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر' میں نقل کیا ہے کہ:

> ''ایک بار اجودھن میں حضرت فرید الدین گنج شکر کے پاس ایک جوگی آیا تو حضرت نظام الدین اولیاء نے اس سے پوچھا کہ تم کون سی روش پیدا کر سکتے ہو

---

[1] عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ج ا، ص ۱۲۳، امیر حسن دہلوی کی یہ نظم ان کے دیوان حسن سجزی دہلوی میں ص ۵۸۱ پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

[2] ایضاً، ص: ۱۲۲-۱۲۳

اور کس چیز پر عمل کرتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا کہ ہمارے علوم یہ بتاتے ہیں کہ انسانی نفس میں دو عالم ہے ایک عالم علوی اور ایک عالم سفلی، سر سے ناف تک عالم علوی ہے اور ناف سے پاؤں تک عالم سفلی ہے۔ عالم علوی میں سچائی، صفائی اور حسن معاملہ ہوتا ہے اور عالمی سفلی میں نگہ داشت، پاکی اور پارسائی ہوتی ہے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء نے جب یہ باتیں سنی تو فرمایا، مرایں سخن او خوش آمد۔ اسی طرح ایک اور جوگی حضرت فرید گنج شکر کی خانقاہ میں آیا تو اس نے بچوں کی پیدائش کے متعلق گفتگو کی۔ جس کو شیخ نظام الدین اولیاء نے بڑے شوق سے سنا اور کہا کہ میں نے تمہاری گفتگو کو سن کر ذہن نشیں کر لیا اور تم بھی میری باتوں کو غور سے سنو''۔[1]

محمد سلیمان تونسی: (م ۱۸۴۹ء) کا نظریہ یہ ہے کہ ہندو اور مسلمانوں میں صلح رکھی جائے:

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام

با مسلمان اللہ اور با برہمن رام رام سے مراد یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں جام شریعت اور دوسرے ہاتھ میں سندان عشق۔ تمام اکابر صوفیاء کا عمل اسی پر رہا اور اس کے ذریعے ہندو مسلم ایک دوسرے سے قریب تر ہو سکتے تھے۔ البتہ کچھ صوفیاء ایسے گزرے ہیں جنھوں نے تسخیر قلوب کی خاطر جام شریعت تو چھوڑ دیا اور صرف سندان عشق لے کر آگے بڑھے۔ کشمیر میں کچھ ایسے صوفی پیدا ہو گئے تھے جو اپنے کو ''رشی'' کہتے، انھوں نے ہندو رشیوں کی طرح یوگ، جپس دم اور دھیان، گیان کے طریقوں کو اپنایا، ہندوستان کے مختلف گوشوں میں کچھ ایسے صوفی تھے کہ جو تصوف اور ویدانت ان کو ایک ہی چیز سمجھتے رہے۔[2]

---

[1] سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستانی سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء، ص ۲۱۴

[2] ایضاً، ص: ۲۱۵

شیخ احمد سرہندی: ان کا نظریہ ہے کہ ہندوستان جیسی سرزمین پر بھی انبیائے کرام مبعوث ہوئے ہیں، انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے:

''گزشتہ امتوں کا ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی جگہ بہت کم ہے جہاں کوئی پیغمبر مبعوث نہ ہوا ہو۔ حتیٰ کہ زمین ہند میں بھی جو اس معاملے سے دور دکھائی دیتی ہے معلوم ہوتا ہے اہل ہند سے پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت فرمائی ہے اور ہندوستان کے بعض شہروں میں محسوس ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے انوار، شرک کے اندھیروں میں مشعلوں کی طرح روشن ہیں۔ اگر ان شہروں کو معین کرنا چاہے تو کرسکتا ہے'' [1]

مرزا مظہر جان جاناں: مرزا مظہر سے ایک مرتبہ سوال کیا گیا کہ کفار ہند بھی مشرکین عرب کی طرح بے اصل دین رکھتے ہیں، یا اس دین کی کوئی اصل تھی۔ جو بعد میں منسوخ ہوگئی اور ان (کفار ہند) کے پیش روؤں کے بارے میں کیا اعتقاد رکھنا چاہیے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے مرزا مظہر جان جاناں نے لکھا:

''جاننا چاہیے کہ اہل ہند کی پرانی کتابوں سے جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ نوع انسانی کی پیدائش کے آغاز میں رحمت الٰہی نے ان کی دنیا اور آخرت کی اصلاح کے لیے ''وید'' نامی ایک کتاب برہما فرشتے (کہ جو دنیا کی ایجاد کا آلہ اور وسیلہ ہے) کے ذریعے بھیجی تھی، یہ کتاب چار دفتر رکھتی ہے۔ اور احکام امر و نہی اور ماضی و مستقبل کی خبروں پر مشتمل ہے۔ ان کے مجتہدوں نے اس کتاب سے چھ مذاہب نکالے ہیں اور اصول عقائد کی بنیاد اسی پر رکھی ہے۔ اس فن کو دھرم شاستر کہتے ہیں۔ یعنی فن ایمانیات، جسے ہم علم کلام کہتے ہیں۔ نوع انسانی کو چار فرقوں پر تقسیم کیا ہے اور اس کے چار مسلک نکالے ہیں۔ ہر فرقے کے لیے ایک مسلک مقرر کیا ہے۔ اور اعمال کی بنیاد اس پر رکھی ہے اس فن کا نام کرم شاستر ہے۔

[1] سرہندی، احمد (شیخ) مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی، اُردو ترجمہ) نشی نول کشور، ۱۹۱۳ء، ص ۴۵۷

یعنی فن عملیات جسے ہم علم فقہ کہتے ہیں کیونکہ وہ لوگ نسخ احکام سے انکار کرتے ہیں اور ہر دور اور ہر زمانے کے اہل دانش کی طبیعتوں کے مطابق تبدیلی لازمی ہے۔ دنیا کی طویل عمر کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصہ کا نام ''جگ'' رکھا ہے اور جگ کے لیے چاروں دفتروں سے طرز عمل اخذ کیا ہے، اور جو کچھ ان کے متاخرین نے تصرفات کیے ہیں وہ قابل اعتبار نہیں۔ اور ان کے تمام فرقے خدا تعالیٰ کی توحید پر متفق ہیں اور دنیا کی حادث ومخلوق کو جانتے ہیں۔ دنیا کے فنا ہونے، حشر جسمانی اور جزائے اعمال نیک و بد پر یقین رکھتے ہیں اور ان لوگوں کو علوم عقلی ونقلی تحقیق، ریاضات، مجاہدات، تحقیق معارف اور مکاشفات پر ید طولی حاصل ہے۔ اور ان کے کتاب خانے آج تک موجود ہیں۔ ان لوگوں میں بت پرستی کی رسم، الوہیت میں شرک کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کی حقیقت دوسری ہے، ان کے دانشمندوں نے انسانی زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، جنھیں اس طرح گزارتے ہیں۔ پہلے حصے میں، علوم و آداب کی تحصیل، دوسرے میں تحصیل معاش اور اولاد، تیسرے حصے میں تصحیح اعمال اور اصلاح نفس اور چوتھا حصہ ترک و تجرید کی مشق میں جو انسان کے کمال کی انتہا ہے۔ نجات کبریٰ جسے مہا مکت کہتے ہیں اسی پر موقوف ہے۔ اس دین کے قواعد وضوابط میں مکمل نظم ونسق ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ مرتب دین تھا اور اب منسوخ ہو گیا۔ اور شرع میں منسوخ شدہ مذاہب میں سوائے یہود و نصاریٰ کے دین کے اور کسی کا ذکر نہیں، حالانکہ ان کے علاوہ بھی بہت سارے مذاہب منسوخ ہوئے اور بہت سے پیدا ہوئے اور ختم بھی، جاننا چاہیے کہ آیت کریمہ کے مطابق وان من امۃ الا خلا فیہا نذیر و لکل امۃ رسول۔ (کوئی امت ایسی نہیں کہ جس میں رسول نہیں بھیجا گیا ہو) دوسری آیت کریمہ کے مطابق ممالک ہند میں انبیاء اور رسول بھیجے گیے ہیں اور جن کے احوال ان کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں اور کچھ ان کے آثار باقی ہیں، ان سے بھی یہی

اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کمال و تکمیل کے درجے تک پہنچ گئے تھے۔ اور رحمت عامہ نے اس وسیع مملکت کے انسانی معاملات کو فراموش نہیں کیا تھا۔ مشہور ہے کہ خاتم الرسل کے تشریف لانے سے پہلے ہر قوم میں پیغمبر بھیجے گئے تھے اور پوری قوم پر اپنے پیغمبر کی اطاعت اور فرمانبرداری واجب تھی نہ کہ دوسرے قوم کے پیغمبر کی۔ ہمارے پیغمبر کے ظہور کے بعد (جو تمام انسانوں کے لیے بھیجے گئے ہیں اور خاتم المرسلین ہیں اور جن کا مذاہب تمام شرقی و غربی مذاہب کو ختم ختم کر دینے والا ہے) جب تک دنیا باقی ہے کسی کو نافرمانی کی مجال نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے آج تک ۱۱۸۰ سال گزرے جو کوئی ان کا معتقد نہ ہوا ہے کافر ہے، لیکن اگلے لوگ نہیں (یعنی ظہور اسلام سے قبل کے لوگ) اور چونکہ مذہب اس آیت کریمہ کے مطابق ان میں سے کہ جن کے ہم نے قصے بیان کیے اور ان میں سے کہ جن کے ہم نے قصے بیان نہیں کیے۔ بہت سے انبیاء کے احوال کے بیان میں خاموش ہے۔ اس لیے ان کی شان میں خاموش رہنا ہی سب سے بہتر ہے۔ نہ تو ہمیں ان کی پیروی کرنے والوں کے کفر و ہلاکت کا یقین لازم ہے اور نہ ان کی نجات پر یقین کرنا چاہیے، اس معاملے میں حسن ظن ضروری ہے۔ بشرطیکہ تعصب درمیان نہ ہو اور اہل فارس کے حق میں بلکہ ہر ملک والوں کے حق میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے قبل گزرے ہیں، اور شریعت کی زبان جن کے بارے میں خاموش ہے، یہی عقیدہ رکھنا اچھا ہے اور بغیر کسی قطعی دلیل کے کسی کو کافر کہنا آسان نہیں سمجھنا چاہیے اور ان لوگوں کی بت پرستی کی حقیقت یہ ہے کہ بعض فرشتے جو اللہ کے حکم سے اس عالم کون و فساد میں میں تصرف رکھتے ہیں یا بعض کاملوں کی روحیں جن کا جسموں سے ترک تعلق کے بعد بھی اسی کائنات میں تصرف باقی ہے۔ یا بعض ایسے زندہ لوگ جو ان لوگوں کے خیال میں حضرت خضر کی طرح زندہ جاوید ہیں، ان کے بت بنا کر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس توجہ کے سوا

کچھ مدت کے بعد صاحب صورت سے ربط پیدا کر لیتے ہیں اور اس کی بنیاد پر دنیا اور عاقبت کے تعلق سے اپنی احتیاجوں کو پورا کرتے ہیں اور یہ عمل ذکر رابطے سے مشابہت رکھتا ہے۔ جو مسلمان صوفیوں کا طریقہ ہے کہ اپنے پیر کی صورت کا تصور کرتے ہیں اور اس سے فیض اٹھاتے ہیں۔ بس اتنا فرق ہے کہ (مسلمان) پیر کا بت نہیں تراشتے، لیکن یہ بات کفار عرب کے عقیدے سے مناسبت نہیں رکھتے، بلکہ وہ تو بتوں کو اپنی ذات سے مؤثر اور متصرف کہتے تھے۔ اللہ تعالی کے تصوف کا آلہ نہیں سمجھتے تھے اور ان کو زمین کا خدا جانتے تھے اور خدا کو آسمان کا۔ یہ الوہیت میں شرک ہے۔ ان (کفار ہند) کا سجدہ کرنا سجدہ تہنیت ہے، سجدہ عبودیت نہیں جو ان لوگوں کے مذہب میں ماں، باپ، پیر اور استاد وغیرہ کو بھی سلام کی جگہ کرتے ہیں اور اسے ڈنڈوت کہتے ہیں اور تناسخ پر اعتماد رکھنے سے کفر لازم نہیں آتا''۔[1]

ان بزرگوں اور اہل نظر صوفیوں کے علاوہ اور بھی بہت سے نام ہیں جنھوں نے ہندو مت کے حوالے سے نہایت وسیع المشربی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہندی، سنسکرت زبان سیکھ کر اشعار اور دوہے کہے ہیں۔ جیسے داؤد فطین، ملک محمد جائسی (۱۴۷۷-۱۵۴۲) عبدالرحیم خان خاناں (۱۵۵۶- ۱۶۲۶ء) میر عبدالجلیل بلگرامی (۱۰۷۱ھ - ۱۱۲۷ھ) سید برکت اللہ (۱۰۷۰ھ -۱۱۴۲ھ) وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ گویا یہ ہماری تاریخ اور کردار کے وہ روشن اوراق ہیں جن کو آج پھر بروئے کار لانے اور عوام وخواص تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ متذکرہ افکار ونظریات میں جو وسعت اور فکری ونظری رواداری پائی جاتی ہے وہ اپنی جگہ مسلم ہے۔ تاہم آج ہم نے سیاسی برتری اور اقتدار کے حصول کے لیے ایک دوسرے کے تئیں جو شدت یا نفرت اختیار کر رکھی ہے وہ نہ مسلم کمیونٹی کے لیے ٹھیک ہے اور نہ ہندو سوسائٹی کے لیے۔ یاد رکھنا ہوگا مذہب یا کسی کے معتقدات کے خلاف بدزبانی کرنا درست نہیں۔ الحمد اللہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس معاملے میں مسلمانوں کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ وہ اگر حاکم ہوئے تب بھی اور اگر محکوم رہے ہیں تب بھی

[1] خلیق انجم مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، برہان اردو بازار دہلی، ۱۹۶۳، ص ۹۱-۹۵

انھوں نے کسی کے دھرم اور معتقدات کے خلاف کوئی بھی جملہ نہیں کہا ہے۔ بلکہ دیگر ادیان اور دوسری اقوام وملل کے معتقدات، ان کی تہذیبی سرگرمیوں کو انجام دینے کے پورے پورے مواقع عنایت کیے ہیں۔ بات بھی درست ہے کہ معاشرتی اور سماجی سطح پر ہم آہنگی یا انسانیت کی بنیاد پر باہم رشتہ مضبوط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارا رویہ دیگر ادیان و مذاہب کے متعلق بالکل معتدل اور متوازن ہو۔ نیز ہندومت کے متعلق مسلمانوں کے افکار سے بنیادی طور پر جو پیغام جاتا ہے وہ بھی بڑا اہم ہے۔ یعنی انسان کا عقیدہ، نظریہ، فکر اور دین و دھرم اور آپ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، تب بھی اس کے خلاف اپنی زبان اور عمل سے کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے کہ جو ان کی دل آزاری کا سبب بنے۔ ان تمام باتوں کو اگر موجودہ منظر نامے رکھ کر دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آج مذہب کے خلاف ایک طبقہ جو نفرت پیدا کر رہا ہے وہ مناسب نہیں۔

ہندومت پر مسلمانوں کا تحریری سرمایہ:

ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے عہد میں ہندوازم یا دیگر ادیان پر جو کام ہوا وہ نہایت اہم اور قابل قدر ہے۔ سطور ذیل میں ہندوازم پر ہونے والے کام کا تجزیہ پیش کیا جائے گا چنانچہ محمود غزنوی (۹۷۱-۱۰۲۰) کے دور حکمرانی (۹۹۸-۱۰۳۰ء) میں سب سے پہلے ہندوازم پر باقاعدہ تصنیف ابوریحان برہان الحق محمد بن احمد البیرونی (۹۷۳-۱۰۴۸ء) کی ہے جسے 'فی تحقیق ماللہند من مقولہ مقبولہ فی العقل اومزدولہ' کے نام سے جانتے ہیں۔

بیرونی کا مختصر تعارف:

ابوریحان بیرونی نے یہ کتاب کیوں لکھی اس کا سبب کیا تھا اس پر گفتگو کرنے سے قبل ضروری ہے کہ بیرونی کا مختصر تعارف کرایا جائے۔ یہ سچ ہے کہ ابوریحان البیرونی ہمہ جہت شخصیت کا مالک تھا، وہ جہاں علم و تحقیق کا دلدادہ تھا، وہیں سیاح، مہندس اور ماہر جغرافیہ بھی تھا، آپ کی پیدائش ۹۷۳ء کو ہوئی۔ زندگی کی ابتدائی پچیس برس آپ نے اپنے وطن ہی میں گزارے۔ ۹۹۵ء میں جب آل عراق کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو آپ کو نقل مکانی کر کے جرجان

جانا پڑا، لیکن وہاں بھی زیادہ دیر تک قیام نہ کر سکے اور آبائی وطن کو خیر آباد کہنے پر مجبور ہوئے۔ ۹۹۷ عیسوی میں آپ نے طبرستان کے اسپہبند مرزبان کے دربار میں رسائی حاصل کر لی۔ اپنی پہلی تصنیف 'مقالید علم الھیئۃ' آپ نے اسی کے نام پر معنون کی ہے۔ لیکن اسی سال اسپہبند کے انتقال پر حالات کچھ ایسے نہ ساز گار ہوئے کہ نئے وطن کو بھی خیر آباد کہنے پر مجبور ہو گئے اور نہایت سستا حالت میں شہر 'رے' میں رہنے لگے ۹۹۸ء میں جب والی جرجان وطبرستان شمس المعالی قابوس اپنی کھوئی ہوئی سلطنت پر دوبارہ قابض ہوا تو آپ کو پھر اپنے نئے وطن میں آنے کا موقع مل گیا۔ سلطاں کی خواہش اور اصرار کے باوجود آپ زیادہ عرصے تک جرجان میں نہ رہ سکے اور ۱۰۰۳ یا ۱۰۰۴ء میں اپنے آبائی وطن علی بن مامون کے دربار میں پہنچے۔ سلطان محمود غزنوی کی فتح خوارزم ۱۰۱۷ یا ۱۰۱۸ تک آپ وہیں رہے، فتح کے بعد اور خوارزم کے دوسرے اعیان ومشاہیر کے ساتھ آپ بھی محمود کے ہمراہ غزنی پہنچ گئے۔[1]

سبب تالیف:

غزنی پہنچنے کے بعد آپ کے دل میں برعظیم پاک و ہند اور یہاں کے باشندوں کے بارے میں حقائق کی دریافت کا شوق پیدا ہوا۔ اس مقصد کے لیے ۱۰۱۹-۱۰۲۰ء کے بعد بیرونی برعظیم میں آنے اور تقریباً نو دس برس تک پنجاب، کشمیر اور سندھ میں رہے، اس دوران میں آپ نے سنسکرت سیکھی، ہندو علماء کی صحبت میں ان کے علوم کی تحصیل کی اور ہندو مذہب، تہذیب وتمدن اور رسم ورواج کا مطالعہ کیا[2] بیرونی کو ان کی کتابیں اور مصادر کو جمع کرنے میں جو دقت اور مشکل پیش آئی اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

> ''ان کی کتابیں جمع کرنے کی حرص میں جہاں سے ان کے ملنے کی امید ہو سکتی تھی اور اس کے لیے بقدر امکان ہے دریغ خرچ کرنے میں میرے زمانے

---

[1] البیرونی، برہان الحق ابوریحان محمد بن احمد، فی تحقیق ماللہند من مقولہ مقبولہ فی العقل اومزدولہ، مقدمہ اُردو ترجمہ، سید اصغر علی، ناشران وتاجران کتب، ۲۰۰۵ء، ص ۹-۱۰

[2] ایضاً، ص: ۱۰

میں دوسرا کوئی میرا مقابل نہیں تھا اور ایسے لوگ بھی مل گئے تھے جو گم نام و مخفی مقامات سے ان کا پتہ لگائیں۔ پھر بھی اندرون موانع نے ہم کو اس میں عاجز رکھا اور میرے سوا دوسرے کو بھی اس قسم کے موانع پیش آئیں گے مگر یہ کہ اللہ اپنی مدد کسی کو ان حرکات پر جن سے ہم عاجز رہے، وہ قدرت عنایت کرے جس سے ہم محروم تھے، (یعنی ایسا موقع مہیا کر دے کہ وہ بے روک ٹوک جہاں چاہے جا آ سکے) اور امر و نہی (یعنی حکومت) کے ذریعے سے بند کرنے اور کھولنے کا اختیار دے جو ہم کو میسر نہیں تھا اور جتنا بھی ہو گیا اس پر اللہ کا شکر ہے''۔[1]

اس قدر موانع اور مشکلات کے باوجود بیرونی نے ایک جامع اور نہایت اہم کتاب تصنیف فرمائی۔ اس کے بارے میں مذکور ہے۔

۱۰۳۰ء میں استاد ابوسہل عبدالمنعم کی فرمائش پر جو کچھ آپ کو ہندوؤں کے بارے میں معلوم تھا مالہند میں قلم بند کر دیا تا کہ ان لوگوں کو جو ان سے بحث و مناظرہ کرنا چاہیں اس سے مدد ملے۔ اور جو لوگ ان سے میل جول پیدا کرنا چاہیں ان کے لیے بھی کارآمد ہو۔ ہم نے اس کو اس طرح لکھ ڈالا کہ اس میں کسی فریق کی طرف کوئی ایسا قول منسوب نہیں کیا ہے، جو اس کا نہیں ہے اور نہ اس کا کلام نقل کرنے سے اگر وہ حق کے مخالف اور اہل حق کو اس کا سننا گراں ہوا حتراز کیا ہے:

یہ بحث و مناظرہ کی کتاب نہیں ہے کہ ہم مخالف کے دلائل بیان کر کے جو ان میں سے حق کے خلاف ہے، ان کی تردید کریں۔ یہ صرف نقل و حکایت کی کتاب ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب وضاحت و صفائی میں دوسری کتابوں کا بدل اور اپنے موضوع پر ان شاء اللہ ایک جامع کتاب ثابت ہوگی۔[2]

---

[1] البیرونی، برہان الحق ابوریحان محمد بن احمد، فی تحقیق مالہند من مقولہ مقبولہ فی العقل او مرذولہ، مقدمہ اُردو ترجمہ، سید اصغر علی، ص: ۲۴

[2] ایضاً، ص: ۱۰

مگر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کا سبب جہاں ہندو مذہب اور ہندو رسم و رواج سے واقفیت پیدا کرنی ہے وہیں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ دونوں تہذیبوں میں میل جول پیدا ہو اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸-۱۹۵۸) کی کتاب 'البیرونی اور جغرافیہ عالم' پر تقدیم وتحشیہ معروف اسکالر ضیاء الحسن فاروقی نے لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''کتاب کے مطالعے سے البیرونی کے تصور تاریخ سے متعلق ہی حقیقت سامنے نہیں آتی ہے بلکہ اس کی تصنیف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خیال میں اہل ہند کے عقائد، مذہبی رسومات وآداب، تہذیبی خصائص کو اس وقت تک گیرائی اور سچائی سے بیان نہیں کیا جاسکتا تھا جب تک ان کے فلسفہ اور نظریہ عبادت کو اچھی طرح سمجھ نہ لیا جائے۔ البیرونی سے پہلے جو مسلم جغرافیہ داں اور اقوام وملل کے موضوع پر لکھنے والے گزر چکے تھے ان کے یہاں ہمیں وہ ہمہ گیر، گہرائی، مقصدیت اور باضابطگی نہیں ملتی جو اس خوارزمی عالم کے یہاں ملتی ہے۔ کتاب الہند سے صرف یہی نہیں پتہ چلتا کہ اس کے مصنف کو اہل ہند کے احوال کے عقائد کے جاننے کا شوق تھا۔ بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا کہ اس کا یہ شوق برائے شوق اور اس کا یہ تجسس برائے تجسس نہ تھا۔ وہ درحقیقت یہ چاہتا تھا کہ کسی تہذیب سے جو اس کی اپنی اور اپنے ہم مذہبوں کی تہذیب ہے بالکل مختلف اور متغایر تھی، ایسا رشتہ قائم ہو جائے کہ دونوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے میں آسانی ہو''۔[1]

گویا یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ سرزمین ہند میں پہلی بار باضابطہ ایک ایسی کاوش ہوئی جس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہم قریب لانا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب باہم قومیں دین ومذہب یا رسم ورواج کے اعتبار سے الگ الگ ہوتی ہیں اور ان کو باہم قریب کرنا ہو،

---

[1] آزاد، ابوالکلام (مولانا) البیرونی اور جغرافیہ عالم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ص ۲۰۰۴، ص ۳۱

تو ضروری ہے کہ ایک دوسرے کے مذہبی اور تہذیبی و دینی افکار سے مکمل طور پر واقفیت پیدا کی جائے پھر اس کے جو مفید نتائج معاشرے پر برآمد ہوں گے ان کی افادیت سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہی کوشش بیرونی نے کی اور موازنۂ ادیان کے سلسلے کو استحکام بخشا۔

کتاب الہند کے مآخذ:

یہ سچ ہے کی کوئی بھی تصنیف و تالیف اور تحقیقی کاوش اسی وقت معتبر ہوتی ہے کہ جب کہ یہ اندازہ نہ لگا لیا جائے کہ اس میں جن مآخذ کا استعمال کیا گیا ہے وہ کس قدر معتبر ہیں۔ پرائمری درجہ کے مصادر ہیں یا ثانوی درجے کے۔ ماہرین تحقیق کا بڑا طبقہ اس بات کا قائل ہے کہ تحقیق میں استعمال ہونے والے مصادر پرائمری درجے کے ہیں تو وہ کاوش قابل اعتماد اور لائق مطالعہ ہے۔ البتہ ثانوی درجہ کے مآخذ والی کتاب کا وہ اعلی معیار اور درجہ نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ اب دیکھنا یہ ہے کہ ابوریحان بیرونی نے اپنی کتاب تحقیق ماللہند میں کن مآخذ کا استعمال کیا ہے۔

مذہب کے لیے بھگوت گیتا، پاتن جلی، وشنو دھرما، متسیا پوران، وایو پوران اور ادتیا پوران۔ علم ہیئت، جغرافیہ اور جوتش کے لیے۔ پلیسا سدھانتا، برہما سدھانتا، کھنداکھدیاکا، اور اترا کھنداکھدیاکا۔ نیز مہابھارت، رامائن، منودھرم شاستر وغیرہ۔ ضمنا یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کتاب الہند کے بعد اس طرح کی اور بھی کاوشیں ہوئیں لیکن وہ حالات و وسائل کی وجہ سے تکمیل کو نہیں پہنچ سکی۔ غزنی کے دور میں دو اور اہل علم نے اس طرح کا کام شروع کیا۔ ایک ۱۰۵۰ء کے قریب ابوسعید عبدالحی بن الضحاک بن محمود گردیزی نے اور دوسرے ۱۰۹۰ کے آس پاس ابن عقیل نے۔ خازان ابن خانی (۱۲۹۵-۱۳۰۴) کے وزیر رشید الدین (۱۲۴۷-۱۳۱۸) مصنف 'جامع التواریخ' نے بھی اس طرف توجہ کی تھی۔ لیکن وہ اپنی کتاب میں البیرونی کا ایک مقالہ (جغرافیہ پر) نقل کرنے کے بعد اس موضوع سے کنارہ کش ہوگیا۔[1]

---

[1] غلام جیلانی برق، البیرونی اور اس کی کتاب الہند، مقالہ، ص ۴۰۸

کتاب الہند اہل علم کی نظر میں:

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

''وہ بجا طور پر الفارابی اور ابن رشد کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ہے، جس طرح ان دونوں نے یونانی فلسفے کے تراجم کی تصحیح کا کام انجام دیا تھا، اسی طرح البیرونی نے علم ہیئت اور جغرافیہ کی از سر نو تصحیح وتہذیب کی اور ہندوستانی علوم کو نئے سرے سے عربی میں مدون کیا، لیکن البیرونی اس صف میں نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خاص بلند تر جگہ بھی رکھتا ہے۔ ابونصر فارابی اور ابن رشد، دونوں اس زبان سے واقف نہ تھے۔ جس زبان کے فلسفے کی تصحیح وتہذیب میں مشغول ہوئے تھے۔ انھوں نے تمام تر اعتماد عربی کے قدیم تراجم پر کیا، یہی وجہ ہے کہ ان کی تصحیح مکمل تصحیح نہ ہوسکی۔ اور بعض غلط فہمیاں جو عہد تراجم کے ابتدائی دور میں پیدا ہوگئی تھی آخر تک دور نہ ہوسکیں۔ لیکن البیرونی نے نظر وتحقیق کی بالکل دوسری راہ اختیار کی اس نے جن علوم کو اپنا موضوع نظر قرار دیا، انھیں خود ان کی اصل زبانوں میں پڑھنے کی کوشش کی، ہندوستان کے علوم کی اس نے جس قدر تحقیقات کی، سنسکرت کی تحصیل کے بعد کی''۔[1]

علامہ شبلی نعمانی

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) نے اپنی کتاب مقالات شبلی میں، بیرونی کی کتاب 'تحقیق ماللہند' کے متعلق لکھا ہے:

''ابوریحان بیرونی کی سنسکرت دانی اس رتبہ کی تھی کہ اس نے بعض عربی تصنیفات کو ہندوؤں کے لیے سنسکرت میں ترجمہ کیا ہے۔ سنسکرت علوم وفنون کے متعلق جو کتاب اس نے لکھی ہے اور جس کو جرمنی کے مشہور پروفیسر زخاؤ نے اپنی تصحیح سے چھپوایا ہے ہمارے سامنے ہے۔ یہ کتاب درحقیقت سنسکرت

---

[1] کتاب الہند اُردو ترجمہ، ص ۱۱

علوم وفنون کا نہایت عمدہ خلاصہ ہے۔ مصنف نے سنسکرت کی بہت سی مستند اور قدیم تصنیفات سے ذخیرہ معلومات مہیا کیا، ایک عجیب بات یہ ہے کہ چونکہ ہندو اپنی کتابوں کے دینے میں بخل کرتے تھے، اس لیے مصنف نے بہت سی کتابوں کو زبانی پڑھا اور یاد کیا، بیرونی کی کتاب کی جامعیت و وسعت معلومات کا اندازہ ان ابواب کے عنوان سے ہوسکتا ہے جو مصنف نے اختیار کیے ہیں''۔[1]

علامہ سید سلیمان ندوی

بیرونی کی کتاب 'کتاب الہند' کے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء-۱۹۵۳) اپنی کتاب 'عرب و ہند کے تعلقات' میں رقمطراز ہیں:

''اس نے کتاب الہند لکھ کر جیسا کہ ڈاکٹر زخاؤ نے کہا ہے، ایک طرف مسلمانوں کو یہ فخر بخشا کہ ان کے ایک فرد نے ایسی کتاب لکھی جس سے یونانی سفیروں اور چینی سیاحوں کے ہندوستان کے متعلق بیانات کو تقویم پارینہ بنا دیا۔ دوسری طرف ہندوستان پر یہ احسان کیا کہ اس کے پرانے تمدن، پرانے علوم اور پرانے خیالات کو دنیا میں قائم اور باقی رکھا''۔[2]

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

معروف مصنف اور عظیم محقق سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی کتاب 'ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری' میں بیرونی کی 'کتاب الہند' پر جو قیمتی تبصرہ کیا ہے، وہ یہاں رقم کرنے کے لائق ہے:

''البیرونی قوموں کی باہمی دوری اور بے گانگی کو ایک دوسرے کے لیے بہت مضر سمجھتا رہا، اس کا یہ سمجھنا بہت صحیح تھا، کیونکہ ایک دوسرے کی لاعلمی سے بے

---

[1] شبلی نعمانی، (مولانا) مقالات شبلی، معارف اعظم گڑھ، ۱۹۳۷ء، ج ۶، ص ۱۰۵-۱۰۶

[2] ندوی، سید سلیمان، (مولانا) عرب و ہند کے تعلقات، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، ۱۹۳۰ء، ص ۱۷۶-۱۷۵

گانگی پیدا ہوتی ہے، بے گانگی آنکھوں کو اندھا اور کانوں کو بہرہ کر دیتی ہے، جس سے ذاتی، نسلی، اجتماعی اور قومی خود خود بینی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد دل آزاری، مردم خیزی، آبرو ریزی اور خونریزی شروع ہو جاتی ہے، جس کو قومی سرخ روئی کا نام دیا جاتا ہے۔ البیرونی نے اپنی کتاب کے باب اول کے آغاز ہی میں لکھا ہے کہ بے تعلقی کی حالت میں جو چیز نہیں معلوم ہو سکتی ہے، وہ میل جول کی حالت میں ظاہر ہو جاتی ہے، اس میل جول کی فضا کو پیدا کرنے کی خاطر اس نے انتہائی عرق ریزی اور جانفشانی سے 'کتاب الہند' لکھی، اگر ہندو اور مسلمان دونوں میں ہر زمانہ میں ایک ایک بیرونی پیدا ہوتے رہتے تو آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی''۔[1]

ضیاء الحسن فاروقی

ضیاء الحسن فاروقی مولانا آزاد کی کتاب 'البیرونی اور جغرافیہ عالم' کے تقدیم وتحشیہ میں بیرونی کی بے تعصبی، وسعت اور اس کے دوسرے ادیان کے متعلق متوازن رویہ پر اس طرح گفتگو کرتے ہیں:

''بیرونی کا طریق تحقیق درحقیقت تقابلی تھا۔ مذاہب کا تقابلی مطالعہ اس شخص کے لیے آسان ہو سکتا ہے جو موجودہ مذاہب میں سے کسی کا پیرو نہ ہو، لیکن البیرونی کے ساتھ یہ معاملہ نہ تھا، وہ مذاہب اسلام کا پیرو تھا اور ہم نے دیکھا کہ قانون مسعودی کے دیباچے میں اس نے خدا اور اس کے رسول پر ایمان کا برملا اظہار کیا ہے۔ پھر وہ جس ماحول میں زندگی گزار رہا تھا، مذہب میں راسخ العقیدگی کا ماحول تھا، سلطان محمود کی فتح مندی کے جوش وخروش کا ماحول تھا، اسے معلوم تھا کہ اس کی کتابیں اسی راسخ العقیدگی کی عام فضا میں پڑھی جائیں گی، پھر بھی وہ اپنے مطالعے میں پوری غیر جانبداری اور کمال معرفت سے کام

[1] ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ج ۱، ص ۸۳-۸۴

لیتا ہے اور کہیں بھی تعصب کی پرچھائی نہیں پڑنے دیتا، وہ نہ تو اسلام کی برتری کا اعلان کرتا ہے اور نہ یہ جتاتا ہے کہ مسلمانوں کی تہذیبی وعلمی ترقی کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آج بھی اس شعبہ علم کے محققین میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا ملے گا جس میں البیرونی کی سی غیر جانبداری اور معروضیت ہو، اس کے ساتھ یہ سعادت خاص عطیہ الٰہی تھی۔ ہمارا نابغہ روزگار کئی زبان جانتا تھا، مثلاً سعدی اور خوارزمی (جو فارسی کی دو صورتیں تھیں) عربی، عبرانی، سریانی اور سنسکرت اپنے مشہور ہم عصر ابن سینا اور دوسرے مسلم فلاسفہ کے مقابلے میں اس کا رتبہ یوں بھی بلند ہے کہ انھوں نے یونانی فلسفہ اس کے عربی تراجم سے سیکھا تھا، انھوں نے براہ راست یونانی زبان میں اسے نہیں پڑھا تھا، لیکن البیرونی نے مشقت وجاں فشانی سے سنسکرت زبان کی اپنی لغوی ونحوی مشکلات اور اہل ہند کے مخالفانہ رویہ کے باوجود، سنسکرت سیکھی اور اتنی سیکھی کہ اس پر پورا عبور حاصل کیا، اور پھر اہل ہند کے فلسفۂ علوم اور عقائد و رسوم سے متعلق براہ راست انہیں کتابوں سے استفادہ کیا'' [1]

پروفیسر اختر الواسع

پروفیسر اختر الواسع، علمی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، انھوں نے مولانا آزاد کی کتاب 'البیرونی اور جغرافیہ عالم' پر حرف آغاز کے عنوان سے ایک نہایت جامع اور قابل مطالعہ مضمون تحریر کیا ہے وہ اپنے اس مضمون میں بیرونی کی کتاب 'کتاب الہند' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

'' روشن دماغی اور علم پروری کی تاریخ کا ایک نہایت تابندہ باب ابوریحان البیرونی سے منسوب ہے، فلسفہ اور منطق ہو، یا علم ہیئت اور علم نجوم، تاریخ اور جغرافیہ ہو یا زبان وادب، فکر ودانش کا کون سا شعبہ ہے جہاں البیرونی نے اپنی

[1] ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ج ۱، ص ۳۵

انفرادیت کے نقش نہ قائم کیے ہوں۔ ہندوستان سے متعلق اس کا علمی کارنامہ جسے ہم 'کتاب الہند' کے نام سے جانتے ہیں، ہند شناسی کی بنیاد ساز کاوش ہے، اس کتاب میں البیرونی نے ہندو فلسفہ، ہندو مذہبی روایات اور رسوم و رواج کا نہایت معروضی مطالعہ پیش کیا ہے، جس میں اس کا اپنا عقیدہ کہیں بھی مزاحم نہیں ہوا ہے۔ اس ہمہ جہت اہل دانش نے اس کتاب کی تصنیف کے لیے سنی سنائی باتوں پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے، سنسکرت زبان میں مہارت حاصل کی اور ہندوستان کے کئی سفر کیے، جن کے دوران یہاں کے اہل علم سے سرگرم رابطے کے ذریعے ان کے مبلغ علم تک پہنچنے اور ان کی اصطلاحات کو سمجھنے کی ایسی کوشش کی کہ جس کی نظیر اور کہیں دکھائی نہیں دیتی 'کتاب الہند' ہند شناسی کا حرف آغاز ہونے کے ساتھ ساتھ مذاہب کے تقابلی مطالعے کا پہلا سنگ میل بھی ہے، اس میں جس تجرباتی اور استقرائی طریق تحقیق سے کام لیا گیا ہے اس سے مذاہب کے معروضی مطالعہ کی ایک نئی منہاج قائم ہوئی'' [1]

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی

پروفیسر قاسمی نے ایک نہایت جامع کتاب مطالعہ ادیان پر 'مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت' کے عنوان سے تحریر کی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک منفرد اور تقابل ادیان پر کام کرنے والے اسکالرز و محققین کے لیے ایک مفید اور اہم تحفہ ہے۔ پروفیسر قاسمی بیرونی کی کتاب 'تحقیق ماللہند' کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''البیرونی نے محنت و مشقت اور علمی بصیرت کے ساتھ ہندوستان کے مذاہب، تہذیب و ثقافت، رسم و رواج اور جغرافیائی مقامات اور حالات کا مطالعہ کیا ہے، پھر نہایت غیر جانبداری اور علمی دیانت کے ساتھ ان کو بیان کیا ہے۔ یہ مطالعہ ہندو مسلمان اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لیے ایک علمی

[1] البیرونی اور جغرافیہ عالم، ص ۸

دستاویز ہے۔ گویا گیارہویں صدی عیسوی کے ہندوؤں کے مذہبی وسماجی حالات کی مستند اور معتبر تاریخ ہے'' [1]

کتاب الہند کے تراجم اور اشاعتیں:

واضح رہے کہ البیرونی نے یہ کتاب عربی زبان میں لکھی تھی، اس کا وہ نسخہ جسے پروفیسر زخاؤ نے پہلے جرمن اور پھر انگریزی میں منتقل کیا تھا ۳۸۰ صفات پر مشتمل تھا۔ پروفیسر زخاؤ رائل یونیورسٹی آف برلن کے پروفیسر اور کئی علمی تنظیمات کے رکن تھے۔ آپ نے ۱۸۸۸ء میں اس کتاب کو انگریزی میں منتقل کیا۔ اس کے بعد اس کے اردو تراجم بھی ہوئے ہیں۔ اس کا ایک اردو ترجمہ سید اصغر علی نے کتاب الہند کے نام سے کیا ہے۔ اس کو انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے ۱۹۴۲ء میں شائع کیا ہے۔ البتہ سید اصغر علی کے اردو ترجمے کو 'ہندو دھرم ہزار سال پہلے' کے عنوان سے خدا بخش لائبریری پٹنہ نے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا ہے. سید اصغر علی کے اس ترجمہ کو پاکستان کی معروف ادارہ 'ناشران وتاجران کتب نے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا ہے. بیرونی کی کتاب فی 'تحقیق ماللہند' میں کل ابواب ۶۶ ہیں۔ پہلی جلد میں ۳۳، دوسری جلد میں بھی ۳۳۔ بیرونی کی یہ کتاب ہندوؤں کی پوری تہذیب، افکار اور ان کے دینی ومعاشرتی رویوں پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالتی ہے۔

دبستان مذاہب:

ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے عہد میں ایک اور باقاعدہ تصنیف دبستان مذاہب کے نام سے ملتی ہے۔ جو فارسی زبان میں لکھی گئی، یہ کتاب ہندوازم کے ساتھ ساتھ دیگر کئی مذاہب وادیان اور ان کے عقائد اور رسومات کا تعارف کراتی ہے۔ ذیل میں اس کتاب کا تعارف پیش کیا جائے گا۔ راقم کے سامنے اس کتاب کا اردو نسخہ ہے۔ اور اس کے سرورق پر، کیخسر و اسفندیار، تعلیقات رشید احمد جالندھری درج ہے۔ اردو نسخے پر پیش لفظ رشید احمد جالندھری نے لکھا ہے وہ کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت، ص ۱۲۰

''دبستان مذاہب فارسی ادب کی معروف کتاب ہے، جو سترویں صدی کے ہندوستان میں لکھی گئی، جس میں فاضل مؤلف نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ متعدد مذاہب کی تعلیمات، ان کی روحانی اقدار اور مذہبی تجربوں کو بیان کرتے وقت اس کا قلم تعصب وتنگ نظری اور جانبداری سے دور رہے۔ مصنف کو اس بات کا احساس ہے کہ تاریخ مذاہب پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں مثلاً عبدالکریم شہرستانی کی کتاب 'الملل والنحل' اور سید مرتضی رازی کی 'تبصرۃ العوام' وہ جانبداری سے خالی نہیں ہیں، جس کی وجہ سے حقیقت دین نظروں سے اوجھل ہوگئی ہے۔ چنانچہ انھوں نے احباب کی خواہش پر یہ کتاب لکھی ہے اور ہر مذہبی گروہ کے عقائد اس کی اپنی کتابوں سے لیے گئے ہیں۔ ایسی ہی ہر مذہب کی روحانی شخصیتوں کے بارے میں وہی کچھ لکھا ہے جسے اس مذہب کے ماننے والے صحیح جانتے ہیں۔ اس کتاب میں ترجمانی کے سوا مصنف کا اپنا کوئی کردار نہیں ہے۔ مصنف کی یہ آرزو ہے کہ دنیا میں جہاں انسانی ہستی کے لیے بقا نہیں، اس کا ایک نقش باقی رہے۔ اس کے مصنف نے نہ صرف ہر مذہب کی بنیادی کتابوں کا مطالعہ کیا، بلکہ اس نے ان شخصیتوں اور عارفوں سے بھی ملاقاتیں کیں جو اپنے مذہب کی چلتی پھرتی زندہ تصویریں تھیں۔ چنانچہ جہاں مصنف نے لاہور، گجرات، سورت، حیدرآباد، پنڈی، کشمیر اور دوسرے مقامات پر ہندو عارفوں سے ملاقاتیں کیں، وہاں وہ برصغیر کے مسلم اہل نظر سے بھی ملتے رہے۔ اکبری دربار میں مذہبی اور غیر مذہبی مکالمات اور ایسے ہی رعایا کے مختلف مذہبی گروہوں میں مکمل امن وآشتی اور مذہبی رواداری سے متعلق سرکاری سطح پر کی گئی کوششوں کی جو تفصیل داستان میں بیان کی گئی ہے۔ اس سے مصنف کی وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے۔ دبستان میں مذکور واقعات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے اس کتاب کو کئی سال میں مکمل کیا۔ تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ ۱۰۰۰ھ سے شروع ہو کر ۱۰۶۳ھ کے بعد تک جاری رہا۔ اس

کتاب میں دارا شکوہ کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس کتاب کی تکمیل ۱۰۶۳ھ اور ۱۰۶۹ھ کے درمیان میں ہوئی ہوگی۔ جبکہ دبستان کے انگریزی مترجم کے مطابق اس کا مصنف جہانگیر کے دور حکومت ۱۶۱۵ء کے لگ بھگ پیدا ہوا اور ۱۶۲۷ء اور ۱۶۴۳ء تک کشمیر اور لاہور کی سیاحت کرتا رہا اور ۱۶۷۰ء میں اورنگزیب کے عہد میں وفات پائی۔ دبستان مذاہب کئی بار کلکتہ (1221ھ) بمبئی (۱۲۶۱ھ) لکھنؤ (نول کشور ۱۲۹۴ھ/۱۸۸۱ء) اور تہران (۱۲۶۰ھ) سے شائع ہو چکی ہے۔ ۱۸۴۳ء میں پیرس سے اس کا انگریزی ترجمہ Dshea اور A. Troyer کے قلم سے شائع ہوا، لیکن بہ قول چارلس اس ترجمہ کی صحت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ۱۸۹۶ء میں لاہور سے پنڈت شردھا رام بھلوری (جالندھر) کے قلم سے شائع ہوا ۱۳۴۲ھ میں رحیم رضا زادہ ملک نے تنقید و تحقیق کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے دبستان کا نیا ایڈیشن تہران سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے''۔[1]

دبستان مذاہب کا مصنف:

دراصل اس مسئلہ میں اہل علم کی آرا مختلف ہیں کہ 'دبستان مذاہب' کا مصنف کون ہے۔ ایک روایت کے مطابق محسن فانی کو دبستان کا مصنف قرار دیا ہے۔ اسی طرح سراج الدین آرزو نے اپنے تذکرے میں موبد شاہ یا ملا موبد کو دبستان کا مصنف قرار دیا ہے۔ البتہ پروفیسر غلام مرتضی نے اپنے اردو مقدمہ میں شانواز خاں کی مآثر الامراء کے حوالے سے میرذوالفقار اردستانی یا حسینی کو 'دبستان مذاہب' کا مصنف قرار دیا ہے۔ جس کی تربیت بقول پروفیسر موصوف، پٹنہ کے روحانی رہنما آذر کیوان (زردشتی) کی نگرانی میں ہوئی۔ بعد میں میرذوالفقار حسینی مسلمان ہو گئے تھے۔ ہاں رحیم زادہ ملک نے دبستان مذاہب کی دوسری جلد میں بڑی تفصیل سے اس مسئلے پر بحث کی ہے کہ دبستان مذاہب کا مصنف کون ہے فاضل ایڈیٹر نے محسن

[1] پیش دبستان مذاہب، ناظم ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۲ء، ص ا، ب

فانی اور میرزا والفقار حسینی کی بجائے کیخسرو اسفندیار کو کتاب کا مصنف قرار دیا ہے۔ اور دلائل سے بتایا ہے کہ کیخسرو اسفندیار ایرانی النسل ہے اور پٹنہ میں مقیم آذر کیوان کا بیٹا ہے۔ جس کی تعلیم و تربیت اپنے والد کی نگرانی میں زردشتی روایات کے مطابق ہوئی ہے۔[1] اس طرح دبستان مذاہب کے مصنف کے متعلق کئی دعوے کیے جاتے ہیں۔ ان تمام دعوؤں کے باوجود دبستان مذاہب کے مصنف کا جو امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ اس کا ہر مذہب کے اصل مصادر سے رجوع کرنا اور اس کی وسعت ظرفی یقیناً بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ چنانچہ یہ کتاب مطالعۂ ادیان کے لیے نہایت مفید ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اتنی اہم کتاب کے مصنف کی تاریخ اس کے نام کو بھلا دیا گیا؟

دبستان مذاہب کے ابواب وتراجم:

تعلیم اول: پارسیوں کے علمی وعملی عقائد کے بیان میں
تعلیم دوم: ہندوؤں کے عقائد کے بارے میں
تعلیم سوم: قرابتیوں کے عقائد کے بیان میں
تعلیم چہارم: یہود کے بعض عقائد کے بیان میں
تعلیم پنجم: عیسائیوں کے عقائد کے بیان میں
تعلیم ششم: مسلمانوں کے عقائد کی تفصیل میں
تعلیم ہفتم: صادقیہ (مسیلمہ کذاب کے ماننے والے) کے عقائد کے بیان میں
تعلیم ہشتم: واحدیہ اور امناء کے عقائد کے بیان میں
تعلیم نہم: روشنیوں کے عقائد کے بیان میں
تعلیم دہم: عقائدِ الٰہیہ کے بیان میں
تعلیم یازدہم: حکماء کے عقائد کے بیان میں
تعلیم دوازدہم: صوفیاء کے عقائد کے بارے میں

---

[1] پیش دبستان مذاہب، ناظم ادارہ ثقافت اسلامیہ، ص ب، ج

مضامین کتاب پر نظر ڈالنے سے مصنف کے تنوع اور تعدد پسند مزاج کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں جہاں الہامی مذاہب کا تعارف اور ان کی تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے۔ وہیں غیر الہامی ادیان کے عقائد و افکار کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ ظاہر ہے راقم کا موضوع ہندوازم پر مسلمانوں کے تحفظات پر مبنی ہے۔ اس لیے سطور ذیل میں بتایا جائے گا کہ ہندوؤں کے عقائد ونظریات کے متعلق دبستان مذاہب کے مصنف نے کیا لکھا ہے۔ کتاب کا دوسرا باب ہندوؤں کے عقائد کے بارے میں ہے اس حوالے سے دبستان مذاہب کا مصنف درج ذیل باتوں کو زیر بحث لایا ہے۔

تعلیم دوم: ہندوؤں کے عقائد کے بارے میں

۱- متشرع ہندوؤں کے عقائد کے بارے میں

۲- سمارنگوں یعنی متشرع ہندوؤں کے اعمال وافعال کے بیان میں

۳- ویدانتیوں کے عقائد کے بیان میں

۴- سانکھیوں کے اصول کے بیان میں

۵- جوگیوں کے عقائد اور ان کے اقوال کے بیان میں

۶- ساکتیوں کے عقائد کے بیان میں

۷- حضرت شیخ ابوعلی حسین بن عبداللہ سینا قدس اللہ سرہ کا مختصر بیان۔

۸- بیشنویوں کے بیان میں

۹- چارواک کے عقائد کے بیان میں

۱۰- اہل ترک کے بیان میں

۱۱- بودھ کے عقائد کے بیان میں

۱۲- ہندوستانیوں کے مختلف عقائد کے بیان میں

دبستان مذاہب کے مصنف نے ہندوازم کے ساتھ ساتھ، ہندوستان میں پائے جانے والے دیگر ادیان مثلاً بودھ، سکھ اور جین وغیرہ کا بھی تعارف کرایا ہے۔ البتہ دبستان کے مصنف نے ہندوؤں میں ایک فرقہ 'سمارنگوں' کا بتایا ہے۔ جب وہ ہندو جو متشرع ان کے عقائد و

افعال پر تفصیل سے بحث کی ہے وہ لکھتا ہے۔ ہندوؤں میں بہت سے مذہبی طریقے اور بے شمار مسلک اور مراسم ہیں۔ ان میں سے ایک فرقہ بودھ میمانس ہے۔ اس کے عقائد کے متعلق لکھا ہے:

''بودھ میمانس کے مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ سارا عالم حاکم حقیقی کے حکم کے تابع ہے یا موجود حقیقی وجود کی بدولت قائم نہیں ہے۔ بلکہ خیر وشر اور ثواب وعقائد جو کچھ مخلوقات کو ملتا ہے، وہ سب خود ان کے اعمال واقوال کا نتیجہ ہے۔ عالم کے سارے لوگ اپنے اعمال کے جال اور اپنے افعال کی زنجیر کی قید میں مقید ہیں اور سوائے عمل کے کسی چیز کا نشان نہ پائیں گے۔ برہما جو بادشاہ ہے اور اشیا کا خالق ہے، بشن جو ایک فرشتہ ہے اور چیزوں کا محافظ ہے۔ نیز مہیش جو کہ روحانی اور ساری ساری بستیوں کو تباہ کرنے والا ہے، یہ سب اپنے اعمال صالحہ کے ذریعے اور افعال پسندیدہ کی مدد سے ایسے بلند مرتبہ پر پہنچے ہیں۔ برہما نے اپنی عبادت کے زور اور اطاعت کی قوت نیز ریاضت اور اور نیک کر داری کی بدولت دنیا کو پیدا کیا۔ چنانچہ بید جو اہل ہند کے عقیدے کے مطابق آسمانی کتاب ہے۔ اس بات کو واضح طور پر بیان کرتی ہے یعنی ملکوتی مراتب میں سے ہر مرتبہ اور ہر درجہ عمل صالح اور اخلاق حمیدہ پر منحصر ہے اور چونکہ نفس ناطقہ ملکوتی جواہر کی فطرت رکھتا ہے، اس لیے ملکوتی و اخلاق وعادات کے ذریعہ بلند مدارج میں سے کوئی درجہ حاصل کر سکتا ہے اور ایک طویل مقرر مدت تک بامراد اور ارجمند رہ سکتا ہے۔ مثلاً کوئی روح انسانی علم وعمل کے لحاظ سے اس درجہ پر پہنچ جائے کہ برہما کے منصب کے لائق ہو سکے تو موجودہ برہما کی مدت حکومت ختم ہونے کے بعد یہ مقررہ منصب اس کے حوالے کر دیا جائے گا، یہی حال فرشتوں کے دوسرے مدارج کا ہے، اس عقیدے کی اصل وہی ہے جو فارس کے بعض حکمائے مفکرین نے بیان کی ہے کہ ارواح بشری پوری تکمیل کے بعد اجرام علوی سے وابستہ ہو جاتی ہے اور نفوس فلکی کے بہت سے ادوار و

مدارج کے بعد عقول عالیہ تک ترقی کر جاتی ہے''۔[1]

ان کے علاوہ مصنف نے ہندوؤں کے متعلق جن باتوں کا ذکر کیا ہے وہ بڑی اہم ہیں۔ مثلاً ہندوؤں میں اوتار واد کا نظریہ پایا جاتا ہے اور اوتار چار ہیں۔ اسی طرح آسمانی کتابیں چار ہیں۔ جنھیں وید بھی کہا جاتا ہے، اسی طرح برہمنوں کے 'برہمچاری طبقہ' کا حال اور توحید کے متعلق بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

آئین اکبری:

مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے عہد میں جہاں علمی و تحقیقی اور تقابل ادیان میں خاصا کام ہوا ہے۔ وہیں اس کے عہد کی ایک اہم تصنیف 'آئین اکبری' ہے۔ اس کتاب کو شیخ ابوالفضل نے تالیف کیا ہے۔ یہ کتاب تاریخ کے گوشوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے عقائد رسوم اور دینی امور سے بحث کرتی ہے۔ راقم کے سامنے جو نسخہ ہے وہ آئین اکبری کا اردو ترجمہ ہے جو کہ مولوی محمد فدا علی طالب نے کیا ہے۔ اس کو ۱۹۳۹ء میں جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی دوسری جلد میں ہندوؤں کے جن عقائد کو زیر بحث لایا گیا ہے درج ذیل ہیں۔ ویدانت، سیا تک، پاتنجل، جین، بودھ، ناستک، اٹھارہ بدیا (یعنی پرانوں کے نام) تذکرہ اوتاران، روزہ کا طریقہ، ولادت کے وقت کے مراسم، تیوہاروں کا شمار، موت کے وقت کے مراسم، شادی کے طریقے، بڑی پرستش گاہیں، شادی کے طریقے وغیرہ وغیرہ۔

اوتاروں کے متعلق ابوالفضل نے لکھا ہے:

> '' کہتے ہیں (اہل ہنود) کہ پروردگار عالم محض مخلوقات کی تہدید اور تنبیہ کی وجہ سے کہ مخلوق کو فائدہ ہو ایک خاص تعلق عنصری پیکر کے ساتھ اختیار فرماتا ہے اور اکثر ذی علم و عاقل ہندی افراد اس کے فریفتہ ہیں۔ اس امر خاص کو ہندی اصطلاح میں 'پورن اوتار' کہتے ہیں اور دوسری قسم وہ ہے جس کی یوں تعریف کی

[1] دبستان مذاہب، ص ۱۴۵

گئی ہے کہ خلاق عالم ایک حصہ موجودات پر اپنے تجلی قدرت سے سایہ فگن ہوتا ہے اوران کو عجیب وغریب قوت عطا فرماتا ہے ان کو 'انش اوتار' کہتے ہیں'' [1]

اس کی پوری تفصیل بیان کرنے کے بعد بیدانت کے متعلق لکھا ہے کہ اس فلسفے کا بانی حکیم بیاس ہے اور ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق اس فلسفے کے نو حکماء ہیں پھر ان کی پوری تفصیل بیان کی ہے۔[2]

اسی طرح ہندوازم، جین ازم اور بدھ ازم کے متعلق یہ کتاب خاصی معلومات فراہم کرتی ہے۔ یعنی اس کتاب کو تقابل ادیان کی کتاب تو نہیں کہہ سکتے، لیکن اس میں ہندوستانی ادیان کے حوالے سے جو نکات اوران کے عقائد وافکار بیان کیے گئے ہیں، ان کو پڑھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب مطالعۂ ادیان پر نہایت وقیع اور قیمتی مواد فراہم کرتی ہے۔ لہٰذا عہد حکومت کی ایک ایسی تصنیف ہے جو ہندوستان کی تہذیب اور یہاں کے افکار ونظریات کو متعارف کراتی ہے۔

منتخب التواریخ:

اکبر کے دور حکومت میں لکھی جانے والی ہندوستان کی یہ ایک معتبر تاریخ ہے۔ اس کو ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے۔

یوں تو یہ تاریخ پر نہایت وقیع مواد ہے لیکن اگر اسے جب ہم غور سے پڑھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں بھی تقابل ادیان کے متعلق اچھا خاصا مواد ملتا ہے اس کتاب میں درج ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی کتب مہا بھارت، رامائن اور وید وغیرہ کے تراجم فارسی زبان میں کیے گئے جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں مذہبی مناظروں اور اکبر کے دین الٰہی کے متعلق تمام معلومات ملتی ہیں۔ مثلاً ایک عیسائی سے مکالمہ کا ذکر بدایونی نے اس طرح کیا ہے:

''بادشاہ نے فرنگی راہبوں سے بحث ومناظرہ کے لیے شیخ قطب جلیسری کو جو نہایت بدمست مجذوب تھا، شیخ جمال بختیار کے ذریعے بلوایا اور اس مجلس میں

---

[1] آئین اکبری، ج ۲، ص ۲۵۵

[2] ایضاً، ۱۳۴-۱۴۱

اس عہد کے تقریباً تمام دانشوروں اور صاحب اجتہاد عالموں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ شیخ نے کہا خوب بھڑکتی ہوئی آگ جلائی جائے اس آگ میں میں اور میرے مقابل حریف داخل ہوں گے۔ جو صحیح سلامت نکل آئے گا وہی حق پر سمجھا جائے گا۔ چنانچہ آگ جلائی گئی اور اس نے فرنگی راہب کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا چلو 'بسم اللہ' فرنگیوں میں سے اور کسی کو اس آگ میں داخل ہونے کی ہمت نہ پڑی''۔[1]

گویا منتخب التواریخ میں ہندوازم کے متعلق خاصا مواد ملتا ہے۔ اس لیے یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ کہ منتخب التواریخ عہدے اکبری کا ایک ایسا وقیع اور جامع کار نامہ ہے۔ جو ہندوستان کی تاریخ کو بتانے کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی بہت ساری دینی باتوں کو بھی بتاتا ہے۔

تحفۃ المجاہدین فی بعض اخبار البرتکالیں:

اس کتاب کو شیخ زین الدین معبری نے ۹۹۲ھ میں شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں تصنیف کیا ہے۔ اس کتاب میں چار ابواب ہیں:

باب اول: جہاد کے احکام

باب دوم: مسلمانوں کے ملیبار آنے اور اسلام کے اشاعت پانے کا تذکرہ

باب سوم: ہندوؤں کے عادات ومراسم کے ذکر میں

باب چہارم: پرتگیزوں کے ملیبار میں آنے اور یہاں کے بعض مقامات پر قابض ہوکر اقتدار کو قائم کرنے کا ذکر ہے

مصنف نے چونکہ پرتگیزی کے عروج کا زمانہ آنکھوں سے دیکھا ہے اس لیے ان کے متعلق عینی مشاہدات اور ثقہ مسموعات کو قلم بند کیا ہے اور اس موضوع پر ہندوستان کی تصنیفات میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔

---

[1] منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۲۴

یہ کتاب شہنشاہ اکبر کے وسط عہد میں تصنیف ہوئی ہے۔ مصنف نے اس کا دیباچہ سلطان علی عادل شاہ اول، بادشاہ بیجاپور کے نام پر لکھا ہے۔ جس نے ۹۶۵ھ سے ۹۸۸ھ حکومت کی ہے، لیکن اس کا اختتام سلطان کی وفات کے تقریباً چار سال بعد ۹۹۲ھ ہوا ہے۔ تحفۃ المجاہدین نے مشرق سے زیادہ مغرب میں شہرت حاصل کی ہے اور اس کے ترجمے انگریزی اور پرتگیزی زبان ہو گئے ہیں۔ میجر رولینڈسن نے (مدارس کے قلعہ سینٹ جارج میں فارسی کا مترجم تھا) انگریزی میں اس کتاب کا ترجمہ کیا جو اورینٹل ٹرانسلیشن فنڈ کی طرف سے ۱۸۲۲ء میں بمقام لندن طبع ہوا۔ پروفیسر ڈیوڈ نے پرتگیزی میں ترجمہ کیا جو ۱۸۹۸ء میں چھپا ہے اور اس کا نام ''تاریخ پرتگیزی ملیبار''۔

مشہور مؤرخ حکیم محمد قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ کے گیارہویں مقالہ تحفۃ المجاہدین کا ناتمام خلاصہ درج کیا ہے:

> ''جس کو اندرسن نے چند حواشی کے ساتھ انگریزی میں ترجمہ کر کے تذکرہ ملیبار کے عنوان سے ۱۸۸۶ء میں کلکتہ کے رسالہ ایشیاٹک میں چھپوایا ہے۔ علاوہ ازیں اور اردو میں بھی تاریخ فرشتہ کے جو ترجمے شائع ہوئے ہیں ان میں بھی یہ حصہ موجود ہے''۔[1]

اس اہم کتاب میں ہندوؤں کے رسم و رواج اور ان کے عادات و مراسم پر گفتگو ملتی ہے۔ مثلاً لکھا ہے:

> ''ملی بار میں ایک جماعت اصحاب الخیوط یعنی زناردراروں کی ہے یہ لوگ گلے میں ڈورا باندھنا لازم قرار دیتے ہیں۔ ان کی بھی کئی جماعتیں ہیں، اعلیٰ، ادنیٰ، متوسط۔ برہمن ان میں سب سے اعلیٰ شمار کیے جاتے ہیں۔ سب سے کمتر درجہ قوم نائر کا ہے۔ ان لوگوں کا پیشہ سپہ گری ہے۔ یہ لوگ جاہ و ثروت اور تعداد کے لحاظ سے اہل ملیبار میں سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ ان میں بھی اعلیٰ، ادنیٰ اور

---

[1] معبری، تحفۃ المجاہدین فی بعض اخبار البرتکالین، مترجم حکیم سید شمس اللہ قادری، شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ، ۱۹۳۶ء، ص ۶-۸

اوسط کا امتیاز ہے۔ان سے کم مرتبہ جماعت شعبدہ بازوں کی ہے یہ وہ لوگ ہیں
جو ناریل کے درختوں پر ناریل توڑنے کے لیے چڑھا کرتے ہیں'' [1]

مجالسِ جہاں گیری:

عبدالستار بن قاسم لاہوری کی ایک فارسی میں معرکۃ الآراء تصنیف مجالسِ جہاں گیری ہے۔ یہ کتاب کئی اعتبار سے اہم ہے ایک تو یہ کتاب مغل دور میں برصغیر کی درباری تہذیب کی پوری نمائندگی کرتی ہے۔اس کتاب میں ۱۲۲ مجالس کی تعداد ہے لیکن متن میں ۱۱۴ مجالس ہیں۔ ان مجالس میں جن موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

۱- جہانگیر اور اس کے دربار کے صوفیانہ رجحانات اور صوفیہ و مشائخ سے جہانگیر کی ارادت جیسا کہ مجلس ۱۷-۸۹ میں ذکر کیا گیا ہے۔

۱-مناظرہ اور ادبی بحث

۳-مذہبی مناظرے مجالس ۱۴، ۲۹، ۳۰، ۳۵، ۷۴، ۷۸، ۹۸

۴-فقہی و تفسیری مباحث

اس کے علاوہ اور دیگر ضروری اور اہم امور پر بحث کی گئی ہے۔اس میں تقابل ادیان اور مکالمہ ہونے کا تذکرہ ہے۔اس وجہ سے یہ ادیان و مذاہب کی تاریخ پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔

تزک جہاں گیری:

اس کتاب کی تالیف مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر نے کی ہے۔ یہ کتاب ہندوازم پر تو نہیں ہے البتہ اس میں ہندوؤں کے متعلق بہت ساری چیزیں ملتی ہیں۔مثلاً انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے۔ اہل ہند چار ذاتوں میں تقسیم ہیں ہر ذات کے اصول وضوابط الگ الگ ہیں۔ان کا سب سے اونچا طبقہ برہمنوں یعنی خدا کی پرستش کرنے والوں کا ہے۔ان کے چھ اصول ہیں (۱) علم حاصل کرنا (۲) دوسروں کو تربیت کرنا (۳) آگ کی پوجا کرنا (۴) دوسروں کو آگ کی پوجا کرنے کی طرف مائل کرنا (۵) محتاجوں کو خیرات کرنا (۶) امیروں سے خود خیرات لینا برسات

[1] معجری، تحفۃ المجاہدین فی بعض اخبار البرتکالین، مترجم حکیم سید شمس اللہ قادری، ص ۲۳

کے دوسرے مہینے ساون کے اخری دن کو مبارک خیال کرتے ہوئے پنڈت اور پجاری دریاؤں اور تالابوں کے کنارے جا کر رنگین ڈوریوں اور دھاگوں پر طرح طرح کے منتر پڑھ کر پھینکتے ہیں اور دوسرے دن جو نئے سال میں بھادوں کا پہلا دن ہوتا ہے۔ان پڑھے ہوئے ڈوروں اور دھاگوں کو جنہیں وہ راکھی کہتے ہیں بڑے بڑے لوگوں کی کلائیوں پر نیک شگوں خیال کرتے ہوئے باندھتے ہیں۔ان کا عقیدہ یہ ہے کہ راکھی نئے سال میں آنے والی ہر مصیبت و بلا سے محفوظ رکھتی ہے۔ ہندوؤں کا دوسرا طبقہ چھتری ہوتا ہے جنہیں کھتری بھی کہتے ہیں۔کھتری کا کام مظلوموں اور کمزوروں کی حفاظت کرنا ہے۔ان کے تین اصول ہیں (۱) خود تعلیم حاصل کرنا لیکن دوسروں کو تعلیم کی ممانعت کرنا۔(۲) خود آگ کی پوجا کرنا مگر دوسروں کو منع کرنا (۳) محتاجوں کو خیرات کرنا مگر خود غربت میں م خیرات نہ لینا۔ان کا مشہور تہوار دسہرا کہلاتا ہے اس دن کو دشمن پر حملہ کرنے کے لیے مبارک سمجھتے ہیں کیونکہ اسی دن رام چندر جسے وہ اپنا سب سے بڑا دیوتا خیال کرتے ہیں اپنے دشمن راون پر فتح پائی تھی۔ چنانچہ اس دن وہ راون کا مجسمہ بنا کر جلاتے ہیں اور اپنے ہاتھیوں اور گھوڑوں کو سجا کر ان کی پوجا کرتے ہیں۔ ہندوؤں کا تیسرا طبقہ ویش کہلاتا ہے یہ طبقہ برہمنوں اور کھتریوں کی مختلف طریقے سے خدمت کرتا ہے۔ یہ لوگ کھیتی باڑی، تجارت اور ساہوکار کا کام کرتے ہیں ان کا مشہور تہوار دیوالی ہے جو قمری مہینے کی ۲۸ تاریخ کو ہوتا ہے یہ لوگ دیوالی کی رات کو چراغاں کرتے ہیں۔ دوست اور عزیز و اقارب اچھے اچھے کپڑوں میں ملبوس ایک دوسرے کے گھروں پر جا کر خوب جوا کھیلتے ہیں اور اس رات کی ہار یا جیت کو نیک شگون پر محمول کرتے ہیں۔

ہندوؤں کا چوتھا طبقہ شودر کہلاتا ہے یہ سب سے نچلے لوگوں کا طبقہ ہے۔شودر تینوں طبقے کے ہندوؤں کی خدمت سرانجام دیتے ہیں اور ان تمام مراعات سے محروم ہیں جو مذکورہ بالا طبقوں کو حاصل ہیں۔ ان کا مشہور تہوار ہولی ہے جسے وہ سال کا آخری دن خیال کرتے ہیں[1] اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ اس کتاب میں ہندوؤں کے احوال و کوائف اور ان سے برتاؤ و سلوک کے متعلق ملتا ہے۔

---

[1] تزک جہاں گیری، اُردو ترجمہ، ص ۱۲۸-۱۲۹

ان کتابوں کے اقتباسات پیش کرنے سے قارئین اور معترضین کے سامنے ایک ہلکا سا خاکہ آ گیا ہوگا اور اندازہ ہوگیا ہوگا کے مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہندوازم کو بلا کسی تعصب کے مسلمانوں نے صرف پڑھا ہی نہیں ہے، بلکہ قلمبند بھی کیا ہے جن کتابوں کا تذکرہ سابقہ سطور میں ہوا ہے، یہ وہ کتابیں ہیں جو ہندو دھرم اور ان کی تاریخ تہذیب کو سمجھنے کے لیے سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ مسلم حکمرانوں کی رواداری اور ان کے اعلی کردار و اخلاق کے وہ عملی شاہ کار ہیں جو ہندوستان جیسے تکثیری سماج کے لیے نمونہ عمل ہیں۔اسی طرح ان مصنفین کے یہاں بھی بڑی توسع اور فکری بالیدگی ملتی ہے، جنھوں نے ان کتابوں کو بلا کسی تنگ نظری اور بھید بھاؤ کے پوری ایمانداری کے ساتھ تصنیف کیا۔ ورنہ عام طور پر لوگ جب دوسرے افکار یا ادیان و مذاہب پر روشنی ڈالتے ہیں تو ان کی تعلیمات میں ڈنڈی مارنے کا کام کرتے ہیں۔مگر ان کے یہاں اس طرح کی کوئی بات نہیں ملتی ہے۔

آخر میں یہ بھی بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آج ہمیں مل کر ان خطوط پر عمل کرنے کی ضرورت ہے جن سے معاشرے میں ہم آہنگی پیدا ہو، دوریاں اور نفرتیں ختم ہوں۔ سابقہ سطروں میں جو نمونے اور مسلم حکمرانوں کے عہد کے جو کارنامے پیش کیے گئے ہیں ان کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہندوستان جیسے تکثیری سماج میں تمام اقوام باہم مل جل کر رہیں۔

باب سوم

مسلم علماء، ہندو دھرم اور تکثیریت

ادیان و مذاہب میں اختلاف کی حقیقت

مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار کا مطالعہ

ابوالکلام محی الدین احمد آزاد (۱۸۸۸ء-۱۹۵۸ء) ہندوستان کی ان مقتدر اور نمایاں شخصیات میں شامل ہیں جنھوں نے ہندو مسلم اتحاد اور قومی ہم آہنگی و مشترکہ اقدار کے لیے تحریری اقدامات کرنے کے ساتھ ساتھ عملی اقدامات بھی کیے ہیں۔

مولانا آزاد کی تحریریں اور خطبات و ملفوظات و مکتوبات کو پڑھنے کے بعد اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے جہاں قوم کی رہنمائی اور ملت کے مسائل پر بڑی وقیع اور جامع آراء و نظریات پیش کیے ہیں تو وہیں حب الوطنی، سماجی عدل وانصاف، رواداری، انسان دوستی اور ہندو مسلم اشتراک و اجتماعیت پر بھی نہایت توسع کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ گویا ان کے افکار و نظریات کا محور دیگر اہم اور ضروری گوشوں کے ساتھ ساتھ۔ مذاکرات، ڈائیلاگ اور مطالعہ ادیان بطور خاص ہے۔ اس کا جیتا جاگتا ثبوت مولانا آزاد کی وہ تفسیر ہے جو انھوں نے 'ترجمان القرآن' کے نام سے تصنیف کی ہے۔ اس تفسیر کی پہلی جلد یعنی سورہ فاتحہ کی تفسیر میں جس طرح اتحاد و سالمیت اور یکجہتی، رواداری اور تکثیریت کے جو عناصر ملتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اسی طرح جب ہم مولانا آزاد کے رسالہ الہلال کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں بھی بہت سارا مواد تقابل ادیان پر موجود ہے۔ چنانچہ ذیل میں مولانا آزاد کی تحریروں میں تقابل ادیان کے حوالے سے جو عناصر ملتے ہیں ان پر روشنی ڈالی جائے گی۔

وحدت انسانیت کا فلسفہ

آج دنیا میں انسانوں کے مابین نوع بنوع کے اختلافات جنم لے چکے ہیں۔ جن کی

وجہ سے انسانیت کی بنیاد پر قائم اور باقی رہنے والے لوازمات پوری طرح مخدوش ہو رہے ہیں۔ ہمدردی، انسان دوستی، رواداری اور باہم الفت و محبت کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسانی رشتوں کو مضبوط کیا جائے۔ صرفِ نظر اس سے کہ کس کا دین و دھرم کیا ہے اور ایمان و عقیدہ کن چیزوں پر ہے؟ مولانا آزاد نے اس انسانی اختلافات کی بڑی سچی اور چشم کشا تصویر پیش کی ہے اور بتایا کہ انسانوں کے مابین صالح خطوط پر رشتہ اور بین مذہبی اشتراک اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب کہ ہم رشتہ عبودیت اور فلسفہ توحید سے پوری طرح وابستہ ہوں گے۔ کیوں کہ یہی ایک ذریعہ ہے انسانوں کو جوڑنے اور بین مذہبی اشتراک کو عملی جامہ پہنانے کا۔

> ''فطرت الٰہی کی راہ کائنات ہستی کے ہر گوشے میں ایک ہی ہے۔ وہ نہ تو ایک سے زیادہ ہو سکتی ہے نہ دگر باہم مختلف۔ پس ضروری تھا کی یہ ہدایت بھی اول دن سے ایک ہی ہوتی اور ایک ہی طرح پر تمام انسانوں کو مخاطب کرتی۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے: خدا کی جتنے پیغام بر پیدا ہوئے، خواہ وہ کسی زمانے اور کسی گوشے میں پیدا ہوئے ہوں، سب کی راہ ایک ہی تھی اور سب خدا کے ایک ہی عالمگیر قانون سعادت کی تعلیم دینے والے تھے۔ یہ عالمگیر قانون سعادت کیا ہے؟ ایمان اور عمل صالح کا قانون ہے، یعنی ایک پروردگار عالم کی پرستش کرنی اور نیک عمل کی زندگی بسر کرنی اس کے علاوہ اور اس کے خلاف جو کچھ بھی دین کے نام سے کہا جاتا ہے دین حقیقی کی تعلیم نہیں ہے''۔[1]

اس اقتباس کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ابتدا سے ادیان اور ان کی تعلیمات میں کوئی اختلاف نہیں تھا بلکہ تمام مذاہب کی تعلیمات ایک ہی تھیں۔ تمام بانیان مذاہب نے انسانوں کو ایک دین پر اکھٹے رہنے کی تعلیم دی مولانا آزاد اس حوالے سے رقم کرتے ہیں:

> ''دنیا میں کوئی بانی مذہب بھی ایسا نہیں ہوا ہے جس نے ایک ہی دین پر اکٹھے

[1] آزاد، ابوالکلام محی الدین، (مولانا) ترجمان القرآن، ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۸۹ء، ج ۱، ص ۳۵۸

رہنے اور تفرقہ و اختلاف سے بچنے کی تعلیم نہ دی ہو۔ سب کی تعلیم یہی تھی کہ خدا کا دین بچھڑے ہوئے انسانوں کو جمع کر دینے کے لیے ہے، الگ الگ کر دینے کے لیے نہیں ہے۔ بس ایک پروردگار عالم کی بندگی و نیاز میں سب متحد ہو جاؤ اور تفرقہ مخاصمت کی جگہ باہمی محبت و یک جہتی کی راہ اختیار کرو، خدا نے تمہیں ایک ہی جامہ انسانیت دیا تھا، لیکن تم نے طرح طرح کے بھیس اور نام اختیار کر لیے اور رشتۂ انسانیت کی وحدت سیکڑوں ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ تمہاری نسلیں بہت سی ہیں اس لیے تم نسل کے نام پر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہو۔ تمہارے وطن بہت سے بن گئے ہیں اس لیے اختلاف وطن کے نام پر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہو۔ تمہاری قومیتیں بے شمار ہیں اس لیے ہر قوم دوسری قوم سے دست و گریباں ہو رہی ہے تمھارے رنگ یکساں نہیں اور یہ بھی باہمی نفرت و عناد کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا ہے۔ تمہاری بولیاں مختلف ہیں اور یہ بھی ایک دوسرے سے جدا رہنے کی بہت بڑی حجت بن گئی ہے۔ پھر ان کے علاوہ امیر و آقا، وزیر و شریف، ضعیف و قوی، ادنی و اعلیٰ بے شمار اختلاف پیدا کر لیے گئے ہیں اور سب کا منشا یہ ہے کہ ایک دوسرے سے جدا ہو جاؤ اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہو۔ ایسی حالت میں بتلاؤ وہ رشتہ کون سا رشتہ ہے جو اتنے اختلافات رکھنے پر بھی انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دے اور انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانہ از سر نو آباد ہو جائے؟ صرف ایک ہی رشتہ باقی رہ گیا ہے اور وہ خدا پرستی کا مقدس رشتہ ہے۔ تم کتنے ہی الگ الگ ہو گئے ہو، لیکن تمہارے خدا الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ تم سب ایک ہی پروردگار کے بندے ہو۔ تم سب کی بندگی اور نیاز کے لیے ایک ہی معبود کی چوکھٹ ہے۔ تم بے شمار اختلافات رکھنے پر بھی ایک ہی رشتۂ عبودیت میں جکڑے ہوئے ہو۔ تمہاری کوئی نسل ہو، تمہارا کوئی وطن ہو، تمہاری کوئی قومیت ہو، تم کسی درجے میں اور کسی حلقے کے انسان ہو، لیکن جب ایک ہی پروردگار کے آگے سر نیاز جھکا

دو گے تو یہ آسمانی رشتہ تمہارے تمام ارضی اختلافات مٹا دے گا۔ تم سب کے بچھڑے ہوئے دل ایک دوسرے سے جڑ جائیں گے۔ تم محسوس کرو گے تمام دنیا تمہارا وطن ہے، تمام نسل انسانی تمہارا گھرانا ہے اور تم سب ایک ہی ''رب العالمین'' کی عیال ہو''۔[1]

فطری طور پر پوری مخلوق رب العالمین کی عیال ہے۔ یہ اسلام کا ایسا بنیادی اور اہم فلسفہ ہے جو دنیا میں رہنے والی تمام برادریوں، اقوام اور متنوع افکار و نظریات اور عقائد و ایمانیات کے ماننے والوں کو اتحاد و سالمیت اور یکجائیت و مرکزیت کی لڑی میں پروتا ہے۔ مولانا آزاد اپنی تحریروں میں بارہا اس بات کو واضح کرتے رہے ہیں کہ انسانیت کی بنیاد پر رشتوں کو اسی وقت دوام و استقرار حاصل ہوسکتا ہے جب کہ ہم معاشرے کی تکثیریت اور اس کے دینی تنوع کا پوری ایمانداری کے ساتھ خیال رکھیں گے۔ مولانا آزاد کے متذکرہ اقتباس سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ اختلاف خواہ وہ کسی بنیاد پر ہو ایک ناپسندیدہ عمل ہے تو وہیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کسی بھی تکثیری سماج اور بین مذہبی اشتراک کے لیے کن عوامل کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

وحدت ادیان کا نظریہ

آج بڑی شد و مد کے ساتھ یہ بات اٹھائی جارہی ہے کہ تمام ادیان ایک ہی ہیں۔ طریقۂ عبادت اور معبود کو پکارنے کے نام جدا جدا ہو سکتے ہیں۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی کسی بھی مذہب و دین کی تعلیمات و روایات کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ کسی نہ کسی طرح سے خالق سے وابستہ ہے۔ اسے دوسرے الفاظ میں وحدت ادیان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وحدت ادیان کا فلسفہ جو کہ عہد حاضر کا اہم موضوع ہے اس پر مولانا آزاد نے باقاعدہ اپنی معروف تفسیر 'ترجمان القرآن' میں بحث کی ہے۔ لہٰذا راقم اپنی رائے اور نظریہ پیش کرنے سے قبل ضروری سمجھتا ہے کہ وحدت ادیان کے حوالے سے مولانا آزاد کی رائے پیش کی جائے۔ مولانا آزاد رقم کرتے ہیں کہ ابتدا میں نوع انسانیت میں کوئی

[1] آزاد، ابوالکلام محی الدین، (مولانا) ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۲۶۹-۲۶۱

اختلاف نہیں تھا سب ایک ہی نہج پر تھے۔ اختلاف انسانیت کے مابین کیوں بپا ہوا، اس کو مولانا آزاد اس طرح بتاتے ہیں:

''ابتدا میں انسانی جمعیت کا یہ حال تھا کہ لوگ قدرتی زندگی بسر کرتے تھے اور ان میں نہ تو کسی طرح کا باہمی اختلاف تھا نہ کسی طرح کی مخاصمت۔ سب کی زندگی ایک ہی طرح کی تھی اور سب اپنی قدرتی یگانگت پر قانع تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ نسل انسانی کی کثرت اور ضروریات کی معیشت کی وسعت سے طرح طرح کے اختلافات پیدا ہوگئے اور اختلافات نے تفرقہ وانقطاع اور ظلم وفساد کی صورت اختیار کرلی۔ ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرنے لگا اور ہر زبردست زیردست کے حقوق پامال کرنے لگا۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوئی تو ضروری ہوا کہ نوعِ انسانی کی ہدایت اور عدل وصداقت کے قیام کے لیے وحی الٰہی کی روشنی نمودار ہو۔ چنانچہ یہ روشنی نمودار ہوئی اور خدا کے رسول کی دعوت وتبلیغ کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ وہ ان تمام رہنماؤں کو جن کے ذریعے اس ہدایت کا سلسلہ قائم ہوا ''رسول'' کے نام سے تعبیر کرتا ہے کیونکہ وہ خدا کی سچائی کا پیغام پہنچانے والے تھے اور رسول کے معنی پیغام پہنچانے والے کے ہیں''۔[1]

جب دنیا میں انسانی تقاضے اور ضروریات بڑھنے لگیں تو پھر باہم قوموں اور معاشروں کے مابین اختلاف اور تنازع پیدا ہوا۔ عدل وانصاف اور مساوات جیسی تعلیمات کو پامال کیا جانے لگا، یہی نہیں بلکہ ظلم وتعدی اور ستم وایذا رسانی کے در پہ آ گئے تو خالق کائنات نے انسانیت کی رہنمائی اور زمین پر عدل وانصاف کا سکہ مہر بند کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے مقدس ومحترم سلسلہ کو شروع کیا۔ یعنی مولانا آزاد کا کہنا صاف ہے کہ روئے زمین پر رسولوں کو نوع بشر کی ہدایت ورہنمائی کے لیے مبعوث کیا ہے۔ مولانا آزاد مزید لکھتے ہیں کہ یہ ہدایت کسی خاص قوم یا سماج ومعاشرے کے لیے خاص نہیں تھی۔

''یہ ہدایت کسی خاص ملک وقوم یا عہد کے لیے مخصوص نہیں تھی، بلکہ تمام نوع

[1] آزاد، ابوالکلام محی الدین، (مولانا) ترجمان القرآن، ج ۱، ۳۵۲-۳۵۳

انسانی کے لیے تھی۔ چنانچہ ہر زمانے اور ہر ملک میں یکساں طور پر اس کا ظہور ہوا۔ قرآن کہتا ہے: دنیا کا کوئی گوشہ نہیں جہاں نسل انسانی آباد ہوئی ہو اور خدا کا کوئی رسول مبعوث نہ ہوا ہو''۔[1]

اسی طرح مولانا آزاد ایک جگہ مزید لکھتے ہیں۔

''خدا کی جتنے رسول بھی پیدا ہوئے، سب کی تعلیم یہی تھی کہ ''الدین'' پر یعنی بنی نوع انسانی ایک ہی عالمگیر دین پر قائم رہو اور اس راہ میں ایک دوسرے سے الگ الگ نہ ہو جاؤ''۔[2]

اب فطری طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام نوع انسانی کے لے ایک ہی دین ہے تو پھر یہ باہمی اختلاف دین اور شرائع میں کیوں پیدا ہوا؟ اس سوال کو اٹھایا اور مولانا آزاد نے اس کا جواب بھی درج ذیل الفاظ میں دیا ہے:

''مذاہب کا اختلاف دو طرح کا ہے۔ ایک اختلاف تو وہ ہے جو پیروان مذاہب نے مذہب کی حقیقی تعلیم سے منحرف ہو کر پیدا کر لیا ہے۔ یہ اختلاف مذاہب کا اختلاف نہیں ہے، پیروان مذہب کی گمراہی کا نتیجہ ہے۔ دوسرا اختلاف وہ ہے جو فی الحقیقت مذاہب کے احکام و اعمال میں پایا جاتا ہے مثلاً ایک مذہب میں عبادت کی کوئی خاص شکل اختیار کی گئی ہے، دوسرے میں کوئی دوسری شکل، تو یہ اختلاف اصل و حقیقت کا اختلاف نہیں ہے۔ محض فروغ وظواہر کا اختلاف ہے اور ضروری تھا کہ ظہور میں آتا۔

مذاہب کی تعلیم دو قسم کی باتوں سے مرکب ہے۔ ایک قسم تو وہ ہے جو ان کی روح وحقیقت ہے، دوسری وہ ہے جس سے ان کی ظاہری شکل وصورت آراستہ کی گئی ہے۔ پہلی چیز اصل ہے، دوسری فرع ہے پہلی چیز کو وہ ''دین'' سے تعبیر کرتا ہے، دوسری کو ''شرع'' اور ''نسک'' سے اور اس کے لیے ''منہاج'' کا لفظ بھی

---

[1] آزاد، ابوالکلام محی الدین، (مولانا) ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۳۴۵

[2] ایضاً، ص ۳۶۱-۳۶۲

استعمال کیا گیا ہے۔ ''شرع'' اور ''منہاج'' کے معنی راہ کے ہیں اور ''نسک'' سے مقصود عبادت کا طور طریقہ ہے۔ پھر اصطلاح میں ''شرع'' قانون مذہب کو کہنے لگے اور ''نسک'' عبادت کو۔ مذاہب میں جس قدر بھی اختلاف ان کا اصلی اختلاف ہے، وہ ''دین'' کا اختلاف نہیں۔ محض شرع ومنہاج کا اختلاف ہے، یعنی اصل کا نہیں فرع کا ہے، حقیقت کا نہیں ظواہر کا ہے، روح کا نہیں، صورت کا ہے اور ضروری تھا کہ یہ اختلاف ظہور میں آتا۔ مذہب کا مقصود انسانی جمعیت کی سعادت اصلاح ہے، لیکن انسانی جمعیت کے احوال وظروف ہر عہد اور ہر ملک میں یکساں نہیں رہے ہیں اور نہ یکساں رہ سکتے تھے۔ کسی زمانے کی معاشرتی اور ذہنی استعداد ایک خاص طرح کی نوعیت رکھتی تھی، کسی زمانے میں ایک خاص طرح کی۔ کسی ملک کے حالات ایک خاص طرح کی معیشت چاہتے تھے، کسی دوسرے ملک کے حالات دوسری طرح کی۔ بس جس مذہب کا ظہور جیسے زمانے میں اور جیسی استعداد وطبیعت کے لوگوں میں ہوا، اسی کے مطابق شرع ومنہاج کی صورت بھی اختیار کی گئی۔ جس عہد اور جس ملک میں جو صورت اختیار کی گئی وہی اس کے لیے موزوں تھی۔ اسی لیے ہر صورت اپنی جگہ بہتر اور حق ہے۔ اور یہ اختلاف اس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے جتنی اہمیت نوع بشری کے تمام معاشرتی اور طبعی اختلافات کو دی جاسکتی ہے'' [1]

متذکرہ بالا اقتباس سے وحدت ادیان کے حوالے سے جو نظریہ اور رائے پتہ چلتی ہے وہ یہ کہ آج مذاہب وادیان کے مابین جو اختلافات نظر آتے ہیں وہ شرع اور منہاج میں ہیں۔ اصل دین میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ اختلاف اصل دین میں نہیں ہے بلکہ شرع اور منہاج یعنی طریقہ عبادت اور رسم ورواج میں ہے تو پھر یہ اختلاف کیوں نظر آتا ہے۔ اس کا جواب مولانا آزاد اس طرح دیتے ہیں:

[1] آزاد، ابوالکلام محی الدین، (مولانا) ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۳۶۶-۳۶۸

''اعمال ورسوم نہ تو دین کی اصل وحقیقت ہیں نہ ان کا اختلاف حق و باطل کا اختلاف ہے۔ یہ محض مذہب کی عملی زندگی کا ظاہری ڈھانچہ ہے، مگر روح وحقیقت ان سے بالاتر ہے اور وہی اصل دین ہے۔ یہ اصل دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ ہی کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔ اور چونکہ یہ اصل دین ہے، اس لیے نہ تو اس میں تغیر ہوا نہ کسی کا اختلاف رونما ہوا۔ اعمال ورسوم فرع ہیں، اس لیے ہر زمانے اور ہر ملک کی حالت کے مطابق بدلتے رہے اور جس قدر بھی اختلاف ہوا انہیں میں ہوا''۔[1]

گویا یہ جو اختلاف ادیان ومذاہب کے اندر دیکھ رہے ہیں وہ اختلاف اصل کا نہیں ہے بلکہ پیروان مذاہب کا ہے۔ لہٰذا اس کو بناء نزاع نہیں بنانا چاہیے۔ مذکورہ تفصیل سے یہ بات پتا چلتی ہے کہ مولانا آزاد کا نظریہ کہیں نہ کہیں وحدت ادیان کا رہا ہے۔ اس نوعیت کی پوری تفصیل ان کی تفسیر ترجمان القرآن میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ہندو مسلم اتحاد اور رواداری

موجودہ عہد میں جس طرح انسانی قدریں اور باہمی رشتے محض شک اور غلط فہمیوں کی بنیاد پر پاش پاش ہورہے۔ یہ صورت حال نہایت افسوس ناک ہے۔ اس کی بہت ساری وجوہات ہیں۔ البتہ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان میں مذاہب کی کثرت اور صدیوں پرانی مشترکہ وقومی روایات نے ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا تھا جس میں تمام مذاہب کا احترام، عقائد ونظریات اور ہر ایک کے فکر وفلسفہ کا تحفظ کیا جاتا تھا۔ اس تناظر میں موجودہ ہندوستان یا عالمی منظرنامے پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اب باہمی رشتے ہی کمزور نہیں ہورہے ہیں بلکہ ایسے عوامل ومحرکات اختیار کیے جارہے ہیں جو مذاہب وادیان کی مشترکہ قدروں اور باہمی اعتماد وارتباط کو بھی بری طرح مجروح کررہے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم ان

---

[1] آزاد، ابوالکلام محی الدین، (مولانا) ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۳۷۳-۳۷۴

حالات میں ملک کی سالمیت اور گنگا جمنی تہذیب کی افادیت و معنویت کو سمجھیں۔ چنانچہ مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں رواداری کا نہایت جامع تصور پیش کیا ہے۔

''رواداری یہ ہے کہ اپنے حق و اعتقاد و عمل کے ساتھ دوسرے کے حق و اعتقاد و عمل کا بھی اعتراف کیجیے۔ اور اگر دوسرے کی راہ آپ کو صریح غلط دکھائی دے رہی ہے، جب بھی اس کے اس حق سے انکار نہ کیجیے کہ وہ اپنی غلط راہ پر بھی چل سکتا ہے۔ لیکن اگر رواداری کے حدود یہاں تک بڑھا دیئے گئے کہ وہ آپ کے عقیدوں میں بھی مداخلت کر سکتی ہے اور آپ کے فیصلوں کو بھی نرم کر دے سکتی ہے تو پھر یہ رواداری نہ ہوئی، استقامت فکر کی نفی ہوگی''۔[1]

مولانا آزاد ہندو مسلم اتحاد کے حوالے سے اپنے ایک صدارتی خطاب میں فرماتے ہیں:

''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور بھی احساس رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جائے گا اس تکوین کا ایک ناگزیر عامل ہوں۔ میں اپنے اس دعوی سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل

[1] آزاد، ابوالکلام محی الدین، (مولانا) ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۳۶۵-۳۶۶

بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ آپ لوگوں کی آمد شروع ہوگئی۔ انہیں قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروان اسلام کا بھی تھا یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پہ چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملنا تھا۔ یہ گنگا جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔ تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں، اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعوی ہندو مذہب کا ہے۔ ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامان سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم ورواج، ہماری روزانہ زندگی کی بیشمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ چکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم ورواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل کر ایک نیا سانچا پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں چل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہماری اس ہزار برس کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہی قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا اور قدرت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ

کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور نا قابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو تو دو نہیں بنا سکتا۔ہمیں قدرت کے فیصلہ پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے''۔[1]

متذکرہ اقتباس کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان ملی جلی تہذیب اور مشترکہ ثقافت کی سرزمین ہے، لہٰذا وطن عزیز کی تعمیر وترقی اور خوشحالی کا پہلا اصول یہ ہے ملک کی تمام قومیں اور برادریاں باہم مل کر رہیں، تفریق وامتیاز اور بھید بھاؤ کو کسی بھی ناحیہ سے نہ پنپنے دیں۔

ادیان و مذاہب میں توحید کے عناصر

مولانا آزاد نے اپنی معروف تفسیر 'ترجمان القرآن' کی پہلی جلد میں ایک دلچسپ اور علمی گفتگو یہ کی ہے کہ جس وقت قرآن کریم کا نزول ہوا اس وقت کائنات میں کتنے دینی تصور پائے جاتے تھے۔اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بحث بھی کی ہے آیا ان مذاہب میں توحید کے سلسلہ میں کیا تصور تھا۔مولانا آزاد رقم کرتے ہیں کہ اس وقت یعنی ظہور قرآن کے وقت پانچ دینی تصورات پائے جاتے تھے۔چینی، ہندوستانی، مجوسی، یہودی اور مسیحی۔[2]

ان تمام مذاہب وافکار اور ادیان کی تعلیمات کیا تھیں اور ان میں توحید کا تصور موجود تھا یا نہیں؟ ان تمام باتوں پر بڑی علمی گفتگو کی ہے۔چین میں جو دینی اور فکری تصور پایا جاتا تھا اس کے متعلق مولانا آزاد کی رائے درج ذیل ہے:

''چین میں قدیم زمانے سے مقامی خداؤں کے ساتھ ایک ''آسمانی'' ہستی کا اعتقاد بھی موجود تھا۔ایک ایسی بلند اور عظیم ہستی جس کی علویت کے تصور کے لیے ہم آسمان کے سوا اور کسی طرف نظر نہیں اٹھا سکتے۔آسمان حسن وبخشائش کا

---

[1] پروفیسر اختر الواسع کا مطبوعہ مضمون، سرسید اور مولانا آزاد کی فکر میں تکثیریت کے عناصر

[2] آزاد، ابوالکلام محی الدین، ترجمان القرآن، ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۸۹ء، ج ۱، ص ۲۵۸

بھی مظہر ہے، قہر وغضب کی بھی ہولناکی ہے۔ اس کا سورج روشنی اور حرارت بخشتا ہے، اس کے ستارے اندھیری راتوں میں قندیلیں روشن کر دیتے ہیں۔ اس کی بارش زمین کو طرح طرح کی روئیدگیوں سے معمور کر دیتی ہے۔ لیکن اس کی بجلیاں ہلاکت کا بھی پیام ہیں اور اس کی گرج دلوں کو دہلا بھی دیتی ہے۔ اس لیے آسمانی خدا کے تصور میں بھی دونوں صفتیں نمودار ہوئیں۔ ایک طرف اس کی جود وبخشایش ہے، دوسری طرف اس کا قہر وغضب ہے۔ چینی شاعری کی قدیم کتاب میں ہم قدیم ترین چینی تصورات کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ ان میں جا بجا ہمیں ایسے مخاطبات ملتے ہیں جن میں آسمانی اعمال کی ان متضاد نمودوں پر حیرانی وسرگشتگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ تیرے کاموں میں یکسانی اور ہم آہنگی نہیں؟ تو زندگی بھی بخشتا ہے اور تیرے پاس ہلاکت کی بجلیاں بھی ہیں'' ۔[1]

مولانا آزاد مزید لکھتے ہیں:

''اس آسمانی ہستی کے علاوہ گزرے ہوئے انسانوں کی روحیں بھی تھیں جنہیں دوسرے عالم میں پہنچ کر تدبیر وتصرف کی طاقت حاصل ہوگئی تھی اور اس لیے پرستش کی مستحق سمجھ گئی تھیں ہر خاندان اپنی معبود روحیں رکھتا تھا اور ہر علاقہ اپنا مقامی خدا'' ۔[2]

گویا یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ چینی تصور میں خدا کے تصور کی جگہ آسمانی ہستی کا اعتقاد پیدا ہوگیا تھا۔ آسمان کو سب کچھ سمجھ لیا گیا تھا۔ اسی کو مولانا آزاد مزید لکھتے ہیں:

''یہ ''آسمان'' چینی تصور کا ایک ایسا بنیادی عنصر بن گیا کہ چینی جمیعت آسمانی جمعیت اور چینی مملکت آسمانی مملکت کے نام سے پکارے جانے لگے ۔[3]

---

[1] آزاد، ابوالکلام محی الدین، ترجمان القرآن، ج ا، ص ۲۵۹

[2] ایضاً، ص: ۲۶۰

[3] ایضاً، ص: ۲۵۹

مجوسیت

مولانا آزاد اپنی متذکرہ تفسیر میں مجوسیت اور اس میں تصور توحید یا طریقہ عبادت و پرستش کے متعلق رقم کرتے ہیں:

> ''زردشت کے ظہور سے پہلے مادا (میڈیا-Media) اور پارس میں ایک قدیم ایرانی طریق پرستش رائج تھا۔ ہندوستان کے ویدوں میں دیوتاؤں کی پرستش اور قربانیوں کے اعمال ورسوم جس طرح پائے جاتے ہیں قریب قریب ویسے ہی عقائد اور اصول پارس اور مادا میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔ دیوتائی طاقتوں کو ان کے دو بڑے مظاہروں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک طاقت روشن ہستیوں کی تھی جو انسان کو زندگی کی تمام خوشیاں بخشتی تھی۔ دوسری برائی کے تاریک عفریتوں کی تھی جو ہر طرح کی مصیبتوں اور ہلاکتوں کا سرچشمہ تھی۔ آگ کی پرستش کے لیے قربان گاہیں بنائی جاتی تھیں اور ان کے پجاریوں کو ''موگوش'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اوستا کے گاتھا میں انہیں ''کارپان'' اور ''کاری'' کے نام سے بھی پکارا گیا ہے. آگے چل کر اسی ''موگوش'' نے آتش پرستی کا مفہوم پیدا کر لیا اور غیر قومیں ایرانیوں کو 'مگ' اور ''مگوش'' کے نام سے پکارنے لگیں۔ عربوں نے اسی ''موگوش'' کو ''مجوس'' کر دیا''۔[1]

مجوسیت اور زردشت مذہب کی تاریخ وثقافت بیان کرنے کے بعد مولانا آزاد مزید رقم طراز ہیں:

> ''زردشت کا جب ظہور ہوا تو اس نے ایرانیوں کو ان قدیم عقائد سے نجات دلائی اور ''مزدیسنا'' کی تعلیم یعنی دیوتاؤں کی جگہ ایک خدائے واحد ''اھورا مزدا'' کی پرستش کی یہ اھورا مزدا یگانہ بے ہمتا ہے، بے مثال ہے، نور ہے، پاکی ہے، سرتاسر حکمت اور خیر ہے اور تمام کائنات کا خالق ہے، اس نے انسان کے

---

[1] آزاد، ابوالکلام محی الدین، ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۲۷۸-۲۷۹

لیے دو عالم بنائے۔ ایک دنیوی زندگی کا ہے، دوسرا مرنے کے بعد کی زندگی کا۔ مرنے کے بعد جسم فنا ہو جاتا ہے مگر روح باقی رہتی ہے اور اپنے اعمال کے مطابق جزیاتی ہے۔ دیوتاؤں کی جگہ اس نے ''امش سپند'' اور ''یزتا'' کا تصور پیدا کیا، یعنی فرشتوں کا۔ یہ فرشتے اھورا مزدا کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ برائی اور تاریکی کی طاقتوں کی جگہ ''انگرامے نیوش (Angrame Niyush) کی ہستی کی خبر دی یعنی شیطان کی یہی ''انگرامے نیوش'' پازند کی زبان میں اہرمن ہو گیا''۔[1]

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مجوسیت میں توحید کا عنصر پایا جاتا تھا۔ یعنی دیوتاؤں اور اس طرح کی عبادتوں کے طریقوں سے ایرانیوں کو دور کیا گیا اور انہیں توحید کی طرف بلایا گیا۔ گرچہ اس کے بعض عقائد سے اسلام کے عقائد سے مطابقت نہیں ہوتی ہے۔

اسی طرح مولانا آزاد نے مجوسیت کے حوالے سے لکھا ہے کہ مجوسی عقائد کی بنیاد واساس ثنویت پر تھی یعنی دو چیزیں پائی جاتی تھیں خیر وشر:

''مجوسی تصور کی بنیاد ثنویت (Dualism) کے عقیدے پر تھی۔ یعنی خیر اور شر کی دو الگ الگ قوتیں ہیں۔ ''اھورا مزدا'' جو کچھ کرتا ہے خیر اور روشنی ہے۔ ''انگرامے نیوشن'' یعنی اہرمن جو کچھ کرتا ہے شر اور تاریکی ہے۔ عبادت کی بنیاد سورج اور آگ کی پرستش پر رکھی گئی کہ روشنی یزدانی صفات کی سب سے بڑی مظہر ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مجوسی تصور نے خیر اور شر کی گتھی یوں سلجھانی چاہی کہ کارخانۂ ہستی کی سربراہی دو متقابل اور متعارض قوتوں میں تقسیم کر دی''۔[2]

مذکورہ اقتباس سے جو مجوسیت کا تصور ابھرتا ہے وہ اسلام کے عقیدۂ توحید اور خدا کی ذات وصفات سے پوری طرح متضاد ہے۔

---

[1] آزاد، ابوالکلام محی الدین، ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۲۷۹-۲۸۰

[2] ایضاً، ص: ۲۸۱

یہودیت

یہودیت کے متعلق مولانا آزاد تحریر کرتے ہیں:

''یہودی تصور ابتدا میں ایک محدود نسلی تصور تھا یعنی کتاب پیدائش کا ''یہوا'' خاندان اسرائیل کے نسلی خدا کی حیثیت سے نمایاں ہوا تھا، لیکن پھر یہ تصور بتدریج وسیع ہوتا گیا، یہاں تک کہ یشعیا دوم کے صحیفے میں ''تمام قوموں کا خدا'' اور ''تمام قوموں کا ہیکل'' نمایاں ہو گیا۔ تاہم ''اسرائیلی خدا'' کا نسلی اختصاص کسی نہ کسی شکل میں برابر کام کرتا ہی رہا اور ظہور اسلام کے وقت اس کے نمایاں خال و خط نسخ اور جغرافیہ ہی کے خال و خط تھے۔

تجسم اور تنزیہ کے اعتبار سے وہ ایک درمیانی درجہ رکھتا تھا اور اس میں غالب عنصر قہر و غضب اور انتقام و تعذیب کا تھا۔ خدا کا بار بار متشکل ہو کر نمودار ہونا، مخاطبات کا تمام تر انسانی اوصاف و جذبات سے آلودہ ہونا، قہر و انتقام کی شدت اور ابتدائی درجے کا تمثیلی اسلوب تورات کے صحیفوں کا عام تصور ہے۔

خدا کا انسان سے رشتہ اس نوعیت کا رشتہ ہوا جیسے ایک شوہر کا اپنی بیوی سے ہوتا ہے۔ شوہر نہایت غیور ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی ساری خطائیں معاف کر دے گا، لیکن یہ جرم معاف نہیں کرے کہ اس کی محبت میں کسی دوسرے مرد کو بھی شریک کر لیے۔ اسی طرح خاندان کا خدا بھی بہت غیور ہے۔ اس نے اسرائیل کے گھرانے کو اپنی بیوی بنایا اور چونکہ چہیتی بیوی بنایا۔ اس لیے خاندان اسرائیل کی بے وفائی اور غیر قوموں سے آشنائی اس پر بہت ہی شاق گزرتی ہے اور ضروری ہے کہ وہ اس جرم کے بدلے سخت سزائیں دے۔

چنانچہ احکام عشرہ (Ten Commandments) میں ایک حکم یہ بھی تھا ''تو کسی چیز کی صورت نہ بنائیو اور نہ اس کے آگے جھکیو، کیونکہ میں خداوند تیرا خدا رشک کرنے والا بہت ہی غیور خدا ہوں''۔[1]

---

[1] آزاد، ابوالکلام محی الدین، ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۲۸۱-۲۸۳

اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہودیت میں ایک خدا کی عبادت کا حکم موجود ہے اور کسی دوسرے کے سامنے نہ جھکنے کا بھی تصور پایا جاتا ہے۔ اگر اس معاملہ میں یہودیت اور اسلام کا تقابل کیا جائے تو دونوں میں یکسانیت اور توازن نظر آتا ہے۔

عیسائیت

عیسائیت کا جو نظریہ اور اس کے ماننے والوں کا تصور ہے اس کو مولانا آزاد نے اس طرح تحریر کیا ہے:

> ''عیسائیت آئی تو رحم و محبت اور عفو و بخشش کا ایک نیا تصور لے کر آئی۔ اب خدا کا تصور نہ تو جابر بادشاہ کی طرح قہر آلود تھا نہ شک و غیرت میں ڈوبے ہوئے شوہر کی طرح سخت گیر تھا، بلکہ باپ کی محبت و شفقت کی مثال نمایاں کرتا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہودی تصور کی شدت و غلظت کے مقابلے میں رحم و محبت کی رقت کا یہ ایک انقلابی تصور تھا۔ انسانی زندگی کے سارے رشتوں میں ماں باپ کا رشتہ سب سے بلند تر رشتہ ہے اس میں شوہر کے رشتے کی طرح جذبوں اور خواہشوں کی غرضوں کو دخل نہیں ہوتا یہ سراسر رحم و شفقت اور پرورش و چارہ سازی ہوتی ہے۔ اولاد بار بار قصور کرے گی، لیکن ماں کی محبت پھر بھی گردن نہیں موڑے گی اور باپ کی شفقت پھر بھی معافی سے انکار نہیں کرے گا۔ پس اگر خدا کے تصور کے لیے انسانی رشتوں کی مشابہتوں سے کام لیے بغیر چارہ نہ ہو تو بلاشبہ شوہر کی تمثیل کے مقابلے میں باپ کی تمثیل کہیں زیادہ شائستہ اور ترقی یافتہ تمثیل ہے۔
>
> تجسم اور تنزہ کے لحاظ سے مسیحی تصور کی سطح اصلا وہی تھی جہاں تک یہودی تصور پہنچ چکا تھا۔ مگر جب مسیحی عقائد کا رومی اصنام پرستی کے تصوروں سے امتزاج ہوا تو اقانیم ثلاثہ، کفارہ اور مسیح پرستی کے تصورات چھا گئے اور اسکندریہ کے فلسفہ آمیز اصنامی تصور سیراپس (Serapis) نے مسیحی اصنامی تصور کی شکل

اختیار کر لی۔ اب مسیحیت کو بت پرستوں کی بت پرستی سے تو انکار تھا، لیکن خود اپنی بت پرستی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ میڈونا (Madonna) کے قدیم بت کی جگہ اب ایک نئی مسیحی میڈونا کا بت تیار ہو گیا۔ یہ خدا کے فرزند کو گود میں لیے ہوئے تھی اور ہر راسخ الاعتقاد مسیحی کی جبیں نیاز کا سجدہ طلب کرتی تھی۔

غرضیکہ قرآن کا جب نزول ہوا تو مسیحی تصور رحم و محبت کی فطری تمثیل کے ساتھ اقانیم ثلاثہ کفارہ اور تجسم کا ایک مخلوط ''اشراکی--توحیدی'' تصور تھا'' [1]

بدھ مذہب

یہ بات سب کو بخوبی معلوم ہے کہ ہندوستانی سرزمین ادیان و مذاھب اور افکار ونظریات اور تعدد وتکثیریت کے لیے جانی جاتی ہے۔ ہندو مذہب کے ساتھ ساتھ یہاں دیگر کئی ادیان پائے جاتے ہیں جیسے سکھ مت، جین مت، اور بدھ مت وغیرہ وغیرہ۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر 'ترجمان القرآن' میں بدھ مت کے افکار ونظریات اور ان کے عقائد واعمال کی بابت بڑی دلچسپ معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ چنانچہ وہ بدھ مت کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''شمنی مذہب (بدھ مذہب) کی اعتقادی مبادیات کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔ انیسویں صدی کے مستشرقوں کے ایک گروہ نے اسے اپنشدوں کی تعلیم ہی کا ایک عملی استغراق قرار دیا تھا اور خیال کیا تھا کہ ''نروان'' میں جذب و انفصال کی روحانی اصل پوشیدہ ہے۔ یعنی جس سرچشمے سے انسانی ہستی نکلی ہے، پھر اسی میں واصل ہو جانا ''نروان'' یعنی نجات کامل ہے۔ لیکن اب عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ شمنی مذہب (بدھ مذہب) خدا اور روح کی ہستی کا کوئی تصور نہیں رکھتا۔ اس کا دائرہ اعتقاد وعمل صرف زندگی کی سعادت اور نجات کے مسئلے میں محدود ہے۔ وہ صرف پرکرتی یعنی مادہ ازلی کا حوالہ دیتا ہے

[1] آزاد، ابوالکلام محی الدین، ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۲۸۳-۲۸۵

جسے کائناتی طبیعت حرکت میں لاتی ہے۔ نروان سے مقصود یہ ہے کہ ہستی کی انانیت فنا ہوجائے اور زندگی کے چکر سے نجات مل جائے''۔[1]

مولانا آزاد مزید لکھتے ہیں

''گوتم بدھ اور اس کی تعلیم کے شارحوں کی تصریحات اس بارے میں کچھ بھی رہی ہوں، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس کے پیروؤں نے خدا کے تصور کی خالی مسند بہت جلد بھر دی۔ انھوں نے اس مسند کو خالی دیکھا تو خود گوتم بدھ کو وہاں لاکر بٹھا دیا اور پھر اس نئے معبود کی پرستش اس جوش وخروش کے ساتھ شروع کر دی کہ آدھی سے زیادہ دنیا اس کے بتوں سے معمور ہوگئی''۔[2]

ان تمام احوال اور مسائل کے بعد بدھ مت میں اختلاف پیدا ہوگیا اور بالآخر بدھ مت میں دو فرقے بن گئے جنہیں ''ہین یان'' اور ''مہایان'' کے نام سے جانا جاتا ہے ان دو فرقوں کی تفصیل مولانا آزاد نے اس طرح لکھی ہے:

''بالآخر پیروان بدھ بدو بڑے فرقوں میں بٹ گئیں ''ہین یان'' (Hinayan) اور ''مہایان'' (Mahayana)۔ پہلا فرقہ بدھ کی شخصیت میں ایک رہنما اور معلم کی انسانی شخصیت دیکھنا چاہتا تھا، لیکن دوسرے نے اسے پوری طرح ماوراء انسانیت کی زبانی سطح پر متمکن کر دیا تھا اور پیروان بدھ کی عام راہ وہی ہوگئی تھی۔ افغانستان، بامیان ں، وسط ایشیا، چین، کوریا، جاپان، تبت، سب میں مہایان مذہب ہی کی تبلیغ واشاعت ہوئی۔ چینی سیاح فاہین (Fa Hien) جب چوتھی صدی مسیحی میں ہندوستان آیا تھا اور مہایان طریقے کی صداقت کے دلائل پیش کیے تھے۔ موجودہ زمانے میں سیلون کے سوا جہاں ہین یان طریقہ کا ایک محرف بقیہ ''تھیراواد'' کے نام سے پایا جاتا ہے، تمام پیروان بدھ کا مذہب مہایان ہے''۔[3]

---

[1] آزاد، ابوالکلام محی الدین، ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۲۷۳

[2] ایضاً، ص: ۲۷۶ [3] ایضاً، ص: ۲۷۷-۲۷۸

ہندو مذہب

مولانا آزاد نے ہندوازم کے تصور توحید اور طریقہ عبادت کے حوالے سے نہایت اہم گفتگو کی ہے ان کا نظریہ یہ ہے کہ ہندوستان میں الوہیت کی تاریخ بڑی متضاد اور مختلف ہے۔ کیونکہ ایک طرف ہندوازم کا توحیدی فلسفہ ہے اور دوسری طرف اس کا عملی مذہب ہے۔ اس کو مولانا آزاد کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے:

> ''ہندوستان کے تصور الوہیت کی تاریخ متضاد تصوروں کا ایک حیرت انگیز منظر ہے۔ ایک طرف اس کا توحیدی فلسفہ ہے اور دوسری طرف اس کا عملی مذہب ہے۔ توحیدی فلسفے نے استغراق فکر و عمل کے نہایت گہرے اور دقیق مرحلے طے کیے اور معاملے کو فکری بلندیوں کی ایک ایسی اونچی سطح تک پہنچا دیا جس کی کوئی دوسری مثال ہمیں قدیم قوموں کے مذہبی تصورات میں نہیں ملتی۔ عملی مذہب نے اشراک اور تعدد الہ کی بے روک راہ اختیار کی اور اصنامی تصوروں کو اتنی دور تک پھیل نے دیا کہ ہر پتھر معبود ہو گیا، ہر درخت خدائی کرنے لگا اور ہر چوکھٹ سجدہ گاہ بن گئی۔ وہ بہ یک وقت زیادہ سے زیادہ بلندی کی طرف بھی اڑا اور زیادہ سے زیادہ پستی میں بھی گرا۔ اس کے خواص نے اپنے لیے توحید کی جگہ پسند کی اور عوام کے لیے اشراک اور اصنام پرستی کی راہ مناسب سمجھی''۔[1]

پتہ یہ چلا کہ ہندوازم میں توحید کی بابت دو نظریات ہیں ایک نظریہ تو عوام کا ہے جو شرک فی الذات اور شرک فی الصفات سے عبارت ہے۔ البتہ خواص کا نظریہ توحید پر مبنی ہے جو ہر طرح کے شرک و بدعت سے مبرہ ہے۔ ہندوازم میں توحید کے تصور کو مزید بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''رگ وید کے زم زموں میں ہمیں ایک طرف مظاہر قدرت کی پرستش کا ابتدائی تصور بتدریج پھیلتا اور مجسم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ دوسری طرف ایک بالاتر اور

---

[1] آزاد، ابوالکلام محی الدین، ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۲۶۲-۲۶۳

خالق کل ہستی کا توحیدی تصور بھی آہستہ آہستہ ابھرتا نظر آتا ہے۔ خصوصا دسویں حصے کے زمزموں میں تو اس کی نمود صاف صاف دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ توحیدی تصور کسی بہت پرانے گزشتہ عہد کے بنیادی تصور کا بقیہ تھا یا مظاہر قدرت کی کثرت آرائیوں کا تصور اب خود بخود کثرت سے وحدت کی طرف ارتقائی قدم اٹھانے لگا تھا، اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ لیکن بہر حال ایک ایسے قدیم عہد میں بھی جب کہ رگ وید تصوروں نے نظم وسخن کا جامہ پہننا شروع کیا تھا۔ توحیدی تصور کی جھلک صاف صاف دکھائی جاسکتی ہے۔ خداؤں کا وہ ہجوم جس کی تعداد تین سو تینتیس یا اسی طرح کی ثلاثی کثرت تک پہنچ گئی تھی، بالآخر تین دائروں میں سمٹنے لگا، یعنی زمین، قضا اور آسمان میں۔ اور پھر اس نے ایک رب الاربابی تصور کی نوعیت پیدا کرلی۔ پھر یہ رب الاربابی تصور اور زیادہ سمٹنے لگتا ہے اور ایک سب سے بڑی اور سب پر چھائی ہوئی ہستی نمایاں ہونے لگتی ہے۔ یہ ہستی کبھی ''ورون'' میں نظر آتی ہے کبھی ''اندر'' میں اور کبھی ''اگنی'' میں۔ لیکن بالآخر ایک خالق کل ہستی کا تصور پیدا ہوجاتا ہے جو ''پرجاپتی'' (پروردگار عالم) اور ''وشواکرمن'' (خالق کل) کے نام سے پکاری جانے لگتی ہے اور جو تمام کائنات کی اصل وحقیقت ہے۔ وہ ایک ہے مگر علم والے اسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں: ''اگنی، یم، ماتری شوان'' وہ ایک نہ تو آسمان ہے، نہ زمین ہے۔ نہ سورج کی روشنی ہے، نہ ہوا کا طوفان ہے۔ وہ کائنات کی روح ہے، تمام قوتوں کا سرچشمہ، ہمیشگی، لازوالی۔ وہ کیا ہے؟ وہ شاید رٹ ہے جو ہر کے روپ میں، ادیتی ہے روحانیت کے بھیس میں۔ وہ بغیر سانس کے سانس لینے والی ہستی! ''ہم اسے دیکھ نہیں سکتے''، ''ہم اسے پوری طرح بتا نہیں سکتے'' وہ ''ایک است'' ہے، یعنی حقیقت یگانہ، الحق۔ یہی وحدت ہے جو کائنات کی تمام کثرت کے اندر دیکھی جاسکتی ہے''۔[1]

[1] آزاد، ابوالکلام محی الدین، ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۲۶۳-۲۶۴

مولانا آزاد نے تقریباً تمام ادیان کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔ بالائی سطروں میں جن مذاہب کا ذکر کیا گیا ہے ان تمام میں عبادت اور وحدانیت کا تصور کہیں نہ کہیں ضرور پایا جاتا ہے۔ البتہ موجودہ تصور کو مذاہب کے متبعین نے نہ صرف دھندلا کر دیا ہے بلکہ اب تو شرک جیسی مکروہات کو بھی داخل کر لیا گیا ہے۔ اگر ہم ہندو دھرم کی ویدک تعلیمات پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں توحید کا عنصر پوری طرح موجود ہے۔ ہاں اب ہندو دھرم کی موجودہ شکل کو پوری طرح بگاڑ کر پیش کیا جا رہا ہے۔ مولانا آزاد نے تقابل ادیان اور مطالعۂ ادیان کے متعلق جن افکار و نظریات اور خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس بات پر بین ثبوت ہیں کہ سامی اور غیر سامی ادیان میں قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ سب میں خدا کا تصور موجود ہے، البتہ اس کے نام اور طریقہ عبادت الگ الگ ہیں۔ کسی بھی مذہب و دین میں فی نفسہ خدا کا تصور پایا جانا یا اس سے قربت حاصل کرنے کے لیے عبادت و پرستش کا نظام پایا جانا، ایسی صفات ہیں جو اسلام اور دیگر ادیان کو باہم جوڑنے اور اشتراکی قدروں کی افادیت کو بتاتی ہیں۔ مولانا آزاد بھی یہی کہنا چاہتے کہ باوجود طریقوں اور راہوں کے اختلاف کے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ادیان میں یکسانیت و مساوات اور اشتراک و اجتماعیت کی ایسی بہت سی قدریں اور تعلیمات ہیں جن پر تمام ادیان و مذاہب کے حاملین اتحاد و اتفاق کا ثبوت دے سکتے ہیں اور سماج میں مذہب و دین کے نام پر جاری کشمکش کو پوری طرح نابود کیا جا سکتا ہے۔

مقدس دینی نوشتے اور مولانا آزاد

یہ صداقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ آج دنیا میں جتنے بھی ادیان یا مذاہب موجود ہیں۔ ہر ایک کی اپنی اپنی تعلیمات اور نوشتے ہیں۔ جنہیں ان مذاہب کے علمبردار مقدس اور آسمانی صحیفے مانتے ہیں۔ مثلاً ہندو دھرم میں جن مقدس کتابوں اور دینی نوشتوں کا تصور ہے ان میں چار وید خصوصیت کے ساتھ شامل ہیں۔ ان میں رگ وید سب سے قدیم ہے۔ اب ہندو علماء اور ہندو مذہب کے اکثر و بیشتر مفکرین و محققین کا نظریہ یہ ہے کہ ہمارے یہ دینی نوشتے منزل من اللہ ہیں۔ اس حوالے سے مسلم باحثین میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض ہندوؤں کے دینی

نوشتوں کو منزل من اللہ مانتے ہیں اور بعض اصحاب علم ان کو انسانی تصنیف و تالیف سے تعبیر کرتے ہیں۔ دراصل یہاں بحث یہ ہے کہ مولانا آزاد تمام مذاہب کے دینی نوشتوں کی بابت کیا نظریہ رکھتے ہیں۔ مولانا آزاد نے اپنی تفسیر 'ترجمان القرآن' میں اس بابت نہایت دلچسپ حواشی رقم کیے ہیں جن کا یقیناً پڑھنے سے تعلق ہے۔ مولانا آزاد ہداہت کے متعلق لکھتے ہیں کہ ہداہت ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے:

''فطرت الٰہی کی راہ کائنات ہستی کے ہر گوشے میں ایک ہی ہے۔ وہ نہ تو ایک سے زیادہ ہوسکتی ہے، نہ باہم دیگر مختلف۔ پس ضروری تھا کہ یہ ہدایت بھی اول دن سے ایک ہی ہوتی اور ایک ہی طرح پر تمام انسانوں کو مخاطب کرتی۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے: خدا کے جتنے پیغام بر پیدا ہوئے، خواہ وہ کسی زمانے اور کسی گوشے میں ہوئے ہوں، سب کی راہ ایک ہی تھی اور سب خدا کے ایک ہی عالمگیر قانون سعادت کی تعلیم دینے والے تھے۔ یہ عالمگیر قانون انسانیت کیا ہے؟ ایمان اور عمل صالح کا قانون ہے، یعنی ایک پروردگار عالم کی پرستش کرنی اور نیک عملی کی زندگی بسر کرنی۔ اس کے علاوہ اور اس کے خلاف جو کچھ بھی دین کے نام سے سے کیا جاتا ہے، دین حقیقی کی تعلیم نہیں''۔[1]

اسی طرح مولانا آزاد ایک جگہ رقم کرتے ہیں:

''فی الحقیقت حضرت مسیح کی تعلیم میں اور قرآن کی تعلیم میں اصلاً کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا معیار احکام ایک ہی ہے۔ فرق صرف محل بیان اور پیرایۂ بیان کا ہے۔ حضرت مسیح نے صرف اخلاق اور تزکیہ قلب پر زور دیا، کیونکہ شریعتِ موسوی موجود تھی اور وہ اس کا ایک نقطہ بھی بدلنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن قرآن کو اخلاق اور قانون دونوں کے احکام بہ یک وقت بیان کرنے تھے، اس لیے قدرتی طور پر اس نے پیرایۂ بیان ایسا اختیار کیا جو مجازات و متشابہات کی جگہ احکام و قوانین کا صاف صاف جچا تلا پیرایہ بیان تھا۔ اس نے سب سے پہلے

[1] آزاد، ابوالکلام محی الدین، ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۳۵۸

عفو درگزر پر زور دیا اور اسے نیکی و فضیلت کی اصل قرار دیا۔ ساتھ ہی بدلہ لینے اور سزا دینے کا دروازہ بھی کھلا رکھا کہ ناگزیر حالتوں میں اس کے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن نہایت قطعی اور واضح لفظوں میں بار بار کے بدلے اور سزا میں کسی طرح کی ناانصافی اور زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ یقیناً دنیا کی تمام نبیوں اور شریعتوں کے احکام کا ماحصل یہی تین اصول رہے ہیں''۔[1]

یہ تمام مباحث اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ مولانا آزاد کی مطالعۂ ادیان و مذاہب اور متعدد افکار و نظریات پر نظر نہایت گہری اور وسیع تھی۔ مولانا آزاد کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے مطالعہ ادیان کے سلسلے میں نہایت متوازن اور معتدل موقف اختیار کیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ادیان کی بابت مسلمانوں نے ہمیشہ توسع اور رواداری کا مظاہرہ کیا ہے۔

☆☆☆

[1] آزاد، ابوالکلام محی الدین، ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۲۰۱-۲۰۲

ہندوؤں کے متعلق علامہ شبلی نعمانی کے افکار

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) نے علومِ اسلامیہ کی تدوین وترتیب میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے ملت کو ان علوم وفنون اور معارف وحکم سے متعارف کرایا جن سے اہل علم عموماً آشنا نہ تھے۔ وہ متعدد کتب کے مصنف ہیں، جیسے سیرۃ النبی، الفاروق، المامون اور مقالات شبلی (ان مقالات کو علامہ سید سلیمان ندوی نے مرتب کیا ہے) وغیرہ، یہ وہ بیش قیمت سرمایہ ہے جو آپ کے علمی اثر ورسوخ اور تحقیقی وفکری صلاحیتوں کا بہترین مظہر ہے۔ یوں تو علامہ شبلی کی 'سیرۃ النبی' آپ کے علم فضل کا بہترین شاہکار ہے۔ لیکن آپ کی جتنی کتب ومقالات ہیں وہ انتہائی مستند وجامع اور جدید علمی گوشوں سے مملو ہیں۔ آپ کی حیات اور علمی خدمات پر بہت لوگوں نے خامہ فرسائی کی ہے۔ جن میں علامہ سید سلیمان ندوی کی حیات شبلی نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ عہد حاضر میں ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، پروفیسر اشتیاق ظلی نے بھی شبلی شناسی کا نہایت تعمق سے مطالعہ کیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ علامہ شبلی نے تقابل ادیان یا ہندوستانی مذاہب کے حوالے سے کیا لکھا ہے؟ اس موضوع پر آپ کی کوئی مستقل کتاب تو نہیں ہے البتہ کچھ مباحث سیرۃ النبی، مقالات شبلی، المامون اور الفاروق میں ملتے ہیں۔ ان کتب میں دیگر اقوام کی تہذیب وثقافت، علوم ومعارف، فلسفہ، زبان وادب اور ادیان ومذاہب کے جن پہلوؤں پر گفتگو کی ہے ان کو ذیل میں پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ سیرۃ النبی میں اس بابت درج ذیل مباحث موجود ہیں، عرب کی قدیم حکومتیں، تہذیب وتمدن، عرب کے مذاہب، نصرانیت، یہودیت اور مجوسیت، سلسلہ اسماعیلی، حضرت اسماعیل علیہ السلام کہاں آباد ہوئے، ذبیح کون ہے، مقام قربانی، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی۔ مقالات شبلی کی جلد اول، دوم پنجم ششم اور ہفتم میں بالترتیب حسب ذیل مضامین ملتے ہیں۔ غیر قوموں کی مشابہت، اردو

ہندی اور تحفۃ الہند (ہندی صنائع بدائع) موبدان مجوس (ہندوستان میں) یونان، فلسفہ، موسیقی، جغرافیہ، ہندسہ یا جامیٹری، دیگر علوم وفنون فارس، عبرانی، قبطی سنسکرت، مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی۔ فلسفۂ یونان اور اسلام وغیرہ پر نہایت دلچسپ معلومات موجود ہیں۔ ان کے علاوہ مسلم حکومتوں میں غیر مسلموں کے ساتھ رواداری ان کو مناصب اعزاز، نیز علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب 'حیات شبلی' میں لکھا ہے کہ شبلی نعمانی نے ہندو مسلم اتحاد پر بھی مضامین لکھے ہیں نیز جب آریہ سماج کی تحریک وجود میں آئی تو اس کے دفاع کے لیے جن علماء (بانئ دارالعلوم دیوبند مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ) نے سعی کی ان کی خدمات کو بھی سراہا ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں جب عیسائی مشنریاں نے ارتداد جیسے فتنہ کو ہوا دی جن مقتدر شخصیات (مولانا رحمت اللہ کیرانوی وغیرہ) نے اس کا دفاع کیا ان کی توصیف بھی کی ہے۔ گویا علامہ شبلی کی تحریروں میں دیگر اقوام کے متعلق انتہائی مفید معلومات ملتی ہیں۔

اسلام سے قبل سیاسی نظام

اسلام سے قبل اہل عرب کے یہاں سیاسی نظم ونسق پایا جاتا تھا، اس کے لیے باقاعدہ انھوں نے متعدد حکومتیں تشکیل دے رکھی تھیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے ان حکومتوں کو متمدن کہا ہے:

کتبوں اور دیگر مورخین کی تصریحوں سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں پانچ متمدن سلطنتیں گزری ہیں۔ ۲- معینی: معین یمن میں ایک مقام ہے جو کسی زمانہ میں سلطنت کا پایہ تخت تھا۔ ۲- سبائی: یعنی قوم سبا۔ ۳- حضرموتی: حضرموت، یمن کا مشہور مقام تھا۔ ۴- فتبانی: عدن میں ایک مقام ہے جو آج کل گمنام ہے۔ ۵- نسبتی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام نسبت تھا۔ یہ سلسلہ انہیں کی طرف منسوب ہے۔ شبلی نعمانی نے ان سلطنتوں کی تفصیل میں لکھا ہے کہ معینی سلطنت جنوبی عربستان میں تھی۔ اس کے صدر مقامات قرن اور مقیم تھے۔ کتبوں سے تقریباً پچیس حکمرانوں کا پتہ چلتا ہے۔ محققین یورپ میں اختلاف ہے کہ معینی اور سبائی حکومتیں ہم زمان تھیں یا متقدم ومتاخر۔ گلازر کا خیال ہے کہ معینی حکومت بہت متقدم ہے اور حضرت عیسی علیہ السلام سے پندرہ سو برس قبل موجود تھی۔ لیکن مولر کا بیان ہے

کہ کوئی معینی کتبہ آٹھ سو برس قبل مسیح پہلے کا نہیں ملتا، اس بناء پر سبائی اور معینی دونوں ہم عصر ہیں۔ سبائی سلطنت کا پایہ تخت مارچ تھا۔ اس زمانے کے سنگی کتبے بکثرت موجود ہیں۔ حضرت عیسی علیہ السلام سے ایک سو پندرہ برس قبل اس حکومت کا پتہ چلتا ہے۔ اس دور کے بعد حمیر کا زمانہ ہے۔ حمیر نے مارب پر قبضہ کر کے پایہ تخت بنالیا۔ قریبا ۱۲۵ قبل مسیح میں حمیر نے سبائی حکومت پر قبضہ کرلیا۔ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حمیر میں چھبیس فرمانروا گزرے ہیں۔ حمیر کے بعض کتبوں سے سنہ وسال بھی کندہ ہے۔ ان کے عہد حکومت میں رومی سلطنت نے عرب میں مداخلت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ کوشش پہلی بھی تھی اور آخری بھی۔ اے لیس گالس جس نے حضرت عیسی علیہ السلام سے اٹھارہ برس قبل عرب پر چڑھائی کی تھی، بالکل ناکام رہا۔ اس کے رہبر دغابازی سے اس کو صحرا میں لے گئے اور ریگستان میں پہنچ کر اس کا سارا لشکر تباہ ہوگیا۔ حمیر نے یہودی مذہب قبول کرلیا تھا اسی زمانہ کے قریب حبشیوں نے عرب کے جنوب میں حکومت قائم کرنی شروع کی اور ایک زمانہ میں حمیریوں کو شکست دے کر اپنی مستقل حکومت قائم کرلی تھی۔ اس عہد کا ایک کتبہ جو آج کل ہاتھ آیا ہے اس پر یہ الفاظ ہیں:

''رحمان، مسیح اور روح القدس کی قدرت وفضل ورحمت سے اس یادگاری پتھر پر ابرہہ نے کتبہ لکھا جو کہ بادشاہ حبش اراحمیس ذبی مان کا نائب الحکومت ہے''

نابتی حکومت جو شام کی حدود سے متصل تھی اور جو قوم ثمود کی مرادف یا ان کی قائم مقام تھی اس کی نسبت فاسٹر صاحب اپنے جغرافیہ میں لکھتے ہیں۔ ان مختصر بیانات سے معلوم ہوگا کہ زمانہ قدیم میں نسبت کا نام اور اثر نہ صرف ریگستانی اور صحرائی عرب پر مستولی تھا بلکہ حجاز ونجد کے صوبہائے عظیمہ پر بھی حاوی تھا۔ نابتی جہاں ایک طرف منافع تجارت سے بہرہ اندوز ہونے میں کمال رکھتے تھے وہاں دوسری طرف سچے بنو اسماعیل کے خطرات جنگ کے لیے بالکل مستعد رہتے تھے۔ فلسطین وشام میں ان کی غارت گرہوں اور خلیج عرب میں مصری جہازات پر ان کی رہزنی بارہا تاجداران مقدونیہ کو ان کی دشمنی پر آمادہ کردیا لیکن روما کی مجموعی قوت سے پیشتر کوئی شی انہیں روک نہ سکی۔ اور روما کی

اطاعت بھی انھوں نے اسٹرابو کے زمانہ میں بالکل مجبورانہ اور مشتبہ انداز سے قبول کی''۔[1]

یہ حال تھا قدیم سلطنتوں کا البتہ یہ بات درست ہے کہ اسلام سے قبل یہ سلطنتیں پوری طرح تباہ ہو چکی تھیں۔ لیکن نتیجہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں اسلام سے قبل ایک سیاسی انتظام وانصرام پایا جاتا تھا۔

تہذیب وتمدن

تہذیب وتمدن ہر معاشرہ کی شناخت ہوتا ہے۔ جو معاشرہ تہذیب و ثقافت جیسے بنیادی اصولوں سے واقف نہ ہو یا اس میں کوئی تہذیب نہ پائی جاتی ہو تو اس سماج کو ایک اچھا سماج نہیں مانا جاتا ہے۔ اسلام سے قبل جو تہذیبی آثار پائے جاتے ہیں علامہ شبلی نے ان کو اپنی کتاب 'سیرۃ النبی' میں بیان کیا ہے:

''عرب کے بعض حصے مثلاً یمن کسی زمانہ میں انتہا درجہ کی ترقی تک پہنچ چکے تھے۔ یورپ کے محققین جنھوں نے آثار قدیمہ کی تحقیقات کی ہیں اور پرانے کتبوں کو پڑھا ہے وہ یمن کی قدیم تہذیبوں وتمدن کا اعتراف کرتے ہیں۔ اسی طرح عرب کے وہ مقامات جو ایران اور شام سے متصل تھے، مثلاً حیرہ جو آل نعمان کا پایہ تخت تھا اور حوران جو خاندان غسان کا صدر مقام تھا تہذیب وتمدن سے خالی نہ تھے''۔

اس کے علاوہ علامہ شبلی نے یہ بھی لکھا ہے:

''عرب کے اصلی اور اندرونی مقامات میں تہذیب وتمدن کی یہ حالت نہ تھی۔ عربی زبان نہایت وسیع ہے۔ باوجود اس کے جن چیزوں کو تمدن اور اسباب معاشرت سے تعلق ہے ان کے لیے خاص عربی زبان نہیں بولتے بلکہ ایران یا روم سے مستعار آئے ہیں۔ سکہ کے لیے ایک لفظ بھی موجود نہیں۔ درہم اور

[1] سیرۃ النبی، جلد ا، صفحہ ۷۹-۸۱

دینار دونوں غیر زبانوں کے الفاظ ہیں۔ درہم یونانی لفظ درخم ہے اور یہ وہی لفظ ہے جو انگریزی میں ڈرام ہو گیا ہے۔ چراغ معمولی چیز ہے تاہم اس کے لیے عربی میں کوئی لفظ نہیں تھا۔ چراغ کو لے کر سراج کر لیا۔ پھر ایک مصنوعی لفظ بنایا مصباح، یعنی ایک اعلی جس سے صبح بنالی جاتی ہے۔ کوزہ کے لیے کوئی لفظ نہیں، کوزہ کو کوز کر لیا ہے۔ لوٹے کو ابریق کہتے ہیں جو آب ریز کا معرب ہے۔ تشت فارسی لفظ تھا اس کو عربی میں طست کر لیا ہے۔ پیالہ کو لاس کہتے ہیں وہی کاسہ فارسی لفظ ہے''۔[1]

پتہ یہ چلا کہ اسلام سے قبل اہل عرب تہذیب وتمدن کے اعلی معیار اور بہتر طرز معاشرت سے تقریباً ناواقف تھے۔

عرب کے مذاہب

علامہ شبلی نے سیرۃ النبی میں ایک انتہائی اہم بحث عرب کے مذاہب وادیان سے متعلق کی ہے۔ اس تفصیل کو بیان کرنے سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ عرب کے مذاہب و ادیان کا تعلق غیر سامی ادیان سے ہے۔ راقم کا مدعا بھی غیر سامی ادیان ہی ہیں۔ اس لیے اس بحث کو آپ کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ جو افکار عربوں کے دین و مذہب کے متعلق پائے جاتے تھے ان کو علامہ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

بعضوں کا خیال تھا کہ جو کچھ ہے زمانہ یا فطرت (قانون قدرت) ہے، خدا کوئی چیز نہیں ہے۔

بعض خدا کے قائل تھے لیکن قیامت اور جزا وسزا کے منکر تھے۔ اسی طرح ایک نظریہ یہ پایا جاتا تھا، کہ اگر کوئی پیغمبر ہو سکتا ہے تو اس کو فرشتہ ہونا چاہئے۔ جو حاجات انسانی سے منزہ ہو۔ البتہ اکثریت بت پرستوں کی تھی جو بتوں کو خدا تو نہیں سمجھتے تھے لیکن خدا تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھتے تھے۔

---

[1] سیرۃ النبی، جلد ا، صفحہ ۸۱-۸۴

قبیلہ حمیر جو یمن میں رہتا تھا وہ آفتاب پرست تھا۔ کنانہ چاند کو پوجتے تھے۔ قبیلہ بنی تمیم دوران کی عبادت کرتا تھا اسی طرح قیس شعری کی، اسد عطارد کی جذام مشتری کی پرستش کرتے تھے۔ جو قبیلے بتوں کی پرستش کرتے تھے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

> لات، کو ثقیف، عزی کو قریش و کنانہ، منات کو اوس وخزرج، ودکو کلب، سواع کو ہذیل، یغوث کو مذحج اور بعض قبائل اور یعوق کو ہمدان پوجتے تھے۔ سب سے بڑا بت ہبل تھا جو کعبہ کی چھت پر منصوب تھا۔ قریش لڑائیوں میں اس کی جئے پکارتے تھے۔ عرب میں بت پرستی کا بانی ایک شخص عمرو بن لحئی تھا۔ اس کا اصلی نام ربیعہ بن حارثہ تھا۔ عرب کا مشہور قبیلہ خزاعہ اسی کی نسل سے ہے۔ عمرو سے پہلے کریم کعبہ کے متولی تھے۔ عمرو نے کریم کو مکہ سے نکال دیا اور خود حرم کا متولی ہوگیا۔ وہ ایک دفعہ شام کے کسی شہر میں گیا۔ وہاں کے لوگوں کو بت پوجتے دیکھا تو پوچھا کہ ان کو کیوں پوجتے ہو؟ انھوں نے کہا یہ حاجت روا ہیں۔ لڑائیوں میں فتح دلاتے ہیں۔ قحط پڑتا ہے تو پانی برساتے ہیں۔ عمرو نے چند بت اس سے لے لیے اور لا کر کعبہ کے آس پاس قائم کئے۔ کعبہ چونکہ عرب کا مرکز تھا۔ اس لیے تمام قبائل میں بت پرستی کا رواج ہوگیا۔ ان میں سے قدیم بت مناۃ تھا۔ یہ سمندر کے کنارہ قدید کے قریب نصب تھا۔ اوس وخزرج یعنی مدینہ کے لوگ اسی پر قربانی چڑھاتے تھے اور جب کعبہ کا حج کر کے آتے تو احرام یہیں اتارتے تھے۔ ہذیل اور خزاعہ بھی اس کی پرستش کرتے تھے۔[1]

مذکورہ بحث کی روشنی میں یہ بات پورے اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ عرب کے یہاں متعدد ادیان تھے اور قبائل اپنی اپنی عقیدت کے مطابق بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ عرب کی اکثریت کسی بھی آسمانی یا سامی دین کی تابع نہ تھی بلکہ وہ بت پرست تھے۔ جو یقیناً سامی ادیان کے زمرے میں نہیں آتا ہے۔

ان کے علاوہ کچھ قبائل یہودیت ونصرانیت اور مجوسیت پر بھی کاربند نظر آتے ہیں۔

---

[1] سیرۃ النبی، جلد ا، صفحہ ۸۴-۸۵

چنانچہ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''یہ تینوں مذہب ایک مدت دراز سے عرب میں رائج ہو چکے تھے۔ علامہ ابن تیمیہ نے معارف میں لکھا ہے کہ قبائل ربیعہ وغسان نصرانی تھے۔ قضاعہ میں بھی اس مذہب کا اثر پایا جاتا ہے۔ نصرانیت کو اس قدر ترقی پا چکی تھی کہ خود مکہ معظّمہ میں ایسے لوگ موجود تھے (مثلاً عروہ بن نوفل) جو عبرانی زبان میں انجیل کو پڑھ سکتے تھے۔ متعدد ایسے لوگ تھے جنھوں نے شام میں جا کر تعلیم پائی تھی۔ حمیر، بنو کنانہ، بنو حرث بن کعب، کندہ یہ قبائل یہودی تھے۔ مدینہ منورہ میں یہود نے پورا غلبہ پالیا تھا اور تورات کی تعلیم کے لیے متعدد درسگاہیں قائم تھیں، جن کو بیت المدراس کہتے تھے۔ حدیث کی کتابوں میں اسی نام سے ذکر آتا ہے۔ قلعہ خیبر کی تمام آبادی یہودی تھی۔ امراء القیس کا ہم عصر مشہور شاعر سموئیل بن عادیا یہودی تھا۔ اہل کتاب کی روایتیں مکہ معظّمہ اس قدر رواج پا چکی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن نازل ہوتا تھا اور اس میں بنی اسرائیل کے واقعات مذکور ہوتے تو کفار بدگمانی کرتے تھے کہ کوئی یہودی یا عیسائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھاتا ہے''۔[1]

گویا اہل عرب کا مرکزی دین بت پرستی تھی، اس کے باوجود چند قبائل اور کچھ افراد یہودت ونصرانیت کے بھی علمبردار تھے۔

پیشوایان مجوس

علامہ شبلی نعمانی نے مقالات شبلی میں ایک بحث یہ اٹھائی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے دور اقتدار میں مجوس اہل علم سے کیا برتاؤ کیا۔ علامہ موصوف کہتے ہیں کہ بہت سے افراد خصوصاً اہل یورپ کو یہ شکوہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور میں مجوسیوں اور ان کے موبدان (پیشوایان مجوس) کے ساتھ تعصب وتنگ نظری کا مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانی

[1] سیرۃ النبی، جلد ا، صفحہ ۸۶

نے لکھا ہے:

''اہل یورپ کا خاصہ ہے کہ دو ہم زمان واقعہ کو عموماً علت و معلول فرض کر لیتے ہیں، مثلاً جب تاریخ سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے بعد ایرانیوں کا لٹریچر برباد ہو گیا تو واقعی طور سے فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اسلام ہی کے طرز عمل کا نتیجہ تھا۔ اسی طرح وہ دیکھتے ہے کہ ہندوستان کی کسی اسلامی تاریخ میں پارسی قوم کا معابد کا، پیشوایان مذہبی کا، تصنیفات کا، تعلیم و تلقین کا پتہ نہیں چلتا، تو ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ سلاطین ہندوستان نے تعصب کی وجہ سے یا تو سرے سے ان کو ملک میں گھسنے نہ دیا، یا ایسی حالت میں رکھا کہ ان کی کوئی امتیازی حیثیت قائم نہ رہی، جس سے ان کے متعلق کسی قسم کی کوئی اطلاع حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہے تاریخ کی کم مائیگی کا قصور ہے''۔

یعنی ایسے بہت سارے شواہد موجود ہیں جن میں مجوس کی آمد اور ان کے ساتھ رواداری کا ثبوت ملتا ہے۔ جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی اسلامی حکومتوں نے مجوس کے ساتھ نہایت مشفقانہ برتاؤ کیا۔ شبلی نعمانی نے مقالات شبلی میں کئی ثبوت پیش کیے ہیں جن سے یہ بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ مجوس مسلم دور اقتدار میں موجود تھے اور ان کے ساتھ متوازن رویہ اپنایا۔ وہ لکھتے ہیں:

''اکبر کے زمانہ میں موبدوں کا پتہ چلتا ہے، اکبر نے جس زمانے میں مذہبی کانفرنس قائم کی اور ہر مذہب وملت کے پیشوا دور دور سے بلائے تو ایران سے بھی خط و کتابت کی، اس زمانہ میں پارسیوں کا پیش وائے کل 'آذر کیوان' تھا، اس نے آنے میں معذرت کی لیکن ایک عجیب وغریب کتاب، اپنی تصنیف بھیجی جس کے متعلق مآثر الامراء میں لکھا ہے۔ اس کتاب میں یہ کمال تھا کہ خالص فارسی میں تھی، لیکن اگر نقطوں کو ادل بدل کر پڑھو تو عربی ہو جاتی تھی اور الفاظ کو الٹ کر پڑھو تو ترکی اور پھر مصحف کرنے سے ہندی ہو جاتی تھی''۔[1]

[1] مقالاتِ شبلی، جلد ۵، صفحہ ۷۵

علامہ شبلی نعمانی نے آگے لکھا ہے کہ:

''اگر چہ اس ناممکن صنعت پر ہم یقین نہیں کر سکتے لیکن انکار کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔ آذر کیوان نے تو آنے سے انکار کر دیا لیکن ایک دوسرا موبد جس کا نام اردشیر تھا، حسب طلب آیا اور اپنے ساتھ مذہبی آتش کدہ کی آگ بھی لیتا آیا، چنانچہ اس کی حفاظت و اہتمام شیخ ابوالفضل کے سپرد کی گئی، علاوہ ازیں دبستان مذہب میں یہ بات وضاحت سے لکھی ہے کہ آذر کیوان ہندوستان میں آیا اور عظیم آباد پٹنہ میں سکونت کی اور ۱۰۲۷ھ میں ۸۵ برس کی عمر میں انتقال کیا'' ۔[1]

اس حقیقت کو جاننے کے بعد کوئی بھی فرد یہ الزام عائد نہیں کر سکتا ہے کہ مسلم دور میں کسی مذہب کے ساتھ جانبداری کا معاملہ کیا۔

علاوہ ازیں جن موبدان مجوس سے دبستان مذاہب کے مصنف نے ملاقات کی ان کا تذکرہ بھی علامہ شبلی نعمانی نے کیا ہے۔ خراد: اس کا مورث اعلیٰ نوشیرواں کی خوان سالاری کا منصب رکھتا تھا، خراد نے شیراز میں آذر کیوان کی شاگردی اختیار کی اور ایک مدت تک سخت ریاضتیں اٹھائیں، ۱۰۲۹ھ میں انتقال کیا۔

فرشید ورد: یہ شیراز میں آذر کیوان کے فیض سے مستفید ہوا اور ہندوستان میں ۱۰۲۰ھ میں وفات پائی۔

خردمند: سام نریمان کے خاندان سے تھا، مصنف دبستان، پٹنہ میں ان سے ملا۔

بہرام بن فرہاد: گودرز کے خاندان سے تھا، آذر کیوان جس زمانہ میں پٹنہ میں تھا، بہرام شیراز سے چل کر پٹنہ میں آیا اور تکمیل نفس میں بڑی محنتیں اٹھائیں، اس نے فلسفہ کی تمام شاخوں میں کمال حاصل کیا اور فنون میں عربی، پہلوی اور فارسی زبانوں کی تصنیفات سے واقفیت حاصل کی تھی، عربی فلسفہ کی کتابیں خواجہ جمال الدین محمود جو علامہ دوانی کے شاگرد تھے پڑھیں تھیں۔ تجارت کے ذریعے سے بسر کرتا تھا، ۱۰۳۴ھ میں لاہور میں وفات ہوئی۔ بہرام کی تین کتابیں مشہور ہیں۔ شارستان دانش، گلستان بینش، شارستان۔

[1] مقالات شبلی، جلد ۵، صفحہ ۷۵-۷۶

ہوشیار: سورت میں پیدا ہوا، رستم کے خاندان سے تھا، نہایت راست باز، دلیر ،صاحب تدبیر و مقدمہ فہم تھا، ۱۰۵۰ھ میں آگرہ میں وفات پائی، سرودمستان اس کی تصنیف ہے۔

موبد سروش: زردشت کی نسل سے تھا، عربی اور فارسی کے ساتھ ہندی زبان بھی جانتا تھا، اس کی تصنیفات کثرت سے ہیں، مثلاً نوش دارد، سبکتگین زردشت افشار وغیرہ۔ ۱۰۳۶ھ کو کشمیر میں وفات پائی۔

خدا جوئے: ہرات کا باشندہ تھا، مدت تک جویائے حق رہا، آخر خواب بنیں ہدایت ہوئی کہ آذر کیوان سے فیض حاصل ہوگا، چنانچہ موبد خوشی کے ساتھ اسطخر گیا اور آذر کیوان کے حلقہ میں شامل ہوا، عربی اور فارسی زبان میں مہارت رکھتا تھا، اکثر چپ رہتا تھا اور لوگوں کے اصرار سے گفتگو کرتا تھا آذر کیوان کی مشہور کتاب ''جام گیخیرو'' کی شرح لکھی ۱۰۴۰ھ کو کشمیر میں وفات پائی۔[1]

ان کے علاوہ بھی علامہ شبلی نے کئی اور موبدان مجوس کے مختصر احوال لکھے ہیں جیسے، موبد خوشی، بہرام بن فرشاد، موبد پرستار اور شیدوش بن انوش، طوالت کے باعث ان کو ترک کیا جاتا ہے۔ البتہ بالائی سطروں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ہندوستان میں مسلم دور حکومت میں کسی بھی نظریہ اور فکر و خیال کے حامل کے ساتھ قطعی بھید بھاؤ نہیں کیا گیا، بلکہ ان کے دین و دھرم کی ترویج و اشاعت ان کے علوم و معارف کے فروغ کا یکساں موقع فراہم کیا۔ اس کے باوجود آج ہی نہیں بلکہ ایک زمانہ سے متعصبین کا ایک گروہ مسلم دور اقتدار کو مطعون کرتا رہا ہے۔ یقیناً اس طرح کی باتیں نہ صرف جہالت پر مبنی ہیں بلکہ ان باتوں میں تعصب و عداوت کی بو آتی ہے۔ ہمیں ان چیزوں سے بچنے کی سخت ترین ضرورت ہے۔

ہندوؤں کے علوم، تہذیب اور دھرم کی قدردانی

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوؤں کے مذہبی مصادر اور دیگر کتب سنسکرت میں ہیں۔

---

[1] تفصیل دیکھئے، مقالات شبلی، جلد ۵، صفحہ ۷۷-۸۰

ہندوستان میں سنسکرت زبان بھی رائج تھی۔ ہندوستان کے کئی علوم وفنون ایسے ہیں جن کو مسلمانوں نے اپنی قوم میں متعارف کرانے کے لیے سنسکرت سے عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح ان کے مذہب ودھرم کے متعلق معلومات حاصل کی گئیں۔ چنانچہ اس بابت علامہ شبلی نعمانی نے تفصیل سے لکھا ہے کہ دولت عباسیہ سے لیکر مغلوں کے دور تک مسلم حکمرانوں نے۔ ان کے علوم وفنون، تہذیب وتمدن اور دین ودھرم کی قدر کرنے کے ساتھ ان کو مناصب جلیلہ پر بھی فائز کیا۔ دولت عباسیہ میں مختلف زبانوں کے تراجم عربی میں کیے گئے۔ سریانی، عبرانی، قبطی، فارسی کلدانی فنیقی وغیرہ اسی طرح سنسکرت زبان کے ترجمہ کی ابتدا عباسی فرمانروا ابوجعفر منصور کے زمانے میں ہوئی۔ اسی نہج کو برقرار رکھتے ہوئے خلیفہ ہارون الرشید اور مامون الرشید نے بھی اپنے دور میں ہندوستان سے تعلقات بڑھائے۔ حتی کہ "ایک مرتبہ ہارون الرشید سخت بیمار ہوا اور پایہ تخت کے اطباء علاج سے عاجز آ گئے، تو اس زمانہ میں ہندوستان کے ایک پنڈت کی شہرت دور دور پھیلی ہوئی تھی، ابوعمرو عجمی کی تحریک سے ہارون الرشید نے اس کو طلب کیا اور اس کے علاج سے خدا نے شفا دی، اس فاضل کا نام منکہ تھا۔ وہ طبابت کے علوم عقلیہ کا بڑا ماہر تھا، بغداد میں رہ کر اس نے فارسی زبان سیکھ لی اور سنسکرت زبانوں کے ترجمہ کرائے۔ علامہ شبلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہارون الرشید کے دربار کا ایک نامور پنڈت سالی تھا، جس کو عرب مصنف صالح لکھتے ہیں، اسی عہد میں ایک اور مشہور فاضل ہندو تھا جس نے سنسکرت کتابوں کے ترجمے کیے، اس کے باپ کا نام دھن تھا اور اہل عرب اس کو اس کے اصلی نام کے بجائے ہمیشہ ابن دھن یعنی دہن کا بیٹا لکھتے ہیں، برمکیوں نے بغداد میں جو ہسپتال بنایا تھا، یہ اس کا افسر تھا۔ جب مورخ مسعودی کھنمبات آیا اور وہاں کے حالات سے واقفیت پیدا کی تھی، وہ لکھتا ہے:

> ''یہاں کا راجہ مذہبی مناظروں کا بہت شائق ہے اور مسلمان اور دوسرے مذہب کے لوگ جو اس شہر میں آتے ہیں ان سے بحث اور گفتگو کرتا رہتا ہے''۔

اسی طرح ابوریحان بیرونی نے بعض عربی تصنیفات کو ہندوؤں کے لیے سنسکرت زبان میں ترجمہ کیا، سنسکرت علوم وفنون کے متعلق جو کتاب اس نے لکھی ہے اور جس کو جرمنی کے مشہور پروفیسر زخاؤ نے اپنی تصحیح سے چھپوایا ہے،

یہ کتاب یقیناً سنسکرت علوم وفنون کا بیش قیمت سرمایہ ہے، ابوریحان البیرونی نے سنسکرت زبان سیکھی، بیرونی نے لکھا ہے کہ جن پرانوں کو میں نے زبانی سیکھا وہ درج ذیل ہیں۔ اوم پران، ، کورم پران، نرسنگ پران، بایو پران، بامن ہران، نند پران، اسکند پران، ادت پران، سانپ پران، برہماند پران، مارکندیو پران، تارکشن پران، بشن پران، برہم پران اور بیس پران۔[1]

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں میں سنسکرت بھاشا کی تعلیم کافی حد تک رائج ہوچکی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہوئی کہ دولت عباسیہ میں بیت الحکمت میں باقاعدہ ایک شعبہ قائم تھا جس میں سنسکرت زبان کے تراجم کیے جاتے تھے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے نہایت توسع کے ساتھ ہندوستانی تہذیب اور ہندوؤں کے علوم ومعارف کو مسلم معاشرے میں رواج دیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے ان سنسکرت کتابوں کی فہرست بھی دی ہے جن کو ہندو اہل علم نے تصنیف کیا اور بعد میں عربی زبان میں منتقل کی گئیں۔ علامہ شبلی نعمانی کی تحقیق کے مطابق ایسی بیس کتب ہیں۔ موضوع کے تنوع اور علوم معارف کے تعدد کی وجہ سے ان کی اہمیت وافادیت سے انحراف نہیں کیا جاسکتا ہے۔

[1] مقالات شبلی، جلد ششم صفحہ ۸۴-۸۳

اسلام اور ہندو دھرم کی مشترک اقدار اور مولانا مناظر احسن گیلانی

مولانا سید مناظر احسن گیلانی (۱۸۹۲ء-۱۹۵۶ء) کا شمار ہندوستان کی ان عبقری شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے علم وتحقیق اور فکر وفن کے میدان میں گراں قدر اور قابل ذکر خدمات انجام دی ہیں۔ مولانا جہاں ایک تجربہ کار استاد اور ماہر تعلیم تھے، تو وہی بہترین سیرت نگار، سوانح نگار، مکتوب نگار بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کئی اہم کتابیں تصنیف کی جو اہل علم کے یہاں مقبول عام ہیں۔ مثلاً تدوین قرآن، تدوین حدیث، تدوین فقہ، النبی الخاتم، الدین القیم، سوانح قاسمی (تین جلدیں) ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت (دو جلدیں) اسلامی معاشیات، احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، دربار نبوت کی حاضری، مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ، عبقات، تذکرہ شاہ ولی اللہ وغیرہ وغیرہ۔ آپ کی جملہ تحریریں اور کتب قارئین و ناظرین کو ایک فکر اور مثبت ومتوازن نظریہ دیتی ہیں۔ البتہ سطور ذیل میں مولانا گیلانی کے ادیان و مذاہب کے متعلق خیالات وافکار کو پیش کیا جائے گا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ آپ نے ہندومت کے متعلق باقاعدہ ایک کتاب تصنیف کی ہے جو 'ہزار سال پہلے' کے عنوان سے موسوم ہے اسی طرح ایک مضمون ماہنامہ معارف میں بھی لکھا ہے 'اسلام اور ہندو دھرم کی مشترکہ اقدار' کے عنوان سے۔ ان کے علاوہ دیگر ادیان کے متعلق اپنی مختلف کتابوں میں ضمنی بحثیں کی ہیں۔

کتب وصحائف اور مولانا گیلانی:

اس موضوع پر گفتگو کرنے سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ کسی مذہب اور اس کی حقیقی

تعلیمات کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس مذہب اور دین کے مصادر اصلیہ یعنی ان کے جو اصل ماخذ ہیں ان کے ذریعے سمجھا جائے۔ اس حوالے سے مولانا گیلانی نے دیگر ادیان کے جن مصادر کا مطالعہ کیا ہے ان کو ذیل میں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ سعاد محمد عباس اور سید عبدالغفور بخاری نے اپنے ایک مقالہ بعنوان: 'مولانا گیلانی اور ان کا مطالعہ ادیان' میں بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے. وہ لکھتے ہیں کہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے ہندو مذہب کے مطالعہ کے لیے سب سے زیادہ توجہ مہارت پر مرکوز کی. آگے لکھتے ہیں مہابھارت ایک ایسی ہندو مقدس کتاب ہے جس کا اب بھی تقریباً ویدک دھرم کے ماننے والوں کے گھر میں پوجا پاٹ (عبادت) ہوتی ہے اور ہر کسی کی رسائی خود اس کتاب تک اور اس کے مضامین تک آسان ہے۔ اس میں ایسی حیرت انگیز چیزیں ملتی ہیں کہ آدمی مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ قرآن کے ذریعہ سے جو کچھ دیا گیا ہے اس کا بڑا حصہ اب بھی ہندوستان کے اگلے بزرگوں کی کتابوں میں موجود ہے اسی طرح مولانا گیلانی نے عیسائیت پر مطالعہ کے لیے انجیل عہد نامہ جدید کو اپنے مطالعے کا مرکز بنایا جو آجکل اردو بائبل روائز ایڈیشن کے نام سے موسوم ہے۔[1]

کتب مقدسہ کی بابت مولانا گیلانی کے افکار

مولانا گیلانی اپنی کتاب تدوین قرآن میں لکھتے ہیں:

''تاریخی طور پر اس کا متعین کرنا دشوار نہیں بلکہ ناممکن ہے کہ نسل انسانی کو پہلی کتاب خدا کی طرف سے کون سی؟ کہاں اور کب ملی؟ قرآن کا اجمالی بیان یہ ہے کہ ہر امت میں نذیر اور خدا کے نمائندے آسمانی ہدایت کی تعلیم کے لیے آتے رہے ہیں اور جس طرح خاتم النبیین محمد رسول اللہ پر قرآن کی وحی ہوئی اسی طرح ان سے پہلے نوح علیہ السلام اور انبیاء علیہم السلام پر ہوتی رہی۔ ارشاد باری ہے:

''ہم نے تم پر وحی اس طرح کی جیسے نوح پر اور نوح کے بعد پیغمبروں پر وحی کرتے رہے ہیں'' (سورہ نساء ۱۶۳) اس سلسلے میں چند پیغمبروں کے نام لینے کے بعد یہ بھی فرمایا گیا

---

[1] مولانا گیلانی اور ان کا مطالعہ ادیان، مضمون نگار، سعاد محمد عباس، سید عبدالغفور بخاری، ص ۹۶ اور ص ۹۹

ہے۔ ''ان پیغام لانے والوں میں سے بعضوں کا حال تم سے ہم نے بیان کیا اور بعضوں کا حال نہیں بیان کیا''۔ (سورہ نساء ۱۶۴) جس سے معلوم ہوا کہ انسانی زندگی کے نیک اور بدانجام کو علم و عمل کے نظام پر مرتب کرنے کے لیے اور اس کی تشریح و تعلیم کے لیے پیغمبروں کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا ہے۔ پھر دوسری جگہ اس کی بھی تصریح کی ہے۔

''الدین (یعنی ایسا آئینی دستور جس پر زندگی کے دوسرے دور میں بدلہ دیا جائے اس کو قانون بنا کر) جو ہمیں دیا گیا یہ وہی دین ہے جس کی وصیت خدا نے نوح علیہ السلام کو کی اور جس کی وحی ہم نے تم پر کی اور اس کی وصیت ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو کی اور موسیٰ کو بھی اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی (اسی کی وصیت کی گئی مقصد یہ تھا اور ہے) کہ اس الدین (اسی دستور کو) قائم کرو اور اس میں بکھر ومت'' (سورہ الشوریٰ: ۱۳) ایک اور مقام پر یہ فرمایا:

''کیا بات کہ وہ سوچ نہیں رہے ہیں، یا ان کے پاس کوئی ایسی چیز آئی ہے جو ان کے آبائی اولین اگلے باپ دادوں کو نہیں دی گئی تھی''۔

ان تمام شواہد اور قرآنی آیات سے استدلال کرنے کے بعد مولانا گیلانی تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس امر کو واضح الفاظ میں صاف کر دیا گیا ہے کہ انسانی زندگی کا قدرتی دستور العمل جس کی دین و مذہب کیش اور دھرم وغیرہ الفاظ سے لوگ تعبیر کرتے ہیں یہ انسانیت کا ایک مشترکہ موروثی ترکہ ہے اور اصولاً ایک ہی دستور العمل ہے جس کی پابندی کا مطالبہ اس زمینی زندگی میں اول سے لے کر آخر تک بنی نوع انسان کی تاریخ کے ہر دور میں کیا گیا ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا، آخر قانون کا بنانے والا جب ایک ہو اور جس کے لیے قانون بنایا گیا ہو وہ بھی ایک ہو تو شکل وصورت، چہرہ و بشرہ، رنگ و روغن کے اختلاف سے یا زمین کے کسی خاص حصے میں سکونت کی وجہ سے جو کسی دریا پہاڑ وغیرہ سے گرا ہو یا کسی خاص خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے یا زبان کے اختلاف کی وجہ سے یا انسان جن چیزوں کو استعمال کرتا ہے ان کے بدل جانے کی وجہ سے کیا آدمی کی

فطرت بدل جاتی ہے''۔[1]

مولانا گیلانی کے اس اقتباس کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ سابقہ انبیاء کرام کو جو قانون الٰہی اور دستور زندگی دیا گیا تھا اسی کا اعادہ بعد میں بھی کیا جاتا رہا ہے۔ اس بنا پر یہ بات بھی اخذ ہوتی ہے کہ ہندوؤں کے پاس جو دستور ویدوں کی شکل میں ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ الہامی ہو۔ گویا مولانا گیلانی سابقہ شریعتوں کی اہمیت وافادیت کے بھی پوری طرح قائل نظر آتے ہیں۔ سابقہ شرائع کے حوالے سے مزید گفتگو کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''ایک ہی کتاب کو چند آدمی اگر کتب خانے سے نکالیں تو چند لانے والوں کی وجہ سے کیا وہی ایک کتاب بھی چند ہو جائے گی۔ یقیناً کسی مصنف کی کتاب کے چند ایڈیشن کو دیکھ کر یہ فیصلہ کتنا غلط فیصلہ ہوگا کہ مصنف کی ایک کتاب نہیں بلکہ چند کتاب بن گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن تمام آسمانی کتابوں کے ساتھ اپنی اسی نسبت کا مدعی ہے یعنی پچھلی ساری آسمانی کتابوں کا اپنے آپ کو وہ آخری اور مکمل ایڈیشن قرار دیتا ہے اور قوموں کے پاس اس کتاب کے جو پرانے، مشتبہ اور مشکوک یا ناقص وغیر مکمل نسخے رہ گئے ہیں ان کے متعلق اس کا صرف یہ مطالبہ ہے کہ اس جدید ترین اور کامل ایڈیشن سے مقابلہ کر کے قومیں اپنی موروثی کتابوں کی تصحیح کر لیں۔ یہی اور صرف یہی ایک مطالبہ قرآن نے دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے اس مطالبہ کا مطلب کسی حیثیت اور کسی لحاظ سے بھی یہ نہیں ہے کہ دنیا کی قوموں کے پاس آسمانی دین اور مذہب اپنے آباؤ اجداد سے جو پہنچا ہے اس دین سے اور اس دین کا انتساب جن بزرگوں کی طرف ہے ان بزرگوں سے بے تعلق ہو کر قرآن کو بالکلیہ ایک جدید دین اور دھرم کی حیثیت سے مانا جائے۔ یقیناً نہ قرآن ہی کا یہ مطالبہ ہے اور نہ قرآن کے ماننے والوں کی طرف سے یہ دعوت دنیا کے سامنے کبھی پیش ہوئی''۔[2]

---

[1] گیلانی، سید مناظر احسن (مولانا) تدوین قرآن، مکتبہ بخاری، ۲۰۰۵ء، ۳۴-۳۸

[2] ایضاً، ص: ۳۹

اس تناظر میں مولانا کی گفتگو کا یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم سابقہ تمام شریعتوں کا آخری ایڈیشن ہے۔ اسی طرح مولانا نے ایک بحث یہ کی ہے کہ کیا قرآن کریم کسی کو اس کے موروثی دین سے جدا کرتا ہے؟:

''آج کروڑہا کروڑ کی تعداد میں مسلمان دنیا کے اکثر علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں یقیناً ان میں عیسائی، یہودی اور اسی قسم کے دوسری مذہبی امتوں کے لوگ بھی شریک ہیں۔ پھر کیا قرآن کو مان کر جو عیسائی تھے مسلمان ہونے کے بعد انھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی کتاب انجیل کی تکذیب کی، یا جو یہودی تھے مسلمان ہونے کے بعد موسیٰ علیہ السلام یا انبیاء بنی اسرائیل کی توہین کر رہے ہیں، یا تورات اور تورات کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کی جو کتابیں ہیں انہیں جھٹلا رہے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مسیح کی تعلیم سے جو دور ہو گئے تھے قرآن شریف کو مان کر وہی عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی صحیح تعلیم سے پھر قریب ہو گیے اور یہی حال ساری قوموں کے ساتھ پیش آیا ہے جو گزشتہ تیرہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں قرآن کو مان کر اسلامی حلقے میں داخل ہوتی رہی ہیں یعنی اپنے آبائی اور موروثی دین کے جن اجزاء وعناصر کو لوگ کھو بیٹھے تھے یا تاریخی حوادث واقعات نے ان کے دین کے جن حقائق ومسائل کو مشتبہ ومشکوک بنا کر رکھ دیا تھا۔

قرآن شریف کی راہ سے ان کھوئی ہوئی چیزوں کو انھوں نے پا لیا اور شک و ریب کی تاریکیوں میں جو باتیں رل مل گئی تھیں، قرآن کی روشنی میں اب یقین کی آنکھوں سے دیکھنے اور پا لینے میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ پس حقیقت یہی ہے کہ اپنے آباء اولین اور گزشتہ باپ دادوں کے دین سے قرآن پاک کو مان کر قطعاً کوئی الگ نہیں ہوا ہے۔ بلکہ جو لوگ الگ ہوئے تھے۔ بلاخوف تردید دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے آبائی دین کی طرف خدا کی اس آخری کتاب نے ان سب کو واپس کر دیا۔ اس نے توڑا نہیں بلکہ جو ٹوٹے ہوئے تھے ان کو اپنے

بزرگان سلف اوران کی سچی تعلیم صحیح زندگی کے ساتھ جوڑ دیا ہے، واقعہ یہی ہے خواہ دنیا اس کو مانے یا نہ مانے قرآن کی دعوت وتبلیغ کا یہی محوری نصب العین ہے۔ بکھری ہوئی منتشر اور پراگندہ انسانیت کو اسی راہ سے وحدت وفاق کے مرکزی نقطہ پر وہ ''سمیٹ کر'' وہ لے آنا چاہتا ہے''۔[1]

یعنی مولانا کا خیال یہ ہے کہ اسلام کسی بھی دھرم کے ماننے والے کو اس کے آبائی دین سے جدا نہیں کرتا ہے بلکہ جو اسلام میں آ گیا تو اس کی مزید اصلاح ہو جاتی ہے۔ مولانا کا یہ معتدل اور متوازن نظریہ عہد حاضر میں مذہبی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی ومعاشرتی توازن کے حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مولانا کے اس نظریہ کو آگے بڑھایا جائے تا کہ باہم رائج غلط فہمیوں کو بآسانی دور کیا جا سکے۔

صابئین کون ہیں؟

قرآن مجید میں صابئین کا ذکر آیا ہے۔ صابئین کس قوم کو کہا جاتا ہے یہ مسئلہ علماء اور اصحاب علم کے یہاں مختلف فیہ رہا ہے۔ البتہ مولانا گیلانی نے اپنی تحقیق اور مطالعہ کی وسعت سے یہ دعوی کیا ہے کہ صابئین سے مراد بدھ مت کے ماننے والے ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے ایک مضمون 'قرآن کے صابئین کیا بدھ مت کے ماننے والے تھے؟' کے عنوان سے رقم کیا ہے، اس مضمون کو ماہنامہ معارف نے، فروری، مارچ ۱۹۵۳ء کے شمارہ میں شائع کیا ہے۔ پھر اس مضمون کو مقالات گیلانی میں شائع کیا گیا ہے۔ مولانا گیلانی کا تقابل ادیان پر یہ بڑا علمی اور تحقیقی مضمون ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

اسلام اور ہندو مذہب کی بعض مشترک تعلیمات

مولانا گیلانی نے ہندوازم پر اپنی کئی کتابوں میں ضمنی بحثیں کی ہیں۔ جو بقائے باہم اور رواداری کے فروغ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی مناسبت سے انھوں نے ایک قابل قدر مضمون ''اسلام اور ہندو مذہب کی بعض مشترک تعلیمات'' کے عنوان سے لکھا ہے جو

---

[1] گیلانی، سید مناظر احسن (مولانا) تدوین قرآن، ص ۴۱

ماہنامہ معارف، اپریل ۱۹۵۲ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔

اس مضمون میں ان ہوں نے درج ذیل تعلیمات میں مشترک اقدار کا ذکر کیا ہے۔ (۱) توحید (۲) جنت و دوزخ کا تصور (۳) عبادت سے قبل پاکی حاصل کرنے کا تصور (۴) صدقہ وخیرات کا تصور وغیرہ وغیرہ۔ اسی مضمون میں مولانا گیلانی نے ایک بات بڑی اہم کہی ہے وہ یہ کہ اسلام اور ویدک دھرم یعنی ہندوازم کا تقابل علمی وتحقیقی بنیادوں پر نہیں کیا گیا ہے:

''افسوس ہوتا ہے کہ اسلام اور ہندوؤں کے ویدک دھرم کا مقابل صحیح علمی روشنی میں نہیں کیا گیا۔ ایک ہندو وودوان (عالم) کے تاثرات تو آپ دیکھ چکے، خود مسلمانوں کا بھی حال اس معاملہ میں یہ کہ براہ راست ہندوؤں کی کتابوں کے پڑھنے کا موقع جن لوگوں کو نہیں ملا ہے، سنی سنائی باتوں کو واقعات قرار دے کر اس قسم کی چیزیں ان کی کتابوں میں بھی درج ہوگئی ہیں اور تو اور محمد بن عبدالکریم شہرستانی جنھوں نے مذاہب وادیان پر اپنی مشہور کتاب 'الملل والنحل' لکھی ہے اس میں بعض مسلمانوں کے اس خیال کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ برہمن کا برہما نامی جس شخص کی طرف منسوب ہے، دراصل یہ حضرت ابراہیم کے نام کا ایک ہندی تلفظ ہے''۔[۱]

اس پر مولانا کا اعتراض یہ ہے کہ شہرستانی نے پتہ نہیں کیوں یہ بات لکھی ہے۔ حالاں کہ دنیا جانتی ہے کہ برہمن کے دین کی بنیادی کتاب وید کے متعلق عام عقیدہ اس کتاب کے ماننے والوں کا یہی ہے کہ خالق کائنات کی نازل کی ہوئی کتاب ہے، دور کیوں جایئے 'مہابھارت' جو عام طور ہندو گھروں میں اب بھی پڑھی جاتی ہے اس میں بہ کثرت اس قسم کی باتیں آپ کو مل سکتی ہیں۔

مثلاً ''پریشر (خدا) کی سانس سے ویدا پتن پیدا ہوئے''۔

یا اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ یہ ہیں کہ:

''پتشری (عبادت گزار) لوگ بید بچن (وید کے الفاظ) کو بھگوان کا واک

---

[۱] گیلانی، سید مناظر احسن، (مولانا) مقالات گیلانی، شیخ زائد اسلامک سینٹر، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۴۸

(کلام) جان کر اس پر درہ بدھی (استقامت اختیار کرے) رہے ہیں'' بہر حال وید کا برہما کے منھ سے نکلنا، ہندوؤں کے سناتن دھرم کا عام عقیدہ ہے اور خواہ شہرستانی کو اس کا علم نہ ہو۔ لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کے سربرآوردہ علماء اور صوفیاء بھی اپنی کتابوں میں اس قسم کی باتیں لکھتے رہے ہیں۔[1]

مرزا مظہر جان جاناں نے برہما کو بجائے ابراہیم کے 'ملک' یعنی فرشتہ قرار دیا ہے لیکن اس کی تصریح فرمائی ہے کہ وید خدا کی نازل کی ہوئی کتاب ہے، یہی ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔[2]

گویا گیلانی کا کہنا یہ ہے کہ ہندو دھرم ہو یا دیگر کوئی اور دھرم، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا مطالعہ امانت و دیانت اور پورے اخلاص سے کیا جائے۔ اسی طرح اسلام کا دیگر ادیان سے تقابل کرنے کے لیے بھی ضروری ضروری ہے کہ دیگر مذاہب کی فہم حاصل کرنے حاصل کرنے کے لیے اس کے اصل ماخذ و مصادر کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ جب دوسرے مذہب کا درست علم ہوگا تبھی جا کر ہم متوازن اور مثبت نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

قرآن اور مہابھارت کی تعلیمات میں یکسانیت کے پہلو

مولانا گیلانی لکھتے ہیں۔ قرآنی تعلیمات کا بنیادی مسئلہ اور جوہری روح جیسا کہ سب جانتے ہیں توحید ہے، اس حوالے سے ہندو دھرم کی معروف کتاب مہابھارت میں بڑی دلچسپ باتیں ملتی ہیں۔ جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ توحید کے معاملے میں دونوں ادیان یعنی ہندو دھرم اور اسلام میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ مہابھارت کے ایک ادھیائے میں مذکور ہے۔ ''اس برہم کی صورت کسی نظیر اور مثال سے نہیں بنائی جاسکتی اور نہ کوئی اس کے مشابہ ہے'' اسی نظریہ کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ لیس کمثلہ شیی ۔ اسی طرح مہابھارت میں ایک جگہ پر یہ بھی لکھا ہے۔ ''جس کے اوپر نارائن کرپا (مہربانی) کریں اس کا کوئی

---

[1] گیلانی، سید مناظر احسن، (مولانا) مقالات گیلانی، ص ۴۹

[2] ایضاً، ص: ۵۰

بگاڑ نہیں سکتا اور جس پر پریشر کوپ کریں اسے کوئی بچا نہیں سکتا'' اسی مفہوم کو سورہ فاطر میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ ''اللہ آدمی کے لیے جس رحمت کو کھولے، اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جسے روک دے اسے کوئی کھول نہیں سکتا''۔ (سورہ فاطر:۲) [۱]

ان کے علاوہ اور بھی کئی مثالیں پیش کی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ توحید کے متعلق ہندومت میں بہت ساری چیزیں ایسی ملتی ہیں جو بعینہ اسلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''اسی مضمون کی بے شمار آیتوں کے مفہوم ہی کے اعادہ کی شکل ہے۔ آپ بکثرت اس بھارت میں پا سکتے ہیں، اور قدم قدم پر اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کی اگلی نسلوں کو جو کچھ دیا گیا تھا، جیسے دوسروں تک ان کے آبائی سرمائے کو قرآن نے واپس کیا ہے۔ اسی طرح اس ملک کے صحیح موروثی دین کو ان وارثوں تک وہ پہنچانا چاہتا ہے'' [۲]

اسی طرح ایک جگہ انسانی اعمال اور اس کی جزا و سزا کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''جو کوئی منش (آدمی) پاپ کرم (گناہ کا کام) کر کے پشچا تاپ کرتا ہے (یعنی پچھتاتا اور نادم ہوتا ہے) وہ پچھلے کیے ہوئے پاپ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اور جو یہ کہتا ہے کہ پھر ایسا پاپ کرم نہیں کرونگا وہ اس کیے ہوئے پاپ کا پھل نہیں پاتا'' اسی مفہوم کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے لہا ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت۔ [۳]

ہندوزم کے نظریہ تناسخ ارواح یا آواگون کے متعلق مولانا گیلانی کی تحقیقات درج ذیل ہیں، مہابھارت کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''سرگ اس لوک (عالم) ہے جہاں سب پدارتھ (ساز و سامان) موجود

---

[۱] گیلانی، سید مناظر احسن، (مولانا) مقالات گیلانی، ص۵۳-۵۴

[۲] ایضاً، ص:۵۴

[۳] ایضاً، ص:۵۵

ہیں وہاں رہنے والوں کو بھوک پیاس، سردی گرمی کچھ نہیں لگتی'' [1]

اس کے علاوہ اور بھی کئی شواہد ہندوازم کی کتاب مہابھارت سے پیش کرنے کے بعد ایک نہایت مفید نوٹ رقم کرتے ہیں:

'' شاید ہی کوئی حصہ مہابھارت کا ہوگا جو انسانیت کے ساتھ آخری انجام یعنی الجنۃ والنار کے ذکر سے خالی ہو، پھر کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ تھودیا موجودہ یہودیت جس کی آسمانی کتاب کو جنت اور دوزخ ہی نہیں بلکہ اس لوک اور عالم کے بعد دوسرے لوک یا عالم کی زندگی کی ذکر سے ہم قطعی طور پر خاموش پاتے ہیں۔ اس دین کو محض یوروپ والوں کی اس قسم کی مصنوعی تقسیموں یعنی سامی و آریائی، دونوں وغیرہ حصوں میں مذہبی قوموں کو بانٹ کر یہ فیصلہ جو کر دیا گیا ہے کہ اسلام اور یہودیت ونصرانیت تو دین کی سامی تقسیم میں شریک ہیں اور ہندوستان وغیر میں جو دین اور دھرم پھیلا ہوا تھا وہ اس کی آریائی شکل ہے، حالانکہ میرا تو خیال ہے کہ یہودیت اور نصرانیت کے متعلق چاہے کہنے والے کچھ بھی کہیں لیکن اسلامی دین جسے قرآن کی دعوی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اصولاً دین کی یہ کوئی شکل وصورت نہیں ہے، بلکہ ساری انسانی نسلوں کا جو حقیقی موروثی اور آریائی دین اور دھرم تھا، اس کو ہر قسم کی خارجی آمیزشوں سے صاف و پاک کر کے قوموں کے حوالے کر دیتا یہی اس کا نصب العین ہے۔

قرآن کے پیش کرنے والے نے اور پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی خصوصیت جب یہی ہے تو ایسی صورت میں کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ ہندوستان جیسے عظیم ملک کے باشندوں کو قرآنی دائرے کے مذکورہ بالا احاطہ سے خواہ مخواہ دور سمجھا جائے۔ بلکہ تحقیق وتلاش سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کا آبائی اور موروثی دھرم قرآن کے پیش کیے ہوئے دین سے جتنا زیادہ قریب اور نزدیک ہے، شاید یہ نزدیکی ان دینوں اور مذہبوں کی

[1] گیلانی، سید مناظر احسن، (مولانا) مقالات گیلانی، ص ۵۶

موجودہ شکلوں کو بھی بمشکل میسر آ سکتی ہے۔ جن کو یورپ والوں کی مذکورہ بالا فرضی تقسیم کی رو سے سامی ادیان کی فہرست میں ہم شریک پاتے ہیں۔ حالانکہ محض بہ چند سرسری باتیں اور وہ بھی صرف ایک کتاب مہابھارت کے مختلف مقامات سے اخذ کر کے آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں لیکن قرآن کے پڑھنے والوں سے میں حق کی گواہی کی درخواست دیتا ہوں، توحید فی الخلق، توحید فی العبادۃ، توحید فی الافعال یا قانون بدواثم (نیکی و بدی) اس قانون کے نتائج، الجنۃ والنار، توبہ استغفار الغرض ان سارے اصولی حقائق جن پر قرآن تعلیمات کی بنیاد قائم ہے، کیا وہی ساری باتیں مہابھارت میں بھی نہیں مل رہی ہیں؟ سچ تو یہ ہے کہ بعض بعض فقرے مہابھارت کے مذکورہ بالا حوالوں میں ایسے بھی ہیں کہ قرآن کی عربی عبارت کے سامنے بطور ترجمہ ہم ان کو بآسانی درج کر سکتے ہیں۔

اور یہ قصہ صرف مبدء معاد، نیکی و بدی ہی کے تفصیلات تک محدود نہیں ہے، بلکہ اخلاقی فضائل و رذائل کی جو فہرست اسلام میں پائی جاتی ہے بجنسہ یہی یہی فہرست ویدک دھرم کی بھی ہے۔ بلکہ ایسی چیزیں جو عموماً اسلام کے ساتھ مختص سمجھی جاتی ہیں، مثلاً جوا، شراب نوشی، ان کی حرمت کا بھی بار بار ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ قمار (جوا) اہمیت تو اسی سے ظاہر ہے کہ مہابھارت کا موضوع ہی ایک حیثیت سے سمجھا جائے تو قمار یعنی جوا ہی کے نتائج اور انجام کو بیان کرتا ہے۔ یہی بتایا گیا ہے کہ یہ ساری خونریزیاں جو مہابھارت کی جنگ میں ہوئیں اور جیسا کہ اسی کتاب میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ کروڑہا کروڑ انسان جو جنگ میں مارے گئے، سب کا خون پانڈو اور کورو خاندان کے شہزادوں کے جذبہ قمار بازی کے سر عائد ہوتا ہے۔ گویا جوابازی کے نتیجے کو دکھلانے کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ کتاب مرتب کی گئی ہے، مگر حیرت ہوتی ہے کہ بہت سی باتیں جو ہندوستان میں عموماً مروج ہیں بلکہ عام طور پر دین اور

دھرم کے نام لینے والے جن اعمال کو اپنی خصوصیت قرار دیتے ہیں ان کے
متعلق بھی اس مہابھارت میں وہی نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے جو اسلام کا ہے''۔[1]

مولانا گیلانی کی تحقیق اور ان کی وسعت فکر کا اندازہ درج بالا اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے یعنی مولانا کی رائے کے مطابق ہندوستان میں آنے والی آریائی قوم غیر سامی نہیں۔ بلکہ وہ سامی ادیان کا ہی حصہ ہے جو بدقسمتی سے غیر سامی ادیان میں شامل کرلیا گیا۔ اسی طرح وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اسلام اور ہندومت کی تعلیمات میں اتفاقات اور اشتراکی اقدار پائی جاتی ہیں، وہ محض ایک اتفاق نہیں بلکہ اسلام اور ہندو دھرم کی مشترکہ اقدار کے پائے جانے سے موجودہ عیسائیت اور یہودیت سے زیادہ قریب ہے۔ اس لیے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہم معاشرے میں رائج غلط فہمیوں کا ازالہ بخوبی کر سکتے ہیں۔ جن اقدار و تعلیمات میں مولانا گیلانی نے اتفاق بتایا ہے یقیناً اسلام کا اہم ترین حصہ ہیں اور ان کی بابت قرآن و حدیث یا پھر اسلامی مآخذ و مصادر میں باقاعدہ احکام ملتے ہیں۔

ہزار سال پہلے

مولانا گیلانی نے جزیرہ نمائے پاک و ہند، اسلامی ممالک اور چین کے تہذیبی و تمدنی حالات پر ایک کتاب باقاعدہ 'ہزار سال پہلے' کے عنوان سے تصنیف فرمائی۔ اس کتاب کو پہلی مرتبہ ۱۹۵۰ء میں ہندوستان سے شائع کیا گیا، اور دوسری مرتبہ نفیس اکیڈمی کراچی سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی اس کتاب میں مولانا گیلانی نے ہندوستان کی تہذیب، یہاں کی رسم و رواج اور ہندوستان کے متنوع و تعدد پسند مزاج کا ذکر نہایت مستند حوالوں سے کیا ہے۔ اس حوالے سے جو بھی دلائل و براہین پیش کیے ہیں وہ مسلمانوں کی کتابوں سے لیے ہیں۔ یہ بات اپنے آپ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ ایک دو مسلمان نہیں بلکہ متعدد مسلمان مفکرین اور اصحاب قلم نے ہندوستان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں امانت و دیانت اور کشادہ ظرفی کا پورا نمونہ پایا جاتا ہے۔

---

[1] گیلانی، سید مناظر احسن، (مولانا) مقالات گیلانی، ص ۵۶-۵۸

وجہ تالیف

مولانا گیلانی نے اپنی اس کتاب کے مقدمہ میں اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ آخر اس کو ترتیب کیوں دیا گیا:

> ''جس زمانے میں یادداشتوں کا یہ مجموعہ قلم بند ہوا، اس وقت ملک کے دو بڑے طبقوں کے درمیان ان زہرہ گداز، جاں سوز، روح گسل کا ظہور نہیں ہوا تھا، جنہیں شاید کبھی سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا، مگر ان ہی کو دیکھنا پڑا، سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے سلجھے ہوئے تعلقات جو صدیوں سے دونوں قوموں میں قائم تھے اچانک انہی کو کس الجھانے والے نے الجھا دیا'' [1]

مصنف نے اس اقتباس سے جو بیان کیا ہے یعنی ہندو مسلم منافرت کے متعلق چنانچہ اس بات کی ضرورت اس وقت بھی مولانا گیلانی جیسے اہل علم محسوس کر رہے تھے اور آج بھی اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ ہندوستان میں رہنے والے تمام طبقات اور ادیان و مذاہب کے حاملین مل جل کر رہیں۔ اتحاد و اشتراک کے اصول پر عمل کریں۔ جو منافرت یا ایک دوسرے کے تئیں تنگ نظری بڑھ رہی ہے اس کا خاتمہ کیا جائے۔ اسی طرح ایک دوسرے کے دین دھرم اور عقائد و ایمان کے متعلق جو باتیں بعض مفاد پرست بنا رہے ہیں ان کی سرکوبی علمی اور فکری طور پر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے اس وقت مولانا نے باقاعدہ ایک تحریر لکھی لہٰذا آج بھی ضرورت ہے کہ ہم ایسی تحریریں اور کتابیں لائیں جو ہماری صدیوں پرانی تاریخ اور اشتراکی قومی اقدار کو مجروح و مخدوش ہونے سے بچا سکیں۔ جب ہم یہ کام کریں گے تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان جیسی مقدس سرزمین میں نفرت و تعصب کی دکان یکا یک بند ہو جائیں گی مولانا گیلانی نے اپنی اس کتاب کو تین ابواب اور کئی ذیلی عناوین پر مشتمل کیا ہے (۱) ہندوستان (۲) چین (۳) عام اسلامی ممالک۔

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، (مولانا) ہزار سال پہلے، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۱۱

مسلمانوں کا توسع

مولانا گیلانی نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں ہندوستانی زبانیں یعنی ہندوؤں کی سنسکرت زبان کے متعلق بھی بڑی فکر انگیز گفتگو کی ہے اور انھوں نے ثابت کیا ہے کہ قرآن و حدیث میں سنسکرت کے الفاظ آئے ہیں، جو مسلمانوں کی وسعت اور ان کے روادارانہ مزاج کا حامل ہے۔

آج ہی سے نہیں ہمیشہ سے مسلمانوں نے سرزمین ہند اور اس کے باشندوں کو کتنی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اس ملک کی عام مروجہ بت پرستی جو شاید سب سے زیادہ مسلمانوں کے لیے باعث گرانی ہو سکتی تھی، مگر حضرت عبداللہ بن مسعود صحار کے خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک مورخ کی وہ تنبیہ خاص طور پر قابل توجہ ہے جس کا ذکر ہندوستان کی بت پرستی کے متعلق انھوں نے کیا ہے:

> ''آسمانی مقدس کتاب قرآن کے متعلق شروع سے مسلمانوں کے اہل علم طبقہ یا اس دعوے کو حسن قبول حاصل رہا ہے کہ من جملہ دوسری زبانوں کے قرآن میں ہندی زبان کے بعض الفاظ بھی پائے جاتے ہیں اتقان وغیرہ کتابوں میں ان الفاظ کی آپ کو فہرست مل سکتی ہے'' [1]

مسلمانوں میں اجنبی زبان سیکھنے کا ذوق بھی خوب ملتا ہے مولانا گیلانی نے ایک واقعہ بزرگ بن شہریار کی کتاب 'عجائب الہند' کے حوالے سے نقل کیا ہے:

> ''ابوالزہراء جو پہلے ایرانی مجوسی تھا اور بعد میں مسلمان ہو گیا تھا اس کی زبانی ایک بڑا طویل قصہ نقل کیا ہے، اس کا بیان ہے کہ ہمارا جہاز طوفان میں گھر گیا تھا، پریشان تھے، کپتان کی نگاہوں سے بچ کر ایک اندلسی مسلمان جو فارس کا رہنے والا تھا جہاز میں سوار ہو گیا تھا اور مدتوں جہاز کے ایک گوشے میں پڑا رہا ،لوگوں کی پریشانی دیکھ کر باہر نکلا اور کپتان کے پاس پہنچا، ہندوستانی زبان

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، (مولانا) ہزار سال پہلے، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۱۱-۱۲

میں اس اندلسی مسلمان نے کپتان کو سلام کیا، کپتان نے اسی زبان میں اس کو جواب دیا''۔[1]

مولانا گیلانی نے اسی سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ نقل کیا ہے جو مسلمانوں کے توسع کی علامت ہے:

''ہندوستان کا ایک راجہ جو کشمیر اعلی اور کشمیر اسفل کے درمیانی علاقے کا راجہ تھا اور میروک بن رائق اس کا نام تھا اس نے ۲۷ھ میں منصورہ کے امیر عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کے پاس خط لکھا کہ اس کے پاس ایسا آدمی بھیج دیا جائے جو اسلام کے احکام ہندی زبان میں بیان کر سکے۔ منصورہ کے امیر نے ایک مسلمان کو بھیجا اس کے متعلق لکھا ہے عرف لغاتہا علی اختلافہا ہندوستان کی مختلف زبانوں کو جانتا تھا۔ راجہ کے پاس یہی مسلمان چند سال رہا اور اسلام سے راجہ کو پورے طور پر اس نے واقف بنا دیا۔

اسی سلسلہ اس کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے:

انہ سئلہ ان یفسر لہ القران بالہندیۃ غفیر لہ۔ راجہ نے اس سے خواہش ظاہر کی کہ ہندی زبان میں اس کے لیے قرآن کی تفسیر کرے۔ اسی کا بیان ہے کہ انتہیت من التفسیر الی سورۃ یاسین۔ یعنی سورہ یاسین تک اس نے قرآن کی تفسیر ہندی زبان میں مکمل کر دی تھی''۔[2]

متذکرہ دونوں واقعات سے جہاں مسلمانوں کی معتدل مزاجی اور ان کے توسع پسند رخ کا پتہ چلتا ہے وہیں یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں اس وقت ہندوستانی جاننے والے موجود تھے۔ یاد رکھیے زبان معاشروں اور مختلف اقوام کو قریب کرتی ہیں، نیز کسی بھی قوم کی زبان سیکھنے سے اس کی تہذیب تاریخ اور ثقافت کا پورا علم حاصل کیا جا سکتا ہے اور جب کسی قوم

[1] گیلانی، مناظر احسن، (مولانا) ہزار سال پہلے، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۴۶

[2] ایضاً، ص: ۴۶-۴۷

خواہ وہ دینی اعتبار سے الگ ہو، اس کی تہذیب و معاشرت کا پتہ چل جاتا ہے، تو بہت ساری غلط فہمیاں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔ اس دور میں مسلمانوں نے ہندوستان کی زبانیں سیکھی تھی جس کے شواہد اوپر بیان ہوئے ہیں اس کا مقصد بھی یہی ہوگا کہ تقابل ادیان اور مطالعۂ ادیان کے باب کو وا ملے۔

مولانا گیلانی نے ادیان اور دیگر قوموں کی تہذیب و ثقافت کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی عہد حاضر میں جو افادیت و معنویت ہے اس سے انکار نہیں جا سکتا ہے۔ تنگ نظری اور تشدد جب کسی قوم میں کسی دوسرے دھرم کے حوالے سے پایا جاتا ہے، تو پھر اس سماج میں باہمی رشتہ اور بقائے باہم جیسی روایات پر آنچ آنے لگتی ہے۔ پھر یکا یک وہ سماج اور اس میں رہنے والے تمام طبقات بدامنی اور تخریب کاری کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ لہٰذا وطن عزیز کی موجودہ جو تصویر ہے اس میں بھی ایک خاص کمیونٹی کے دین اور ان کی تاریخ و تہذیب کو مخدوش و مجروح کرنے کی مذموم سعی کی جارہی ہے، جو نہ صرف افسوسناک ہے بلکہ قابل مذمت بھی ہے بنابریں رواں حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک دوسرے کے مذہب اور اس کے ایمان و عقیدے کا احترام کریں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اکابر و اسلاف کے ایسے خیالات و افکار کو فروغ دیں جن سے سماج میں یک جہتی اور مرکزیت کی فضا ہموار ہو سکے۔ اب ذرا تصور کیجیے کہ مولانا گیلانی نے ادیان و مذاہب کا مطالعہ جس امانت و دیانت اور رواداری سے کیا ہے اس کی اہمیت کس قدر بڑھ جاتی ہے۔

ہندوؤں کا دینی و عائلی نظام
سید امیر علی کے افکار کے تناظر میں

سید امیر علی (۱۸۴۹ء-۱۹۲۸ء) ہندوستان کی ان عبقری شخصیات میں شامل ہیں جنھوں نے اسلام کا مطالعہ علمی اور تحقیقی بنیادوں کو مدنظر رکھ کر کیا ہے۔ انھوں نے اس حوالے سے کئی نادر اور اہم کتابیں بھی تصنیف کیں ہیں جن کی فہرست اس طرح ہے۔

A Critical Examination of The Life and Teaching of Mohammad.

یہ کتاب ۱۸۷۲ء میں لندن سے شائع ہوئی ہے، اس کا اردو ترجمہ بھی موجود ہے۔

A Short History of Saracens

یہ کتاب ۱۸۸۹ء میں لندن سے شائع ہوئی۔

The Ethics of Islam

اس کی اشاعت ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔

The Legal profession women in Islam

یہ کتاب 1912 میں شائع ہوئی۔

Muhammadan Law

یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ سید امیر علی کی ایک بہت اہم کتاب، 'The Sprit of Islam' کے نام سے معروف ہے۔ یہ ۱۸۹۱ء میں لندن سے شائع ہوئی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ 'روح اسلام' کے نام سے محمد ہادی حسین نے کیا ہے۔

اس مضمون میں سید امیر علی کے مطالعۂ ادیان پر گفتگو کی جائے گی۔ سید امیر علی نے باقاعدہ مطالعۂ ادیان پر کوئی کتاب نہیں لکھی، البتہ ان کی کتابوں میں جابجا تقابل ادیان پر مباحث ملتے ہیں خصوصاً انھوں نے اپنی کتاب 'The Sprit of Islam' میں یہودیت، عیسائیت، ہندومت اور زرتشت وغیرہ کا تقابل، تعلیمات اسلام سے کیا ہے۔ سید امیر علی کے مطالعۂ ادیان پر نظر ڈالنے سے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے اسلام کے ساتھ ساتھ دیگر ادیان کا بھی مطالعہ بڑی گیرائی اور گہرائی سے کیا ہے۔ نیز ان کی نگاہ دیگر ادیان کے مصادر و مراجع پر بھی بڑی گہری ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب 'روح اسلام' کے پیش لفظ میں سامی اور غیر سامی ادیان پر بڑی وقیع گفتگو کی ہے۔

ہندومت میں مظاہر اور اجداد پرستی

یہ ایک مسلمہ صداقت ہے کہ ہندوستان کا قدیم مذہب ''ہندو'' ہے۔ اس کی سرزمین ہند میں آمد کیسے ہوئی اور اس کے نشو ونما کے کیا اسباب وقوع پذیر ہوئے، اس پر سید امیر علی اپنی متداول کتاب 'روح اسلام' میں رقم طراز ہیں:

> ''ہندوستان میں آریائی فتوحات کا سیلاب صدیوں تک مشرق اور جنوب کی طرف بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ آریائی مذہب جو حملہ آور اپنے قدیم وطن سے اپنے ساتھ لائے تھے زیادہ تر دو چیزوں پر مشتمل تھا یعنی اجداد و ارواح کی پرستش اور مرئی مظاہر میں مجسم قوائے فطری کی پرستش، پنجاب میں روحانی تصور نے مزید نشو ونما پائی۔ ویدوں میں ہمیں ترقی کا کارواں آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے تا آنکہ ہم اپنشدوں میں ہندوؤں کے مذہبی خیالات کو اپنے اوج کمال پر پہنچا ہوا دیکھتے ہیں۔ اپنشدوں میں روحانی ولولہ اس شدت سے ہے کہ وہ بلند ترین وحدانیت کے قریب جا پہنچتا ہے۔ اپنشد نہ صرف خدا کے نفوذ مطلق سے بحث کرتے ہیں جو ایک ایسا تصور ہے جس نے بعد کے زمانوں میں مادی وحدت الوجود کی محافظ اور ساری کائنات کی حاکم ہے، وہ انسانوں

کے دلوں میں رہتی ہے اور آخر الامر انفرادی روحوں کو لامتناہیت میں جذب کر لیتی ہے جیسے سمندر دریاؤں کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ جب یہ انجذاب ہو جاتا ہے تو انسانی روح پر کالبدخاکی میں جو تجربات گزرے ہوتے ہیں وہ ان سب کا شعور کھو دیتی ہے لیکن انسانی ترقی کی ان دلچسپ دستاویزوں میں بلا شک وشبہ روحانی اقدار کے جراثیم موجود تھے۔ جنھوں نے بہت جلد ارتقا کے عمل کا رخ پلٹا دیا، چنانچہ مزید عروج کی بجائے ہمیں مسلسل تنزل دکھائی دیتا ہے۔ اپنشدوں کا مقام، پران حاصل کر لیتے ہیں اور پھر تنتروں کا طریق پرستش پرانوں کو اس مقام سے ہٹا دیتا ہے'' [1]

سید امیر علی کا کہنا یہ ہے کہ ہندوستان میں آریوں کے ذریعے جو مذہب نمودار ہوا اس میں آباؤ اجداد کی پرستش اور فطری مظاہر کی پوجا کا تصور غالب نظر آتا ہے، یعنی آریوں میں جو نظریہ اور عقیدہ تھا وہ توحید کا نہیں تھا بلکہ وہ شرک کا عقیدہ رکھتے تھے۔ جب یہ سلسلہ مزید فروغ پایا تو اس میں وحدت الوجود جیسا تصور پایا جانے لگا۔ لیکن سید امیر علی یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندوؤں کی مذہبی گرنتھوں یعنی اپنشدوں میں ایسی بحثیں بھی ملتی ہیں جن سے وحدانیت کا نظریہ ثابت ہوتا ہے۔ اس وجہ سے سید امیر علی مزید تحریر کرتے ہیں:

''اپنشدوں میں جو خیال بار بار دہرایا گیا ہے کہ ''پرماتما'' مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، اسی سے اوتار کا تصور پیدا ہوا، جس طرح مغربی غیر اہل کتاب کا فلسفہ کائنات عامہ کی زبردست خواہش کی تسکین نہ کر سکا اسے ایک ایسا شخصی خدا مل جائے جو انسانوں میں رہ چکا ہو اور ان کے ساتھ آئے دن میل جول رکھ چکا ہو، اسی طرح اپنشدوں کے موحدانہ ولولے ہندوستان کے عوام کو جذباتی تشفی بہم نہ پہنچا سکے، چنانچہ انھوں نے بہت جلد کشتری جاتی سے ایک دیوتا ڈھونڈ نکالا جس کے متعلق تھوڑی

[1] سید امیر علی، The Sprit of Islam (روح اسلام) ترجمہ محمد ہادی حسین، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۹۹ء، ج ۱، ص ۱۱-۱۲

مدت کے بعد یہ عقیدہ رائج ہو گیا کہ وہ بنفسہ ''پرماتما'' تھا اور پرمیشور کا اوتار بن کر اسی سنسار میں زندگی بسر کرنے آیا تھا'' [1]

اس کے بعد رقم طراز ہیں:

''کرشن بھگتی کو اپنی حریف کالی پوجا کی طرح جو عام مقبولیت حاصل ہوئی وہ نہ صرف اس امر کی پرزور شہادت دیتی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان کیسی مذہبی ابتری میں مبتلا تھا، بلکہ اس وسیع چیلنج کو بھی نمایاں کرتی ہے جو اپنشدوں اور بھگوت گیتا کے لکھنے والے فلسفیوں کے ذہنوں اور عوام کے خیالات و جذبات کے درمیان حائل تھی۔ یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ اس علاقے میں داخل ہونے سے پہلے جسے صحیح معنوں میں ہندوستان یا آریہ ورت کہا جاتا ہے، ان آریوں نے جو پنجاب میں آئے تھے یا ان کے پروہتوں اور مذہبی معلموں نے بہت سخت قاعدے وضع کیے تھے جن کا مقصد یہ تھا کہ آریوں کے اپنے طول طویل فاتحانہ کرچ کے دوران جن قوموں کو مطیع و متضاد بنایا تھا ان میں خلط ملط نہ ہو جائیں، ان قوموں کو سماج کے اسفل ترین طبقے میں جگہ دی گئی ان کو اچھوت قرار دیا گیا اور جو مذہبی رسومات اونچی ذاتوں کے لیے مقرر تھی وہ ان کے لیے سختی سے ممنوع کر دی گئیں'' [2]

سید امیر علی کے درج بالا افکار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں طبقاتی اور معاشرتی تقسیم یا بھید بھاؤ کا نظام بہت پرانا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے یہاں مذہبی اور دینی امور میں بھی پوری طرح اونچ نیچ کا رویہ موجود ہے اگر ہندوستانی معاشرے میں اب اس طرح کا کردار دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ آج بھی اس طرح کا تصور موجود ہے اور صرف موجود ہی نہیں ہے بلکہ اس کے اثرات بھی گاہ بگاہ دیکھنے کو ملتے رہتے ہیں سید امیر علی نے ہندوؤں کی مذہبی گرنتھوں اور ان کے سماج کا بڑا تفصیل سے اور گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔

---

[1] سید امیر علی، The Sprit of Islam (روح اسلام) ترجمہ محمد ہادی حسین، ص ۱۲

[2] ایضاً، ص: ۱۲-۱۳

ہندوؤں کا طبقاتی نظام

ہندوؤں کے معاشرتی اور سماجی نظام کے حوالے سے جو تفریق اور اونچ نیچ ملتی ہے وہ کسی کی نظروں سے مخفی نہیں ہے اگر ہندوؤں کے سماجی نظام کی تفصیل کا مطالعہ کرنا ہے تو دیکھئے ''منو دھرم شاستر'' جو ان کی فقہی کتاب ہے۔ ان کے یہاں ذات پات کی تقسیم کے لیے درج ذیل تصور ہے۔ برہمن، کھشتری، ویش، شودر پھر ان کی الگ الگ ذمہ داریاں ہیں اسی طرح زندگی گزارنے کے بھی چار ادوار پائے جاتے ہیں۔ جنہیں لائف آف اسٹیج کہا جاتا ہے یعنی ان کے نام اس طرح ہیں۔ برہم چاریہ آشرم، گرہ آشرم، بان پرستھ آشرم، سنیاس آشرم۔ ان چاروں کے الگ الگ مراحل ہیں۔ ہاں یہ بات قطعی ہے کہ ہندوازم میں طبقاتی وسماجی نظام کے متعلق جو تفصیلات ان کے مذہبی مصادر میں ملتی ہیں وہ سماج کو دولخت کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کی ہلکی سی جھلک سید امیر علی نے اپنی کتاب 'روح اسلام' میں پیش کی ہے:

> ''وحدت الوجود کے موضوع پر آریائی ہندو فکر میں جو مد و جزر آئے ہیں ان سب کے دوران ارواح اسلاف کی پرستش، مذہبی ومعاشرتی نظام کا ایک لازمی جزو بن کر ہندوؤں کے ذہنوں میں جمی رہی ہے، یوں تو شودروں کو بھی اجازت تھی کہ اپنے آباؤ اجداد کی ارواح پر چڑھاوے چڑھائیں، لیکن اگر کوئی برہمن ان کی پوجا میں شریک ہوتا تو اسے بڑی سنگین سزا دیجاتی۔ اگر کوئی شودر اتفاقاً کسی برہمن کو منتر پڑھتے ہوئے پاتا تو اس کے لیے یہ سزا مقرر تھی کہ اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے۔ اگر وہ کسی برہمن کے برابر چوکی پر بیٹھ جاتا تو اس کے بدن کو گرم لوہے سے داغ دیا جاتا۔ شودروں اور تین اونچی جاتیوں کے لوگوں کی آپس میں شادیاں انتہائی بے رحمانہ سزاؤں کی مستوجب اور قطعاً ممنوع تھیں۔ لیکن اس قسم کی قانونی پابندیاں بھی آریوں کے مذہبی افکار وعبادات کو اصلی باشندوں کے عقائد کا اثر قبول کرنے سے نہ روک سکیں۔ مرور زمانہ کے ساتھ غیر آریہ قوموں اور قبیلوں کے دیوتا ہندوؤں کی دیومالا میں

داخل ہو گئے اور ان کی پوجا ہندوؤں کی آئے دن کی ریتوں میں شامل ہو گئی۔ بھانت بھانت کے پختہ اور خام، نئے اور پرانے عقیدوں کے گڈمڈ ہو جانے کا نتیجہ ناگزیر طور پر یہ ہوا کہ فلاسفہ صدیوں سے جس پیچیدہ اور رفیقِ وحدت الوجود نظام کے ارتقاء میں مصروف تھے اس میں ابتذال آ گیا''۔[1]

سید امیر علی نے درج بالا اقتباس میں ہندوازم کے طبقاتی نظام اور معاشرتی نظام پر بڑی بنیادی باتیں کہی ہیں۔ جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ہندوؤں میں طبقاتی نظام کا جو تصور ہے وہ زندگی کے ہر شعبہ میں دکھائی دیتا ہے، خواہ وہ سماج کا مسئلہ ہو یا پھر سیاست و مذہب کا، جنسی اور معاشرتی تفریق کا اثر ضرور دیکھنے کو مل جائے گا۔

ہندوؤں کا تصور عبادت

سید امیر علی نے متذکرہ کتاب کے دوسرے حصے کے دوسرے باب کا عنوان 'اسلام کی مذہبی روح' رقم کیا ہے اس میں انھوں نے تمام ادیان کا نظام عبادت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ہندوازم میں عبادت کا جو تصور پایا جاتا ہے اس کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ہندوؤں کی ابتدائی پوجا دو قسم کی کاروائیوں پر مشتمل تھی۔ یعنی ایک تو نذر و نیاز اور قربانی اور دوسرے دعاؤ واستمداد۔ فکر مذہبی کی طفولیت میں دیوتاؤں کے بارے میں یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ان میں وہی شہوات و جذبات ہوتے ہیں جو انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر ایک طرف انسان مادی منفعتوں کا محتاج ہوتا ہے تو دوسری طرف دیوتاؤں کو رضا جویانہ صدقوں اور چڑھاوؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس عقیدہ کا اظہار بار بار رگ وید کے حمدیہ ترانوں اور بھجنوں میں کیا گیا ہے۔ جب مذہبی تصورات کی نشو ونما ہوئی تو قیاس غالب ہے کہ کم از کم نسبتاً ترقی یافتہ اور صاحب فکر کو لوگوں کے نزدیک نذر و نیاز اور قربانیوں کے مفہوم میں بڑی حد تک ترمیم ہوئی ہوگی۔ لیکن جیسے پروہتوں کا

[1] سید امیر علی، The Sprit of Islam (روح اسلام) ترجمہ محمد ہادی حسین، ص ۱۳

فرقہ جو اس کا مدعی تھا کہ اس میں مخفی اوصاف ہیں جو صرف وراثتاً منتقل ہو سکتے ہیں عوام الناس کے دلوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتا چلا گیا ، ویسے ویسے برہمنیت ایک ایسے مسلک کی معین شکل اختیار کرتی گئی، جس کا بنیادی رکن قربانی تھا، قربانی کے مجاز صرف پنڈت تھے اور اس کے لیے نہایت سخت اور نا قابل تبدیل قاعدے مقرر کیے گئے تھے۔ ادھر پنڈت منتر پڑھ تا جاتا تھا اور کسی قسم کے جذبے کے بغیر لگے بندھے طریقے سے مقررہ رسوم ادا کرتا چلا جاتا تھا اور ادھر تپسیا کرنے والا ایک بے حس وحرکت کی طرح پاس کھڑا یا بیٹھا اس پوجا کا تماشا دیکھتا رہتا تھا، جو اس کی طرف سے ایک اور شخص ادا کر رہا تھا۔ اگر کہیں پوجا پاٹ کے منتروں یا ریتوں میں ذرا سی بھی بھول چوک ہو گئی تو ساری پوجا بیکار ہو جاتی تھی۔ بہر حال قیاس چاہتا ہے کہ مذہبی عقیدت سرے سے ناپید نہ تھی، ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ بھگوت گیتا وجود میں آتی۔ حقیقت جو کچھ بھی ہو عوام الناس کے لیے عبادت محض چڑھاووں اور بلدانوں کا ایک گورکھ دھندہ تھی، جس کا انحصار اتنا عبادت کرنے والے کے انفرادی، اخلاقی کردار پر نہ تھا جتنا پنڈت کے گیان دانی تھا۔ عبادت کرنے والے کے لیے صرف اتنا ضروری تھا کہ ریتوں اور نیموں پر اعتماد رکھے اور دھرم کے نقطہ نگاہ سے پاک ہو''۔[1]

سید امیر علی کی تحقیق کے مطابق ہندوؤں میں عبادت اور قرب خداوندی کا طریقہ دو چیزوں پر مشتمل ہے، ایک دعا و استمداد اور نیاز و قربانی، لیکن ہندوازم کی مذہبی کتابوں میں ان کے علاوہ بھی عبادت کے طریقے پائے جاتے ہیں۔

دیگر ادیان میں عبادت کا تصور

سید امیر علی نے ہندوؤں کے نظام عبادت اور طریقہ عبادت کے علاوہ دیگر ادیان کے

---

[1] سید امیر علی، The Sprit of Islam (روح اسلام) ترجمہ محمد ہادی حسین، ج ۲، ص ۲۷۲-۲۷۳

حوالے سے بھی گفتگو کی ہے۔ چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:

''مجوس زرتشتی اور صابی عبادت گزاری کی فضا میں زندگی گزارتے تھے۔ زرتشتی چھینک آنے پر، ناخن یا بال کٹواتے وقت، کھانا پکاتے وقت، چراغ جلاتے وقت، غرض دن رات کے ہر موقع پر کوئی نہ کوئی وظیفہ پڑھا کرتے تھے، پہلے تو ہرمزد سے مناجات کی جاتی تھی، اس کے بعد آسمان، زمین، عناصر اربعہ، ستارے بلکہ درخت اور چرند پرند بھی دعاؤں کے مخاطب بنائے جاتے تھے، بعض بعض وظیفے تو ایسے تھے کہ ان کا ورد بارہ بارہ سو مرتبہ کرنا پڑتا تھا، اخلاق کا خیال چاہے گنتی کے چند لوگوں کے یہاں کتنا ہی منزہ کیوں نہ ہو، عوام الناس کے ذہنوں سے بالکل خارج ہوگیا ہوگا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ غیر معمولی نفوس کو بھی جو روحانی زندگی نصیب تھی وہ بھی مذہبی پیشواؤں کی بلا شرکت غیرے ملکیت تھی۔ خصوصی تقدس کی جو دیوار مذہبی منصب داروں کو عوام سے جدا کرتی تھی اس کی بدولت موخر الذکر اعلی درجے کی تمام روحانی تمتعات سے محروم رہ جاتے تھے''۔[1]

مجوسیوں کی عبادت کے حوالے سے سید امیر علی مزید تحریر کرتے ہیں:

''مجوسیوں کے یہاں عبادت کے دو طریقے تھے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ معبود ہستیوں کے فہم کے دو طریقے تھے، ایک مخفی جو مذہبی منصب داروں کے لیے مخصوص تھا، دوسرا عوامی جس میں عوام الناس بھی شریک ہو سکتے تھے''۔[2]

اسی طرح عیسائیت اور یہودیت کے حوالے سے لکھا ہے:

''قانون موسوی میں دعا کے معاملے میں کوئی احکام نہ تھے۔ اگر مناجات اور حمد وثنا کے کوئی قاعدے مقرر تھے تو صرف مذہبی منصب داروں کو کمائی کا ایک عشر دینے کے بارے میں اور پہلوٹھی کے بچے کی پیش گزاری کے متعلق جو باضابطہ

---

[1] سید امیر علی، The Sprit of Islam (روح اسلام) ترجمہ محمد ہادی حسین، ج ۲، ص ۲۷۳-۲۷۴

[2] ایضاً، ص: ۲۷۴

اور مقطع خانگی رسوم مقرر تھیں ان کے بارے میں، موخر کو موقع پر باپ اپنے بچے کو قانون کے احکام کے مطابق پیش کرنے کے اجر کے طور پر یہود سے بنی اسرائیل کے حق میں اس رحمت و برکت کا طالب ہوتا تھا جس کا عہد یہود نے انکے آباؤ اجداد سے کیا تھا۔ لیکن جب رفتہ رفتہ عوام اور معلمین دونوں کے ذہنوں میں خدا کا نسبتاً زیادہ روحانی تصور پیدا ہو گیا اور جسمانی تشبہت کی شدت میں کمی آ گئی تو لوگوں کی سمجھ میں آنے لگا کہ عبادت فی الحقیقت خدا اور انسان کے درمیانی راہ ورسم کا ایک طریقہ ہے۔ قانون موسوی میں عبادت سے قواعد وضوابط کی جو کمی تھی وہ روایت اور رواج نے پوری کر دی۔ چنانچہ ڈولنگر کے قول کے مطابق یہودی ایک عبادت گزار قوم بن گئے۔ روزانہ تین گھنٹے (یعنی نواں، بارہواں اور تیسرا گھنٹہ) مذہبی اوراد واعمال کے لیے وقف تھے، لیکن ایک طرف تو پروہتوں کی ضرورت اور دوسری طرف شارع کی کسی مثبت مثال کی غیر موجودگی، ان دونوں نے یکجا ہو کر عبادت کو لوگوں کی اکثریت کو محض ایک میکانکی عمل بنا دیا، حضرت عیسی کے عہد میں یہودیوں کے یہاں چمڑے کے جزدان رکھنے کا طریقہ تھا جن میں تورات اور زبور کی عبارتیں کاغذ کے پرزوں پر نقل کر کے رکھی جاتی تھیں اور جنہیں یہودی عبادت کے وقت ماتھے اور بائیں بازو پر باندھ لیا کرتے تھے۔ ان جزدانوں کی خرید وفروخت کی جاتی تھی۔ چنانچہ قرآن یہودیوں کو خدا کی آیات بیچنے پر سخت الفاظ میں لعنت کرتا ہے''۔[1]

عیسائیت کے متعلق لکھا ہے:

''حضرت عیسی کی تعلیمات سے، جو انسان مذہبی نشو ونما کے بعد کے مرحلے کی نمائندگی کرتی ہیں، عبادت کا صحیح مفہوم پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے ذاتی مثال قائم کر کے عبادت اور شکر گزاری پر بہت زور دیا، لیکن عوام کی خدمت کے لیے

[1] سید امیر علی، The Sprit of Islam (روح اسلام) ترجمہ محمد ہادی حسین، ج ۲، ص ۲۷۴-۲۷۵

کسی متعین قاعدے کے نہ ہونے کے معنی یہ تھے کہ مذہبی اعمال و وظائف کے معاملے میں بالکل آزاد چھوڑ دیے گیے۔ چنانچہ وہ پادریوں کے تابع فرمان ہو گئے جنھوں نے عبادت کی تعداد طول اور اصطلاحات کے تقرر کو اپنا اجارہ مخصوص بنا رکھا تھا، مقررہ دعاؤں کے مجموعے، رسوم عبادت کے ضابطے اور عقائد و ایمانیات کی تعیین کی خاطر متعدد کلیسائی کونسلیں اور مجالس مذاکرہ، یہ سب اسی صورتحال کا نتیجہ تھے، اسی کے مظہر ہیں وہ وظیفے جنہیں راہب ایک بھنبھناتی آواز میں اور ایک میکانکی طور پر پڑھا کرتے تھے''۔[1]

متذکرہ سطور سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ہندومت، زرتشتیت صابیت اور اسی طرح عیسائیت اور یہودیت میں مناجات و دعا اور عبادت وظائف کا تصور موجود ہے۔ گرچہ اس کی شکلیں جدا ہیں۔ لیکن نقطہ اتحاد و اشتراک کا پہلو اسلام اور دیگر ادیان میں پایا جاتا ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ اسلام نے جو نظام عبادت اور دعا و مناجات کا متعین کیا ہے وہ متذکرہ بالا اصول سے بالکل الگ تھلگ ہو، البتہ نفس مسئلہ میں تمام ادیان میں اشتراک موجود ہے۔

تعدد ازواج اور ادیان و مذاہب:

تعدد ازواج کا تصور دنیا کی تقریبا تمام اقوام و ملل اور تہذیبوں میں پایا جاتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ صرف اسلام کے نظریہ تعدد ازواج پر ہی کیوں اعتراض کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سید امیر علی نے اپنی کتاب 'روح اسلام' میں اس بابت بڑی عمدہ اور علمی گفتگو کی ہے:

''پرانے وقتوں کی تمام مشرقی اقوام کے یہاں تعدد ازدواج ایک مانا ہوا ادارہ تھا۔ چونکہ بادشاہ جو صفت الہیت سے متصف سمجھے جاتے تھے، اس پر عمل کرتے تھے، لہٰذا یہ رواج عام لوگوں کی نظروں میں مقدس ہو گیا۔ ہندوؤں کے یہاں تعدد ازدواج چند زنی اور چند شوئی دونوں صورتوں میں قدیم ترین زمانوں سے رائج تھا، معلوم ہوتا ہے کہ قدیم بابلیوں، اسوریوں اور ایرانیوں کی

[1] سید امیر علی، The Sprit of Islam (روح اسلام) ترجمہ محمد ہادی حسین، ج ۲، ص ۲۷۵

طرح ہندوؤں میں بھی ایک مرد بہ یک وقت لاتعداد عورتوں کا شوہر ہوسکتا تھا، اونچی ذات کے برہمن کو آج کل کے زمانے میں بھی جتنی بیویاں وہ چاہے اتنی بیویوں کی اجازت ہے۔ حضرت موسیٰ کے وقت سے پہلے بنی اسرائیل کے یہاں بھی تعدد ازواج کا دستور تھا۔ حضرت موسیٰ نے اسے قائم رہنے دیا یہاں تک کہ انھوں نے اس کی کوئی بھی حد مقرر نہ کی کہ ایک یہودی مرد بیک وقت کتنی عورتوں کو اپنے نکاح میں رکھ سکتا تھا، بعد کے زمانے میں تلمود یروشلم نے یہ پابندی عائد کی کہ ایک مرد صرف اتنی عورت کو اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے جتنی عورتوں کو نان ونفقہ مہیا کرنے کی استطاعت ہو، اگر چہ ربیوں کی یہ تعداد تھی کہ کسی مرد کے چار سے زیادہ بیویاں نہیں ہونی چاہئیں تھیں۔

تھریس لیڈیا اور پیلاسگیا کی قوموں کے یہاں جو یورپ اور مغربی ایشیا کے مختلف حصوں میں آباد تھیں، تعدد ازواج حد اعتدال سے اس قدر متجاوز ہوگیا تھا کہ کوئی دوسری قوم اس امر میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔

اہل ایتھنز کے یہاں جو ازمنۂ قدیم کی تمام قوموں سے زیادہ مہذب اور شائستہ تھے، بیوی محض ایک اثاثہ تھی جو خرید وفروخت کیا جاسکتا تھا، وصیتاً منتقل بھی کیا جاسکتا تھا، سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک بری چیز سمجھی جاتی تھی، جو محض گھر بار چلانے اور بچے جننے کے لیے ضروری تھی۔ ایتھنز کے شہریوں کو بے حد وحساب بیویوں کی اجازت تھی۔ چنانچہ دیموسیتھنز فخریہ بیان کرتا ہے کہ اس کی قوم میں تین طبقہ تھے، جن میں سے دو طبقے نکاحی بیاہی اور نیم نکاحی بیاہی عورتیں مہیا کرتے تھے۔

اہل سپارٹا کے یہاں مردوں کو خاص حالات کے سوا ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہ تھی لیکن عورتوں کو بہ یک وقت متعدد شوہروں کی اجازت تھی اور اس سے تقریباً ہمیشہ فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔

جن مخصوص حالات میں رومی مملکت قائم ہوئی انھوں نے غالباً اس امر کی

اجازت نہ دی کی شروع شروع میں تعدد ازواج کو قانون جائز قرار دیا جائے۔
سابی عورتوں کے استحصال بالجبر کے قصے کی تاریخی چاہے کچھ بھی ہو، اس قصے کا موجود ہونا ہی ان اسباب کا شاہد ہے جن کی بنا پر رومیوں نے شادی سے متعلق اپنے غیر مہذب قوانین وضع کیے۔ آس پاس مملکتوں اور بالخصوص ایٹر سکنوں کے یہاں تعدد ازواج ایک رواج تھا جس کے ساتھ چند رعایات وابستہ تھیں، رومیوں کو اٹلی کی دوسری قوموں سے جو سابقہ پڑا اور جن جنگوں اور فتوحات میں وہ دو صدیوں تک مشغول رہے انھوں نے اعیش وعشرت کی ان عادتوں سے مل کر جو کامیابی اور خوشحالی پیدا کی تھیں۔ بالآخر رومیوں کی یہاں شادی کے تقدس کو محض کہاوت بنا دیا۔ تعدد ازواج قانونا تو جائز نہ تھا لیکن پیوتک جنگوں میں ظفر مندی کے بعد روم کی خواتین دلوں میں ایک آواز اور خوشحال مملکت کی منفعتوں سے تمتع اندوز ہونے کی امنگیں پیدا ہوئیں اور ان کی امنگیں ان کے خاوندوں اور عاشقوں کی نفس پرستیوں نے پوری کر دیں۔ قوانین مملکت کی تائید حاصل کر کے داشتہ بازی ایک ایسا ادارہ بن گئی جو مراعات خاص کا مستحق تھا، عورتوں کی کھلم کھلا آزادی، مردوں کے ساتھ ان کا ڈھیلا ڈھالا رشتہ، بیویوں کے کثیر الوقوع تبادلے، سب چیزیں تعدد ازواج پر دلالت کرتی ہیں البتہ انہیں یہ نام نہیں دیا گیا۔ دریں اثنا جس ابتدائی عیسائیت کی تبلیغ گلیلی کے ساحل پر ہوئی تھی اس نے ساری دنیا کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ اسینیوں کے اثرات نے جن کا واضح ثبوت عیسی کی تعلیمات میں ملتا ہے ان کی اس قومی امید سے مل کر آسمان کی بادشاہی قائم ہونے والی تھی، انہیں اس پر آمادہ کیا کہ ازدواجی زندگی کو مذموم قرار دیں، اگرچہ انھوں نے کبھی اسے صراحتاً منع نہیں کیا''۔[1]

دنیا کی اقوام اور ادیان و مذاہب نیز ان کی وضع کردہ قوانین میں عورت کی جو سماجی اور

[1] سید امیر علی، The Sprit of Islam (روح اسلام) ترجمہ محمد ہادی حسین، ج ۲، ص ۳۵۸-۳۶۱

مذہبی حیثیت تھی وہ نہایت خستہ تھی جس کو سید امیر علی اپنی کتاب 'روح اسلام' میں واضح کیا ہے۔ آج جو لوگ اسلام کے نظام تعدد ازواج پر اعتراض کرتے ہیں ان کو اقوام عالم کی تاریخ کا مطالعہ انصاف سے کرنے کی ضرورت ہے۔ البتہ اسلام میں خواتین کے متعلق اور ان کی عصمت وحرمت اور عفت و پاکدامنی کی بابت جو اصول وقوانین وضع کیے ہیں وہ خواتین کا مقام ومرتبہ اور ان کی قدر ومنزلت بڑھاتے ہیں۔

بالائی سطروں میں ہم نے دیکھا کہ سید امیر علی نے اسلام کے ساتھ ساتھ دنیا کی دیگر تہذیبوں اور ادیان و مذاہب کا مطالعہ بڑی گہرائی اور گیرائی سے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اس کتاب میں ہندو دھرم کے مقدس متون، عیسائیت اور یہودیت کے مذہبی مصادر کے حوالے جا بجا ملتے ہیں۔ اسی طرح زرتشت کی معروف کتاب 'اوستا' کے بھی حوالے موجود ہیں۔ یہ تمام شواہد وحقائق اس بات پر بین ثبوت ہیں کہ سید امیر علی نے دیگر مذاہب کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ دیگر ادیان کی تعلیمات کا اسلام کی تعلیمات سے نہایت ایمانداری اور صداقت سے موازنہ بھی کیا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سید امیر علی جہاں اسلامی اسکالر اور مفکر مدبر تھے وہیں مطالعہ ادیان کے ماہر بھی تھے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ سید امیر علی نے اپنی کتاب 'روح اسلام' اس وقت تصنیف کی جب ہندوستان میں انگریزوں کا دور دورہ تھا اور عیسائی پادری ہندوستان کے مختلف شہروں میں عیسائیت کو فروغ دے رہے تھے۔ ظاہر ہے ان کی نظر میں اس وقت وہی حالات تھے، اسی وجہ سے اس کتاب میں انھوں نے اسلام کا تقابل بطور خاص عیسائیت سے کیا ہے اور یہ پیغام دیا ہے کہ اسلام بقائے باہم رواداری کا دین ہے۔ ہاں ضمن میں انھوں نے عیسائیت کے علاوہ دیگر ادیان کا بھی ذکر کیا ہے لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ کتاب کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کا خیال رہے کہ یہ کتاب جس وقت تصنیف کی جا رہی تھی اس وقت ملک کا سماجی، سیاسی اور دینی منظر نامہ کیا تھا۔ یاد رہے کہ مصنف جب کوئی تحریر لکھتا ہے تو یقیناً اس وقت کے سماجی اور معاشرتی تقاضے اس کے دماغ میں ضرور ہوتے ہیں اور وہ تمام احوال کو مدنظر بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ سید امیر علی کی تصنیف 'روح اسلام' جہاں ہمیں اسلام کی تعلیمات اور روحانی نظام فلسفہ سے واقف کراتی ہے تو وہیں ہمیں اسلامی تہذیب وتمدن سے

آشنائی ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا کی دیگر تہذیبوں، ان کے سماجی نظام، مذہبی و دینی تصورات سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ سید امیر علی کا یہی وہ امتیازی کارنامہ ہے جو ان کی فکر اور نظریہ کو تقویت بخشتا ہے۔ مطالعۂ ادیان کے حوالے سے جو مباحث اس کتاب میں موجود ہیں وہ مدلل اور قابل اعتبار ہونے کے ساتھ ساتھ علمی اور فکری بھی ہیں۔ سید امیر علی نے جن جن ادیان کا تذکرہ کیا ہے ان میں کہیں بھی بے جا تنقید اور جانبداری کا پہلو نہیں ہے۔ مطالعۂ ادیان کا یہی وہ نمایاں وصف ہے جو تکثیری اور تنوع پسند معاشرے میں ہم آہنگی اور بین الاقوامی تعلقات کی جڑیں مستحکم کرتا ہے۔

ہندوؤں سے متعلق اہم مباحث
قاضی سلیمان منصور پوری کے مطالعہ کی روشنی میں

قاضی سلیمان منصور پوری (۱۸۶۷-۱۹۳۰ء) کی علمی وتحقیقی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے انھوں نے اسلامیات ودینیات کے متعدد گوشوں پر نہایت وقیع کتب تحریر کی ہیں۔ چند معروف کتب کے نام ذیل میں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ الجمال والکمال، رحمۃ اللعالمین، اصحاب بدر، مہر نبوت، سید البشر، کے علاوہ کئی کتب عیسائیوں کے رد میں بھی لکھیں۔ جیسے استقامت، خطبات سلیمان، تائید الاسلام، برہان، وغیرہ ان میں عیسائی پادریوں کے سوالات اوران کے مذہب کی معلومات پر سیر حاصل بحث موجود ہے۔ نیز مکاتیب سلیمان، مسیح علی الجوربین وغیرہ بھی آپ نے تحریر کی ہیں۔ گویا آپ ایک اچھے مفسر، تاریخ دان، ماہر سیرت اور بہترین مناظر تھے۔ آپ نے عیسائی پادریوں کے علاوہ قادیانیوں، اور آریا سماجیوں سے بھی مناظرے کیے ہیں۔ اسی وجہ سے قاضی سلیمان منصور پوری کو تقابل ادیان اور مطالعۂ ادیان میں کافی درک حاصل تھا ان کی کتب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے۔ مطالعۂ ادیان کے حوالے سے نہایت دلچسپ اور علمی موشگافیاں کی ہیں۔ رحمۃ للعالمین میں تو جا بجا کتب سماویہ سے استدلال بھی کیا ہے۔ سیرت کی یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کو تین جلدوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے اندر تقابل ادیان کے جن گوشوں پر گفتگو کی ہے ان مباحث کا اجمالی تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

رحمۃ للعالمین میں تقابل ادیان سے متعلق مباحث

مسیح سے دو ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش، حضرت ابراہیم کا

مصر جانا، ہاجرہ شہزادی مصر سے حضرت ابراہیم کا نکاح، توراۃ سے حضرت اسماعیل حضرت اسحاق کی مساوات کا ذکر (حاشیہ)، حضرت ابراہیم نے اپنے فرزندان اسماعیل واسحاق پر شام وعرب کو تقسیم کیا، حضرت اسماعیل کے بارہ بیٹے، حضرت یعقوب کے بارہ بیٹے جو چار ازواج سے تھے، فرزندان ابراہیم کا بحر ہند و بحر احمر پر قصی کا ذکر اور اس کی اصلاحات، قبل نبوت عرب کے مذاہب، حضرت ابراہیم قوموں کے باپ تھے، بی بی ہاجرہ کا تقرب الٰہی، سمت اور مسیحی تاریخوں میں تاریخی غلطیاں (حاشیہ) (اس کے ضمن میں قاضی صاحب نے ان غلطیوں کی نشاندھی کی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پیدائش کے متعلق عیسائیوں کے یہاں پائی جاتی ہیں) مکاشفات یوحنا کی تطبیق نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر (حاشیہ) اس عنوان کے تحت قاضی صاحب نے یوحنا کی کتاب مکاشفات سے جو بائبل کے آخر میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صادق وامین ہونا درج ہے، یہ بتایا ہے۔ کتاب یسعیاہ میں ہجرت کا ذکر (حاشیہ) کتاب تورات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی (حاشیہ)، بنی اسماعیل کی نبوت کے حوالے بائبل میں (حاشیہ)، حضرت مسیح کی شخصیت پر قرآن، یورپ کے مختلف فرقوں کا ذکر، رحمۃ للعالمین کی دوسری جلد میں انبیاء کرام علیہم السلام کے احوال کو بیان کیا گیا ہے البتہ اس میں کتاب مقدس سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اس ضمن میں قاضی صاحب نے ایک انتہائی اہم بحث کی ہے آیت قرآنی ولتعلموا عدد السنین والحساب کے تحت۔ مسلم اور دیگر اقوام کی سنین وتاریخ پر یہ ایک جامع بحث ہے۔ اس لیے اس جلد کے مباحث کو ترک کیا جاتا ہے تیسری جلد میں بھی کئی مباحث تقابل ادیان کے حوالے سے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ تقابل ادیان سے متعلق کچھ مباحث قاضی صاحب کی ذاتی ڈائری 'بیاض' میں ملتے ہیں۔

تقابل ادیان کے اسلوب وآداب

قاضی سلیمان منصور پوری نے تقابل ادیان پر جو کام کیا اس میں روادارانہ طرز اختیار کیا۔ اور انھوں نے درج ذیل نکات کا ہمیشہ خیال رکھا۔ چنانچہ اسحاق بھٹی نے اپنی کتاب 'قاضی سلیمان منصور پوری عہد، خاندان، اساتذہ ہم عصر علماء' میں لکھا ہے کہ:

''مکالمہ کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کا ان کی کتب معروفہ سے بہ غور مطالعہ کیا جائے۔ ان کے اسلوب اظہار اور ترجیح موضوعات کو سمجھ کر اس مذہب کے پیروکار سے تحریری یا تقریری خطاب کرتے ہوئے اسلام کی تفہیم کردی جائے، اس ایمان کے ساتھ کہ الہادی اللہ تعالیٰ ہے۔ تحریر یا تقریر کا ہر مخاطب اسی صورت میں استفادہ کرسکتا ہے کہ انداز تخاطب میں ایسی رواداری ہو کہ اس کا اور اس کے مذہب کے بزرگوں کا نام احترام سے لیا جائے، تنقید یا تضحیک نہ کی جائے۔ مخاطب کے ظرف کے مطابق دلائل دیئے جائیں۔ غالباً قاضی صاحب نے یہ تحریک مکالمہ بین المذاہب اس لیے اپنائی کہ قرآن و حدیث کا یہی تقاضا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

دوسرے مذاہب کے معبودکو برا نہ کہو۔

اگر اللہ تعالیٰ کا منشا ہوتا تو بنی نوعِ انسان ایک ہی دین پر ہوتے۔

ہر مذہب میں اس کے ماننے والوں کے لیے زینت ہے۔

ہر مذہب کی ایک شرع ہے اور اسی میں آزمائش ہے۔

کہو (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔ ہر امت کے لیے رسول، ہر قوم کے لیے ہادی اور ہر ہادی و رسول نے اپنی قوم سے اپنی قوم کی زبان میں خطاب کیا۔

احادیث مبارکہ میں بھی اس طرح کی ہدایات وتعلیمات ملتی ہیں کسی قوم کے شر سے بچنے کے لیے اس کی زبان سیکھو (زبان سیکھنے کے بعد ہی ان کے اعتقادات، عزائم اور اسلوب تبلیغ کا علم ہوگا)

حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے جہاں ملے اپنا لو۔

ایک حدیث میں پیشین گوئی کے ساتھ مسلمانوں کو حکم صادر ہوا، جو اہل ایران زرتشتی مذہب والوں سے متعلق ہے کہ جب ان پر غلبہ حاصل کرلو تو ان سے'' اہل کتاب'' کا سا سلوک کرنا''۔[1]

[1] قاضی سلیمان منصور پوری عہد، خاندان، اساتذہ ہم عصر علماء، ص ۲۸۴-۲۸۵

ان اصولوں اور اقدار کی رعایت قاضی صاحب نے مطالعۂ ادیان کے حوالے سے کی ہے۔ جارحانہ اور متشددانہ رویہ سے حتی المقدور پرہیز کیا ہے۔ یہی معتدل رویہ ان کی تالیفات میں جھلکتا ہے۔ اسحاق بھٹی نے اپنی مذکورہ کتاب میں مزید وضاحت اس طرح کی ہے۔ مکالمہ بین المذاہب اور تقابل ادیان میں قاضی صاحب نے یکساں سلوک اختیار کیا اس کی مثال آپ کی وہ تقاریر ہیں جو اب کتابی شکل میں 'سید البشر' کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں انھوں نے ہندو مت سکھ مت وغیرہ کے اعیان کا ذکر نہایت شستہ انداز میں کیا ہے۔[1]

قاضی سلیمان منصور پوری نے اپنی متعدد کتب میں ہندوؤں، یہودیوں، مجوسیوں، نصرانیوں، سکھوں، جینیوں اور بدھوں کے احوال، تہذیب وتمدن اور دینی و مذہبی اور سیاسی افکار کو پیش کیا ہے۔ البتہ غیر سامی ادیان کے متعلق باضابطہ ان کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ رحمۃ للعالمین، خطبات سلیمان، استقامت، برہان، مکاتیب سلیمان اور سید البشر میں کچھ چیزیں ملتی ہیں۔

اصول تبلیغ

قاضی سلیمان منصور پوری نے اپنی ایک اہم کتاب 'خطبات سلیمان' (جو دس خطبات کا مجموعہ ہے) میں لکھا ہے کہ تبلیغ کے دو اصول ہیں ''اول خود اس مذہب کے پاک نوشتوں میں تبلیغ کرنے کا حکم موجود ہو۔ دوم۔ خود اس مذہب کے ہادی اور داعی نے اس حکم کی تعمیل کر کے دکھائی ہو، اس اعتبار سے قاضی صاحب کی تحقیق کے مطابق صرف بودھست اور عیسائیت ایسے دو مذہب ہیں جن کا تبلیغی ہونا زیادہ ترگمان کیا جاتا ہے''۔[2]

آگے لکھا ہے کہ اگر بودھست کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے۔ اور مہاتما گوتم کے چھ خاص شاگردوں سے لے کر اس مت کے دور اقبال کو دیکھ لیا جائے تو پتہ لگ جائے گا کہ یہ مذہب کبھی ہندوستان سے باہر غیر زبان بولنے والوں یا کسی دوسرے مذہب مستقل رکھنے والوں کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ اس مذہب کو ہندوستانیوں کے سامنے پیش کیا گیا اور ہندوؤں ہی

---

[1] قاضی سلیمان منصور پوری عہد، خاندان، اساتذہ ہم عصر علماء، ص ۲۸۷

[2] خطبات سلیمان، صفحہ ۳

نے اسے قبول کیا اور بس۔ اسی وجہ سے بدھ ازم کے مصنفین کے اندر یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا ہے کہ بودھ ازم کوئی مذہب ہے یا خلاقی انجمن۔ آریہ سماج کا کہنا یہ ہے کہ مہاتما گوتم بھی ویدمت ہی کی حفاظت وحمایت کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے ممکن ہوا کہ خود بودھ ازم نے کسی مستقل مذہب ہونے کا نہ دعویٰ کیا اور نہ اس میں وہ شان پیدا ہوئی۔ برعکس جب ہم مہاتما گوتم بدھ کا یہ حکم پڑھتے ہیں کہ اس نے سنسکرت زبان کے پڑھنے کی ممانعت کردی تھی اور پالی زبان کو مقدس زبان قرار دیا تھا، تب آریہ سماجیوں کا دعویٰ بالکل کمزور ہو جاتا ہے۔[1]

قاضی سلیمان منصور پوری کی تحقیق یہی ہے۔ قاضی سلیمان منصور پوری نے مہاتما بدھ کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ:

> ''جب ہم مہاتما گوتم بدھ کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہاتھ میں کشکول لیے ہوئے چپ چاپ ایک دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور جب گھر والے اس کشکول میں کوئی خوردنی چیز ڈال دیتے ہیں تو وہ آہستگی کے ساتھ وہاں سے چل پڑتے ہیں تو بے اختیار کہا جا سکتا ہے کہ اس اصول پر دنیا نہیں چل سکتی اور اس نامور ہستی نے جو نمونہ اپنی زندگی کا دکھلایا ہے اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا لہٰذا نتیجہ صاف ہے کہ بودھ ازم دنیا کا تبلیغی مذہب نہیں ہوسکتا'' اسی وجہ سے بودھ ازم کے ایک فاضل نے اپنی کتاب بدھ میں تحریر کیا ہے کہ ''بودھ ازم کی ناکامی کا سبب خود اس کے اپنے اصول تھے''۔[2]

پتہ یہ چلا متبعین بودھ ازم کے ایک طبقہ کے نزدیک تو یہ دھرم تبلیغی ہے۔ لیکن خود متحملین بودھ کے ایک طبقہ کی رائے کے مطابق بودھ ازم تبلیغی دین نہیں ہے۔

مجوس کے حالات

قاضی سلیمان منصور پوری نے جہاں سامی اقوام وادیان کا تعارف اپنی قیمتی تحریروں

---

[1] خطبات سلیمان، ص:۴۰

[2] ایضاً، ص:۱۷

میں کرایا ہے وہیں انھوں نے غیر سامی ادیان پر بھی مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ چنانچہ وہ مجوس کے متعلق رقم طراز ہیں:

''ایران میں نہایت قدیم زمانے سے سلطنت قائم تھی، انھوں نے قریباً ایک ثلث کرہ ارض پر جو اس وقت آباد تھا، حکومت کی، حکومت سے امن، امن سے عیش وعشرت کا وجود پیدا ہوا۔ عیاشی نے دل ودماغ کو کمزور کر دیا اور ایوان سلطنت کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔ مانی کے مذہب نے آئین قدیم کو نیست ونابود کر دیا۔ مرد وزن کے طبائع میں شوریدگی وآوارگی پیدا کر دی۔ مزوک نے زن وزر وزمین پر سے ملکیت اٹھا دینے سے فحش وظلم اور طغیان وعصیان کا طوفان بپا کر دیا۔ صاحب تاج وتخت شہزادیاں اپنے افسران فوج کے جذبات حیوانی سے تختہ ہائے موت پر لٹائی گئیں۔ محرمات مدینہ کو محصنات بنائے جانے کے دلائل پسند کیے گئے۔ عصمت پاک دامنی کو ہر دو جنس کے لیے ناپاک قرار دیا گیا۔ فرہاد جیسے نمک حرام ملازم اپنے بادشاہ کے رقیب بن گئے اور شیرویہ جیسے ناخلف پسر نے ہوش بہیمیت میں باپ کا شکم چاک کر کے شیریں پر قبضہ کیا۔ سلطنت ہائے روما وایران کی عدالت قدیم اور آئے دن ایک سلطنت پر دوسری چڑھائی نے ملک کو بے چراغ بنا دیا تھا۔ اصل مذہب کا وجود باقی نہ رہا تھا۔ مقدس کتب سکندر کی تاخت وتاراج میں گم اور بے نشان ہو چکی تھیں۔ ان احوال پر قاضی صاحب کا تجزیہ یہ ہے کہ مجوس کی یہ حالت اسلام کی آغوش میں آنے سے قبل تھی۔ جب اسلام نے اس ملک کو اپنی حمایت میں لیا تھا تب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیمات نے اس وسیع ملک کے باشندوں کو جبر واستبداد اور فحش وظلم کے بند وزندان سے آزاد کیا''۔[1]

[1] رحمۃ للعالمین، ج ۳، صفحہ ۱۷

ہندو اقوام کے حالات

قاضی سلیمان منصور پوری اپنی معروف کتاب رحمۃ للعالمین میں ہندوؤں کے متعلق لکھتے ہیں:

''اہل اسلام نے دریائے انڈو یا سندھ کے شرق میں رہنے والوں کو انڈو یا ہندو تحریر کیا ہے۔ اس ملک اور قوم کی تاریخ قدیم بالکل تاریک تھی، تاہم ایسے آثار قوی پائے جاتے ہیں کہ اس ملک میں بھی کسی زمانہ میں علم کی ترقی ہو چکی ہے۔ ہندو قوم اور ملک و مذہب و علم کا زوال مہابھارت کی جنگ سے شروع ہوا ہے۔ یہ جنگ کم از کم ڈیڑھ ہزار سال قبل ہوئی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سارے ہندوستان میں کوئی ایک شخص ایسا نہ رہ گیا تھا۔ جو فریقین (کوروپانڈو) میں سے کسی ایک کا جانب دار نہ ہو۔ ہم اندازاً قیاس کرتے ہیں کہ اس وقت تک کی آبادی پانچ کروڑ تو ضرور ہوگی، مگر جنگ کا کیا نتیجہ ہوا کہ طرفین میں سے بارہ مرد زندہ رہ گئے تھے، فاتحین نے یہ حالت ہوش ربا دیکھی تو انھوں نے بھی جلد از جلد اپنی زندگیوں کا خاتمہ کر دیا۔

حضرت مسیح علیہ السلام چھ صدی پیشتر بدھ مذہب نے ظہور کیا۔ بودھ نے وہاں کی زبان کو اختیار کیا تھا اور سنسکرت پڑھنے پڑھانے کی ممانعت کر دی تھی۔ وید مت کی جگہ بودھ مت قائم ہو جانے سے قدیم مذہب کی کتابیں نیست و نابود ہو گئیں اور ان کے جاننے والے شنکراچارج نے ان لوگوں سے کچھ مناظرے کیے اور اپنی علمیت کا رنگ جمایا، مگر وہ ۳۳-۳۴ سال کی عمر میں مر گیا، اس کی مساعی کا نتیجہ صرف اتنا ہوا کہ سنسکرت کو پھر دربار میں جگہ مل گئی، مگر اس کے ساتھ ساتھ غلو اور استغراق نے بھی قدم جما لیے اور حقائق و واقعات پر استعارات کا پردہ پڑ گیا۔ قدیم کتابوں میں سے ایک کتاب مہابھارت پائی جاتی ہے، مگر وہ بھی یار لوگوں کے تصرفات سے محفوظ نہ رہی، بیس ہزار شلوک

اس کتاب میں جعلی طور پر شامل کر لیے گئے۔ بودھ مذہب کا زور راجہ اشوک کے عہد تک رہا۔ اس کے بعد بودھ ازم روبہ زوال ہوگیا۔ بودھ ازم کے اصول متمدن دنیا کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ بھکشوؤں (گداگروں) کی لاتعداد جماعت جو بودھ مت نے تیار کر دی تھی، وہی زیادہ تر اس کے زوال اور حدود ملک سے انتقال کا باعث بھی ہوئی۔ گو پران مت نے بھی اس کے نکالنے میں بہت بڑی جد و جہد کی تھی۔ بودھ مت کے بعد ملک کی حالت بد سے بدتر ہوگئی۔ فسق و فجور اور فواحش کا دور دورہ ہوگیا، چکرانت دام مارگی، سہسر بھگ دوشنان مکتی، شاکت، ننوارک آوک، ڈنڈی وغیرہ بیسیوں ایسے فرقے پیدا ہوگئے، جنھوں نے اخلاق و تہذیب کو جلا کر راکھ کر دیا۔ یہ فرقے تمام ہندوستان ہی میں چھائے ہوئے تھے۔ شراب، جوا، بدکاری کو مذہب کا لباس پہنا کر پوتر قرار دیا تھا۔ ہندوستان کی یہی بدترین حالت تھی''۔[1]

ان اقوام کی حالت بد تحریر کرنے کے بعد قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبانہ و ہمدردانہ و صادقانہ و بے غرضانہ، جود و رحم نے غار ہلاکت سے نکالا اور تمدن و حسن معاشرت و امن عامہ و عافیت کلیہ سے بہرہ اندوز فرمایا''۔[2]

پتہ یہ چلا قاضی سلیمان منصور پوری کی تحقیق کے مطابق ہندوؤں میں بے انتہاء اصرار و اغلال تھا۔ البتہ یہ سچ ہے کہ ہندو دھرم ایک قدیم ترین دین ہے۔ جن حقائق کا ذکر قاضی صاحب نے کیا ہے وہ اس معنی کر بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ ہندو اقوام میں آج جو مذہبی، دینی نظریہ پایا جاتا ہے وہ بہت حد تک اصل مذہب کی پیداوار نہیں ہے بلکہ ایجاد و اختراع کا سنگم معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] رحمۃ للعالمین، ج ۳، صفحہ ۶۹-۷۰

[2] ایضاً، ص: ۷۱

تعدد زوجات

قاضی سلیمان منصور پوری نے اپنی کتاب رحمۃ للعالمین اور خطبات سلیمان میں یہ بحث کی ہے کہ آج اسلام پر تعدد زوجات کا الزام عائد کیا جاتا ہے جب کہ ہم دیگر مذاہب کی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہاں بھی تعدد زوجات کا ثبوت مل تا ہے۔انھوں نے اس مسئلہ کو قانونی اور مذہبی دونوں اعتبار سے پیش کیا ہے۔قانونی حیثیت کا جائزہ پیش کرتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں:

> ''اس مسئلہ کا فیصلہ یورپ کے لیے اور طرح کرتا ہے اور ایشیا کے لیے اور طرح۔ ہندوستان کی تمام ہائی کورٹیں ایک سے زیادہ بیوی کی شخصیت کو قوانین دیوانی اور فوجداری میں صحیح تسلیم کرتی ہیں۔ یہ اعلی عدالتیں ان مقدمات میں جو جائداد کے متعلق ہیں۔ دو یا دو سے زیادہ بیویوں کے حقوق کو بمقابلہ ان کے شوہر کے ورثاء قانونی کے تسلیم کرتی ہے اور ڈگریاں جاری کرتی ہیں۔ یہ اعلی عدالتیں ہمیشہ مقدمات زیر دفعہ ۴۹۴ تعزیرات ہند میں ایسی عورت کو جو اپنے شوہر کی دوسری یا تیسری یا چوتھی بیوی تھی۔کسی دوسری جگہ شادی کر لینے سے مجرم قرار دیتی ہیں اور اس شخص کو بھی مجرم ٹھہراتی ہیں جو ایسی عورت کے ساتھ شادی کر لیتا ہے''۔[1]

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ تعدد ازواج کے متعلق قانونی اعتبار سے کوئی قباحت نہیں ہے۔آئیں ہند کے علاوہ بھی دیگر بین الاقوامی دساتیر میں بھی تعدد زوجات کی اجازت موجود ہے۔اس مسئلہ کا دوسرا گوشہ مذہب ہے آیا مذہبی اعتبار سے اسلام کے علاوہ دیگر ادیان کا کیا موقف ہے؟ قاضی سلیمان منصور پوری نے اس ضمن میں بڑی محققانہ گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ ہندو دھرم کے اعیان کے علاوہ بھی دیگر مذہبی پیشواؤں نے متعدد شادیاں کی ہیں۔

---

[1] رحمۃ للعالمین، ج ۲، صفحہ ۱۲۶

چنانچہ انھوں نے ہندو دھرم کی مقتدا شخصیات کے حوالے سے رقم کیا ہے:

''سری رام چندر جی کے اولاد مہاراجہ دسرت کی تین بیویاں تھیں۔ پٹ رانی

کوشلیا: والدہ رام چندر جی۔

رانی سمترا: والدہ لچھمن جی۔

رانی کیکئی: والدہ بھرت جی

راجا پانڈو کے جو مشہور پانڈوں کا جد اعلی ہے۔ دو بیویاں تھیں۔

کنتی: والدہ یدھشتر و بھیم سین وارجن۔

مادری: والدہ نکل و سہدیو

راجا شنتن کی دو بیویاں تھیں۔

گنگا: والدہ بھیکم

ستیہ وتی: والدہ چترانگد و بچھترا ایرج پسران شنتن۔

بچھترا ایرج کی دو بیویاں اور ایک لونڈی تھی۔

امیکا۔ دھرتراشٹ۔

امبالکا۔ والدہ پانڈو۔

لونڈی۔ والدہ بدر۔[1]

اسی طرح عیسائیت، یہودیت کے علاوہ دیگر ادیان کے پیشواؤں کے متعلق بھی تفصیلی گفتگو کی ہے کہ انھوں نے بھی متعدد شادیاں کی ہیں۔

ان حقائق سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ جو لوگ آج اسلام کے ازدواجی نظام پر انگشت نمائی کرتے ہیں انہیں پہلے اپنے رویوں اور تہذیبوں و مقتدا شخصیات کی زندگی کا مطالعہ کر لینا چاہئے۔ مگر افسوس کہ اسلام کے اس نظام پر متشدد دین مستشرقین کے علاوہ ہندوستان میں بھی گاہ بگاہ یہ بحث اٹھائی جاتی رہتی ہے کہ تعدد زوجات پر پابندی عائد کی جائے۔ یقیناً یہ نرے تعصب اور اسلام دشمنی کی علامت ہے۔ جب کہ تعدد زوجات کا تصور و نظریہ تقریباً دنیا کی تمام تہذیبوں

[1] دیکھئے تفصیل، رحمۃ للعالمین، ج ۲، صفحہ ۱۲۷-۱۳۱

اورادیان میں پایا جاتا ہے۔اس یک طرفہ سوچ سے بچنے کی ضرورت ہے۔

سنین وتواریخ

قاضی سلیمان منصور پوری نے 'رحمۃ للعالمین' میں ایک بحث نہایت علمی اور انوکھی یہ کی ہے کہ متعدد اقوام وادیان کا سن وتاریخ کے جدول پیش کیے ہیں۔اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان جدول کو سمجھنے کا طریقہ کار کیا ہے۔جن جدول کو پیش کیا ہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

سنہ ہجری: یہ خالص قمری ہے۔قمری ہجری سال ۳۵۴ دن کا ہوتا ہے۔

جولین پیریڈ: (دور جولیانی) سنہ جولین پیریڈ جو ۱۵۸۲ء۔مطابق ۹۹۰ھ میں وضع کیا گیا تھا۔اس میں سال کا پہلا مہینہ جنوری، مقدار سال ۳۶۵ دن ۲ گھنٹے۔

سنہ عبرانی: شروع سنہ کا پہلا دن۔دوشنبہ۔سال کا پہلا مہینہ قمری۔مقدار سال ۱۲-۱۳ مہینے۔

نوح یا سنہ طوفان: اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔شروع سنہ کا پہلا دن، پنجشنبہ، سال کا پہلا مہینہ توت، تعداد ایام سال، ۳۶۵

کل جگ: شروع سنہ کا پہلا دن، جمعہ، سال کا پہلا مہینہ بیساکھ، مقدار سال ۳۶۵ دن چھ گھنٹے بارہ منٹ۔

سنہ ابراہیمی: شروع سنہ کا پہلا دن یک شنبہ، سال کا پہلا مہینہ، اکتوبر، سال کی مقدار ۳۵۶ دن، چھ گھنٹے،

بخت نصری: شروع سنہ کا پہلا دن چہار شنبہ، شروع سال کا پہلا مہینہ توت، سال کی مقدار ۳۵۶ دن۔

سنہ سکندری: شروع سنہ کا پہلا دن دوشنبہ، سال کا پہلا مہینہ تشرین اول، مقدار سال ۳۵۶ دن چھ گھنٹے۔

بکرمی بروشٹھ: شروع سنہ کا پہلا دن شنبہ، سال کا پہلا مہینہ بیساکھ، مقدار سال ۳۶۵ دن چھ گھنٹے، بارہ منٹ۔

بکرمی قمری شمسی سال: شروع سنہ کا پہلا دن شنبہ، سال کا پہلا مہینہ چیت، مقدار سال ۱۲-۱۳ ماہ قمری۔

عیسوی قدیم: شروع سنہ کا پہلا دن شنبہ، سال کا پہلا مہینہ جنوری، مقدار سال ۳۵۶ دن، چھ گھنٹے۔

عیسوی جدید: شروع سنہ کا پہلا دن دوشنبہ، سال کا پہلا مہینہ جنوری، مقدار سال ۳۶۵ دن، ۵ گھنٹے چالیس منٹ، چھیالیس سکنڈ۔

قبطی جدید: شروع سنہ کا پہلا دن جمعہ، سال کا پہلا مہینہ توت، مقدار سال ۳۶۵ دن چھ گھنٹے۔

جلوس نوشیروانی: شروع سنہ کا پہلا دن شنبہ، سال کا پہلا مہینہ خرواد، مقدار سال ۳۶۵ دن۔

عام الفیل: شروع سنہ کا پہلا دن یک شنبہ، سال کا پہلا مہینہ محرم، مقدار سال ۳۵۴ دن، آٹھ گھنٹہ، اڑتالیس منٹ، چوالیس سکنڈ۔[1]

قاضی صاحب کے افکار کی افادیت

بالائی سطروں میں مذکور مباحث وشواہد اس بات پر بین ثبوت ہیں کہ قاضی صاحب کو سامی اور غیر سامی ادیان میں زبردست مہارت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تصنیفات وتالیفات میں عیسائیت، یہودیت، پارسی، ہندو، بودھ، سکھ، جین اور چینی مذاہب و تہذیبوں کا نہایت باوثوق انداز میں تعارف کرایا ہے۔ لہٰذا آج ضرورت اس بات کی ہے کہ قاضی صاحب کے اس طرز کو اختیار کیا جائے اور تقابل ادیان پر کام کرتے ہوئے معتدل رویہ اختیار کیا جائے۔ اسلام میں دیگر مذاہب کے ساتھ گفتگو کرنے اور دیگر تہذیبوں کے ساتھ

---

[1] تفصیل دیکھئے، رحمۃ للعالمین، ج ۲، صفحہ ۳۴۸-۳۶۳

معاشرت اختیار کرنے کے سلسلہ میں بہت ہی متوازن تعلیمات ملتی ہیں۔ اب ان تعلیمات کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ اسلام کا تبلیغی حق ادا ہو سکے۔ قاضی سلیمان منصور پوری نے تقابل ادیان پر جو کام کیا ہے اس کا پیغام یہی ہے کہ ہم تفاہم و مکالمہ اور تقابل ادیان کی روایت کو فروغ دیں، لیکن اس دوران جارحانہ طرز سے بچنا ہوگا نیز تحقیقی اور علمی نکتہ نظر سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

کیا ہندو شبہ اہل کتاب ہیں؟
علامہ سید سلیمان ندوی کے نظریات

سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء-۱۹۵۳) علمی و تحقیقی دنیا کا وہ مایہ ناز ستارہ ہے جس نے دینیات و اسلامیات کے متعدد گوشوں پر کام کیا ہے۔ ان کی کئی معروف تصانیف ہیں جو اہل علم و فضل سے داد و تحسین وصول کر چکی ہیں۔ ان کی تحقیقات کی فہرست بہت طویل ہے البتہ ان کا نمایاں کارنامہ علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی کی تکمیل ہے۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی نے تقابل ادیان پر بھی کام کیا ہے اس حوالے سے ان کی ایک تصنیف 'تاریخ ارض قرآن' کے نام سے بہت معروف ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی ہے۔ بظاہر کتاب کے عنوان سے تقابل ادیان کا موضوع نہیں لگتا ہے لیکن کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے قرآن میں مذکور اقوام کی تہذیب و تمدن اور جغرافیہ پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے جس کی پہلی جلد میں قرآن مجید کی تاریخ آیات کی تفسیر سرزمین قرآن، عرب کا جغرافیہ اور قرآن میں جن اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی تاریخ پر مدلل گفتگو کی ہے۔ اسی طرح جلد دوم میں بنو ابراہیم کی تاریخ اور عربوں کی قبل اسلام تجارت، زبان و مذہب، توراۃ، تاریخ یونان و روم پر علمی اور سنجیدہ بحثیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور کتاب 'ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی میں مسلم حکمرانوں کی کوششیں' کے عنوان سے موجود ہے۔ دراصل یہ ایک مقالہ تھا 'ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں' اس کو سرسید کی قائم کردہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں ۲۹/ دسمبر ۱۹۱۷ء کلکتہ میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد اس کو معارف نے مئی تا دسمبر

۱۹۱۸ء میں قسط وار شائع کیا۔ بعد میں اس کو درج بالا نام کے ساتھ شائع کیا گیا۔ جو نسخہ راقم کے پاس ہے اس میں سن اشاعت ۲۰۱۰ء ہے صفحات کی تعداد ۹۰ ہے۔ معارف پریس اعظم گڑھ نے شائع کیا ہے۔ ایک اور کتاب جو مکالمہ کے زمرے میں آتی ہے 'عرب و ہند کے تعلقات' یہ بھی سید صاحب کے ان خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ۱۹۲۹ء میں ہندوستانی اکیڈمی آلہ آباد میں دیئے تھے۔ راقم کے سامنے جو نسخہ ہے اس میں سن اشاعت ۲۰۱۰ء ہے۔ صفحات کی تعداد ۲۶۸ ہے۔ اس کو معارف پریس اعظم گڑھ نے شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ سیرۃ النبی کی جلد چہارم میں بھی ہندوؤں کے متعلق کچھ چیزیں ملتی ہیں۔ واضح رہے کہ سیرۃ النبی کی دو جلدیں علامہ شبلی نعمانی نے تصنیف کی ہیں۔ باقی جلدیں سید سلیمان ندوی کے قلم سے نکلی ہیں۔ یعنی سید سلیمان ندوی نے ہندوؤں کے متعلق اپنی ان کتب میں جن مباحث کو اٹھایا ہے وہ عصری تناظر میں بھی قابل مطالعہ اور افادیت کی حامل ہیں۔ یہ کتابیں نفرت و تعصب کے اس دور میں ہندوستان کی دو قوموں کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اب ذیل میں سید صاحب کے ہندوؤں کے متعلق افکار و نظریات پیش کیے جائیں گے۔

ہندوستان کی قدیم تاریخ و تہذیب

سید سلیمان ندوی اپنی کتاب سیرۃ النبی میں ہندوستان کی قدیم حالت اور اس کی تاریخ و تہذیب کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''دنیا کے ان متمدن ملکوں میں جہاں کوئی بااثر مذہب قائم تھا ایک ہندوستان بھی ہے۔ ہندوستان کے تمدن کے پانچ مختلف دور گزرے ہیں۔ ایک اصل ہندو ویدک عہد جو دو ہزار سال ق م سے لیکر تقریباً چودہ سو سال ق م تک رہا۔ دوسرا دور جنگ یعنی جس میں کوروں اور پانڈوں وغیرہ کے مناقشات رہے اور جو چودہ سو ق م سے لیکر تقریباً ایک ہزار قبل مسیح تک رہا۔ تیسرا دور عقلیت جس میں حکماء و عقلیین کا دور دورہ تھا اور جو ایک ہزار ق م سے لیکر تقریباً تیسری صدی ق م کے نصف تک رہا۔ چوتھا دور بودھ، جس میں اس مذہب کا عروج

دوسوق م سے لیکر پانچویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک رہا۔ پانچواں دور پرانک ،جس میں بجائے ویدیا گوتم بدھ کی تعلیمات کے پرانوں کی تلقین پر علم درآمد تھا اور یہ عہد تقریباً پانچویں صدی عیسوی کے اواخر سے لیکر مسلمانوں کے داخلہ ہند تک قائم رہا''۔

اس کے بعد سید صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ ہندوستانی قدیم تہذیب اور تاریخ زیادہ تر نقائص و تاریک سے مملو ہے وہ ۵۰۰ عیسوی سے شروع ہوتی ہے۔ اس دور میں جو تہذیب ہندوستان میں رائج تھی اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

''شرک جو ابتدا ہی سے ہندوستان کے خمیر میں شامل تھا وہ حد اعتدال سے باہر ہوگیا تھا چنانچہ وید میں جو تینتیس دیوتاؤں کی تعداد تھی وہ اب بڑھتے بڑھتے تینتیس کروڑ دیوتاؤں تک پہنچ گئی تھی۔ ویدک عہد میں اصنام کی پرستش کا رواج نہ تھا لیکن اسی زمانے میں مندروں کے اندر گئی پرستش علی العموم رائج ہوگئی۔ مندروں کے محافظین بد اخلاقی کے سرچشمے تھے جو لاکھوں کروڑوں نا واقف پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام سے خوب خوب لوٹتے۔ ویدک عہد میں ساری ہندو قوم میں یگانگی تھی لیکن اب ذات پات کی تفریق شروع ہوگئی، جو نظام معاشرت کے لیے تباہ کن تھی''۔[1]

تفریق و امتیاز

سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ اونچ نیچ کا تصور ہندو ازم میں پایا جاتا ہے اور اسے قانونی حیثیت حاصل ہے۔

(الف) برہمن کو کسی حالت خواہ کتنے ہی سنگین جرائم کا مرتکب رہ چکا ہو سزائے موت نہیں دی جاسکتی۔

(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا کسی نیچی ذات کی عورت کے ساتھ زنا کرنا جرم نہیں۔

---

[1] ندوی، سید سلیمان، سیرۃ النبی، مکتبہ ناشران وتاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۶، ج ۴ ص ۵۶۳-۵۶۴

(ج) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلی ذات والے کو چھو لے تو اس کی سزا موت ہے۔

(د) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضاء قطع کر ڈالنے چاہئے۔ اگر اسے گالی دے تو اس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہئے اور اگر اسے تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منھ میں ڈالنا چاہئے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوازم میں اونچ نیچ اور ذات پات کا تصور پایا جاتا۔ یقیناً یہ رویہ کسی ترقی یافتہ معاشرے کے لیے مفید ثابت نہیں ہوسکتا ہے۔

شبہ اہل کتاب

سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی میں ایک بحث یہ اٹھائی ہے کہ ہندوستان میں رہنے والی اقوام جنہیں ہم ہندو کہتے ہیں۔ کیا شبہ اہل کتاب ہیں؟ اس بابت انھوں نے لکھا ہے:

> ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قانونی حیثیت سے دنیا کی قوموں کو چار طبقات میں تقسیم فرمایا اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق قرار دیئے ہیں۔ جن پر اسلام کی تیرہ صدیوں میں برابر عمل ہوتا رہا ہے۔ وہ تقسیم اس طرح ہے۔ ۱- مسلمان جو قرآن اور دوسری کتابوں کو کتاب الٰہی تسلیم کرتے ہیں۔ ۲- اہل کتاب یعنی ان کتابوں کے پیرو جن کے نام قرآن میں مذکور ہیں یا یوں کہئے جو قرآن کو آسمانی کتاب نہیں مانتے مگر ان کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں مذکور ہے کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہیں۔ ۳- کفار و مشرکین یعنی وہ لوگ جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی دین الٰہی کی طرف منسوب ہیں۔ ۴- شبہ اہل کتاب یعنی وہ لوگ جو قرآن اور تورات و انجیل و زبور کو نہیں مانتے مگر ان کے علاوہ کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں۔ جیسے صابی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کے دعوی کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے اور مجوس یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی سورج، آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں۔ ترکستان اور سندھ کی

فتح کے موقع پر علماء اسلام نے انہی پر قیاس کر کے ہندوؤں اور بودھوں وغیرہ کو بھی اسی صنف میں داخل کیا''۔[1]

اس کی مزید بحث سید سلیمان ندوی نے اپنی دوسری کتاب "عرب و ہند کے تعلقات میں کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''سندھ کو فتح کرتے ہوئے جب عرب سپہ سالار محمد بن قاسم سندھ کے مشہور شہر الرور (الور) پہنچا تو شہر والوں نے کئی مہینے تک حملہ آوروں کا پرزور مقابلہ کیا۔ پھر صلح کی، اور اس میں دو شرطیں قبول کیں، اول یہ کہ 'شہر کا کوئی آدمی قتل نہ کیا جائے، دوسرے یہ کہ ان کے بت خانوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، محمد بن قاسم نے جس وقت ان شرطوں کو قبول کیا تو یہ الفاظ کہے۔ ما البد الا الکنائس النصاری والیہود و بیوت نیران المجوس ہندوستان کا بت خانہ بھی عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں اور مجوس کے آتش کدوں کی طرح ہے''۔[2]

اس تناظر میں اس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ برداران وطن کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ آیا انہیں شبہ اہل کتاب میں شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ سید صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس دور میں دونوں قوموں میں باہم میل جول بہت خوشگوار تھا اور سماجی طور پر ایک دوسرے کا خیال کرتے تھے۔ آج بھی بنیادی طور پر اس بات کی ضرورت ہے کہ جو کھٹاس اب ہندو اور مسلمانوں کے مابین پیدا کی جا رہی ہے اس کو رفع کرنا نہایت ضروری ہے۔ تکثیری سماج کی اصل غرض و غایت یہی ہے کہ باہم قومیں اپنے اپنے نظریات کے ساتھ سماجی طور پر مل جل کر رہیں۔

ہندو مذہب کی تحقیق

تقریباً چوتھی صدی ہجری میں ہندو اور مسلم خوش اسلوبی سے زندگی گزارتے تھے تو اس

---

[1] ندوی، سید سلیمان، سیرۃ النبی، ۷۵۸-۷۵۹

[2] عرب و ہند کے تعلقات، صفحہ ۱۳۲

کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سارے مسلم اسکالر نے یہاں کے مذہبی اور تمدنی حالات کا جائزہ لیا اور باقاعدہ اسکالرس اور سیاح یہاں آئے جنھوں نے ہندوؤں کے متعلق انتہائی اہم معلومات فراہم کی۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے۔:

''اس باہمی میل جول کا اثر یہ ہوا کہ عربوں کو ہندوؤں کے مذاہب کی تحقیقات کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ یحییٰ برمکی نے جس کی وزارت کا زمانہ ۱۷۰ھ سے ۱۹۰ تک ہے ایک شخص کو ہندوستان خاص طور سے اس لیے بھیجا کہ وہ یہاں کی دواؤں اور یہاں کے مذہبوں کا حال لکھ کر لائے، اس وقت بغداد کا یہ عالم تھا کہ دنیا کے تمام مذہبوں اور عقیدوں کا وہ اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ عباسی خلفاء اور ان کے بعض فلسفہ پسند امراء کے دربار مذہبی جلسوں اور مناظروں سے گرم رہتے تھے، اور دن اور وقت مقرر تھے، جن میں ایسی مجلس منعقد ہوتی تھیں، ہر مذہب والے کو اجازت تھی کہ وہ اپنے مذہب کی دلیلیں پیش کرے اور اسلام پر اعتراضات کرے اور جوابات سنے، ان مجلسوں اور مناظروں میں مسلمان سب سے پیش پیش رہتے تھے اور برامکہ کا خاندان خاص طور سے ان لوگوں کی سرپرستی کرتا تھا، عجیب نہیں کہ اس وجہ سے یہ ضرورت پیش آئی ہو کہ ہندوستان کے مذہبوں سے بھی واقفیت حاصل کی جائے۔ جو شخص اس غرض سے ہندوستان بھیجا گیا تھا، اس کی بعینہ روداد غالباً محفوظ نہیں ہے۔، مگر ابن ندیم جس نے اپنی کتاب اس واقعہ کے ۷۰-۸۰ برس بعد لکھی ہے۔ وہ ایک تحریر کا حوالہ دیتا ہے جو مشہور عرب فلاسفر یعقوب بن اسحاق کندی کے ہاتھ کی لکھی تھی اور اس پر سنہ ۳۴۹ھ کی تاریخ پڑی ہوئی تھی، اس میں یحییٰ برمکی کے ایک شخص کو ہندوستان کے مذاہب کی تحقیق کی غرض سے ہندوستان بھیجے جانے کی خبر درج تھی، اور اس پر ''ہندوستان کے مذاہب اور اعتقادات'' کا سرنامہ اور اسکے نیچے مختصر حالات لکھے ہوئے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ اسی شخص کی

روداد کا خلاصہ ہے۔ اس تحریر میں پہلے گجرات کے راجہ ولبھ رائے کے دارالسلطنت مہانگر کے بت خانہ کا حال لکھا ہے۔ اس کے بعد ہندوؤں کے فرقوں کا حال درج ہے۔

۱- سب سے پہلے فرقے کا نام مہا کالیہ بتایا ہے۔ جو مہا کالی کو پوجتے ہیں۔ پھر اس کی کیفیات بیان کی ہیں۔ ۲- دوسرے فرقہ کا نام الدنیکتیہ (ادت بھکتی) یعنی سورج (ادت) پوجنے والے، ۳- تیسرا چندر بھکتیہ (چندر بھکتی) یہ چاند کے پجاری ہیں۔ ۴- چوتھا فرقہ بکرتنیہ ہے جو اپنے کو زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں۔ سر اور داڑھی کے بال منڈاتے ہیں ایک لنگوٹی کے سوا تمام بدن ننگا رکھتے ہیں۔ جو ان کے فرقے میں آتا ہے پہلے کہتے ہیں سب کچھ دان کردو۔ ۵- پانچواں فرقہ گنگا پاترہ (گنگا جاتری) اس عقیدہ کے لوگ تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں، ان کی ہاں یہ ہے کہ جو گناہ بھی انسان کریگا گنگا آ کر اشنان کرنے سے وہ سب دھل جاتا ہے۔ ۶- چھٹے راجپوت یہ (راجپوت) جن کا دھرم راجاؤں کی مدد ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ راجاؤں کے لیے کام میں آجانا بھکتی ہے۔ ۷- ایک اور فرقہ ہے جو اپنے بال بڑھاتا ہے اور ان کو بٹ کر چہروں پر جٹا بنا کر ڈالتا ہے۔ ہر طرف بال بکھرے ہوتے ہیں، وہ شراب نہیں پیتے''۔[1]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے احوال کو مسلمانوں نے نہایت توازن کے ساتھ جاننے کی سعی کی ہے اور قدیم و جدید مسلم اسکالر نے جو چیزیں بھی ان کے مذہب کے متعلق ملی ہیں ان کو بیان کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔

ہندو مسلم رواداری

تاریخ میں ایسے بہت سارے واقعات موجود ہیں جو ہندوستانی تہذیب کو جلا بخشتے

---

[1] دیکھئے تفصیل، عرب و ہند کے تعلقات۔ صفحہ ۱۳۷-۱۴۰

ہیں اور ان سے ہندو مسلم رواداری و اتحاد قوی تر ہوتا ہے۔ اسی نوعیت کا ایک واقعہ سید سلیمان ندوی نے بیان کیا ہے:

''قرآن پاک کا ترجمہ لوگ آج ہندی میں کرنے لگے ہیں مگر یہ سن کر کتنا اچنبھا ہوگا کہ آج سے تقریباً ایک ہزار برس پہلے قرآن پاک ہندی میں یا سندھی میں ہندو راجہ کے حکم سے کیا گیا تھا، سنہ ۲۷۰ھ میں الرا (الور وقع سندھ؟) کے ایک راجہ مہروک نے جس کا راج کشمیر بالا (کشمیر) اور کشمیر زیریں (پنجاب) کے بیچ میں ہے اور جو ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں میں ہے، اس نے منصورہ (واقع سندھ) کے امیر عبداللہ بن عمر کو لکھ کر بھیجا کہ کسی ایسے شخص کو میرے پاس بھیجئے جو ہندی میں ہم کو اسلام کا مذہب سمجھا سکے۔ منصورہ میں عراق کا ایک مسلمان تھا جو بہت تیز طبیعت، سمجھدار اور شاعر تھا اور چوں کہ ہندوستان میں پلا تھا اس لیے یہاں کی مختلف زبانیں وہ جانتا تھا، امیر نے اس سے راجہ کی خواہش کا ذکر کیا، وہ تیار ہوا، اس نے ان کی زبان میں ایک قصیدہ لکھ کر راجا کو بھیجا، راجہ نے اس قصیدہ کو سنا تو بہت پسند کیا اور اس کو سفر خرچ بھیج کر اپنے پاس بلوایا، وہ راجہ کے دربار میں تین برس رہا اور اس کی خواہش سے اس نے قرآن کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا، راجہ روزانہ ترجمہ سنتا تھا اور اس سے بے حد متاثر ہوتا تھا''۔[1]

اس واقعہ کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کی جڑیں بہت پرانی ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندی زبان بھی کافی پرانی ہے۔ اس وقت ہندی میں لکھنے کا عام رواج تھا اور عربوں نے ہندی پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ ان چیزوں سے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب فروتر ہوتی ہے اور ہندو مسلم کے مابین اتفاق کی راہ ہموار ہوتی نظر آتی ہے۔ اگر چہ آج ہماری اس روایت کو کچھ لوگ اپنے سیاسی نظریات سے دبانے کی کاوش میں لگے ہوئے

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات، صفحہ ۱۵۹-۱۶۰

ہیں۔امید قوی ہے کہ یہ مٹھی پر افراد ہمارے باہم تعلقات کو کسی طرح بھی متاثر نہیں کر پائیں گے۔

فرشتوں کے متعلق ہندوؤں کے عقائد

سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی میں ایک بحث فرشتوں کے متعلق کی ہے۔اور اس میں مذاہب سابقہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے:

''مذاہب سابقہ میں ان غیر مادی ذی روح مخلوق ہستیوں کی حیثیت نہایت مشتبہ تھی۔وہ کبھی مخلوق کہی جاتی تھیں اور کبھی خدائی کے مرتبہ تک بلند کر دی جاتی تھیں۔ ہندوؤں کے دیوتاؤں اور دیبیوں کی یہی کیفیت تھی۔ پارسیوں میں امشاسپند کا یہی حال تھا کہ کبھی ان کی حیثیت فرشتوں کی رہتی تھی، کبھی وہ خدا کے مقابل بن جاتی تھیں اور کبھی خود خدا ان میں سے ایک ہو جاتا تھا۔ ہندوؤں کی طرح پارسیوں میں بھی وہ قابل پرستش سمجھی جاتی تھیں۔ان کے نزدیک سب سے عالی رتبہ امشاسپند چھ تھے اور ان کے تحت میں تینتیس پھر ان میں سے ہر ایک کے ماتحت ہزاروں تھے اور چونکہ پارسی نیکی اور بدی کے دو متقابل خداؤں کے قائل تھے اس لیے دونوں کے ماتحت اچھے اور برے فرشتوں کی بے شمار تعداد تھی۔ نیکی کے فرشتے براہ راست نیکی کی چیزیں کو اور برائی کے فرشتے مصیبتوں اور ہلاکتوں اور برائیوں کو دنیا میں پیدا کرتے تھے اور اپنے خدا کی طرف سے ان اشیاء پر حاکم سمجھے جاتے تھے۔دونوں خدا اپنی اپنی فوجوں اور لشکروں کے پرے لے کر باہم نبرد آزما رہتے تھے۔یہ بھی ان کا اعتقاد تھا کہ ہر امشاسپند یا فرشتہ کے ساتھ ایک یزد یعنی مادہ (فرشتہ) بھی ہوتی تھی جو اس کی بیوی تھی۔ ہندوؤں میں نر دیوتاؤں اور دیبیوں کا تصور تھا۔مگر ان نر و مادہ ہستیوں میں کسی نر کو کسی مادہ سے خصوصیت خاص نہ تھی بلکہ ہر ایک جنس کا ہر فرد دوسری جنس کے ہر فرد سے لطف اندوز ہو سکتا تھا''۔[1]

[1] سیرۃ النبی ج ۴، صفحہ ۳۴۷

صابیوں میں ملائکہ کا تصور بھی بالکل ٹھیک نہ تھا۔ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

''صابیوں میں فرشتوں کی قربانی کی جاتی تھی ان کے ہیکل بنائے جاتے تھے اور ان کو مظہر خدا تسلیم کیا جاتا تھا۔ عربوں میں فرشتے مادہ سمجھے جاتے تھے۔ وہ خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارے جاتے تھے۔ ان کی پرستش ہوتی تھی اور سمجھا جاتا تھا کہ وہ خدا کے دربار میں سفارشی ہوں گے۔ یونانیوں میں عقل اول اور عقول عشرہ تمام عالم کی خالق، کارفرما اور مرجع کل مانی گئیں اور خدا کو معطل ٹھہرایا'' ۔[1]

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس قدر پراگندہ عقیدہ فرشتے کے متعلق ان ادیان میں پایا جاتا ہے۔ البتہ اسلام کی تعلیمات اس سلسلہ میں بالکل واضح ہیں:

''اسلام نے آ کر ان تمام عقائد کو مٹا دیا۔ خدائی اور ربوبیت کی ہر صفت سے فرشتے محروم بتائے گئے۔ ان کی پرستش ناجائز کی گئی۔ نر و مادہ کی مادی جنسیت سے وہ پاک کیے گئے اور انسانوں کو ان پاک مخلوقات کی غلامی و بندگی سے آزاد کیا گیا۔ ان کی تعداد و شمار اور درجہ بندی کا کوئی تخیل باقی نہ رکھا گیا۔ ان کی ہستی خدائے تعالیٰ کے سامنے ایک سراپا مطیع و فرمانبردار اور غلام کی قرار دی گئی جس کا کام شب و روز صرف آقا کا حکم بجالانا ہے'' ۔[2]

اس سے یہ پتہ چلا کہ ہندوؤں میں فرشتوں کا تصور تو پایا جاتا ہے، لیکن ان کے اس عقیدے میں شرک جیسی مکروہ چیز کی ملاوٹ ہے۔ البتہ اسلام نے فرشتوں پر ایمان کی بابت نہایت جامع اور مانع تصور پیش کیا۔ جو تمام باطل عقائد کے لیے راہ ہدایت ہے۔

ہندوستانی مذاہب میں روزہ کا مفہوم

سید سلیمان ندوی نے 'سیرۃ النبی' کی پانچویں جلد میں بتایا ہے کہ روزہ کا مفہوم تمام ادیان میں پایا جاتا ہے۔ ہندوستانی ادیان میں اس کا مفہوم درج ذیل ہے:

---

[1] سیرۃ النبی ج ۴، صفحہ ۳۴۷

[2] ایضاً، ص: ۳۴۷

''ہندوستان کو سب سے زیادہ قدامت کا دعویٰ ہے، لیکن برت یعنی روزہ سے وہ بھی آزاد نہیں، ہر ہندی مہینہ کی گیارہ بارہ کو برہمنوں پر اکاوشی کا روزہ ہے۔ اس حساب سے سال میں چوبیس روزے ہوئے۔ بعض برہمن کاتک کے مہینے میں ہر دوشنبہ کو روزہ رکھتے ہیں۔ ہندو ہوگی چلہ کشی کرتے ہیں۔ یعنی چالیس دن تک اکل وشرب سے احتراز کرتے ہیں۔ ہندوستان کے تمام مذاہب میں جینی دھرم میں روزہ کے سخت شرائط ہیں۔ چالیس چالیس دن تک کا ان کے یہاں ایک روزہ ہوتا ہے۔ گجرات ودکن میں ہر سال جینی کئی کئی ہفتہ تک کا روزہ رکھتے ہیں۔ قدیم مصریوں کے یہاں بھی روزہ دیگر مذہبی تہواروں کے شمول میں نظر آتا ہے''۔[1]

البتہ اسلام نے روزہ کا نہایت جامع اور معتدل نظام پیش کیا ہے۔ روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے۔ روزہ کا مقصد نوع انسانی کو ہوئی وہوس جیسی چیزوں سے پاک رکھتا ہے۔

آخر میں مذکورہ تمام شواہد کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سید سلیمان ندوی نے ہندوستانی ادیان کے متعلق دلچسپ معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ان کی تحقیقات کا دائرہ ادیان کے حوالے سے صرف ہندوستانی مذاہب کی تہذیب وتاریخ تک محدود نہیں ہے، بلکہ انھوں نے یونان ومصر اور سامی ادیان پر بھی گفتگو کی ہے۔ گویا سید سلیمان ندوی اپنی کتابوں میں تقابل ادیان کے متعلق گفتگو کرتے رہے ہیں۔ ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے ہندوؤں کے متعلق ان مباحث کو اٹھایا ہے جن کی طرف دیگر محققین کی توجہ نہیں گئی تھی۔ جیسے ہندوؤں کی تعلیم وترقی مسلم عہد میں اسی طرح عرب و ہند کے تعلقات وغیرہ وغیرہ۔ ان مباحث کی عصر حاضر میں جو افادیت ومعنویت ہے وہ کسی کی نظروں سے مخفی نہیں ہے۔ ہندوستان میں آج متعصب اور کوتاہ نظر مورخین مسلمانوں کی رواداری اور ان کے حسن سلوک کو خرد برد کرنے کی کوشش کررہے ہیں ایسے پرآشوب دور میں سید سلیمان ندوی کی ان تحقیقات وتصنیفات کی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔

[1] سیرۃ النبی، ج ۵، صفحہ ۱۵۲

ہندوؤں کے سماجی و سیاسی حالات
پروفیسر شیخ خورشید کے افکار کے تناظر میں

پروفیسر شیخ خورشید (سابق چیرمین شعبہ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) کی کتاب 'تاریخ ہند' میں ہندوازم سے متعلق کافی مواد ملتا ہے۔ انھوں نے یہ کتاب۔ ہائی اسکول کے طلبہ کے لیے لکھی ہے۔ گویا یہ کتاب تاریخ ہند پر مستند دستاویز، ہندوستانی تہذیب وتمدن پر ایک جامع تحقیق ہے۔ اس کے اندر انھوں نے ہندوستان کی سیاسی صورت حال حال کو تفصیل سے لکھا ہے۔ البتہ کتاب کے ابتداء میں ہندوستانی مذاہب (ہندومت، جین مت، بدھ مت) پر نہایت وقیع معلومات پیش کی ہیں۔ ہندوستان اور ہندوستانی مذاہب کے سلسلے میں درج ذیل موضوعات کے تحت گفتگو کی ہے۔

مباحث کتاب

قدیم تاریخ ہند کے ماخذ، کتبے اور سکے، پرانی عمارتیں، تاریخ کے علاوہ دوسری کتابیں، سیاحوں کے سفرنامے، ہندوستان اور اس کی قدرتی تقسیم، سندھ وگنگا کا میدان، دکن، ساحل، قدیم ہند کے باشندے، نیا پتھر کا زمانہ، لوہے اور تانبے کا زمانہ، دراوڑ اور ان کی معاشرت، منگول، آریہ اور دوسری قومیں جو بعد میں آئیں، زبانیں، آریوں کا وطن، شکل و شباہت، وید، ویدوں کے زمانے میں سیاسی حالت، اقتصادی حالت اور معاشرت، آریوں کا مذہب، رامائن اور مہابھارت کا زمانہ، بھگوت گیتا، آریہ سلطنتیں، سیاسی حالت اور رسم ورواج، ذاتوں کی تقسیم اور برہمنوں کا عروج، منوسمرتی، ذات کی خوبیاں اور عیوب، برہمنوں کا عروج اور

ان سے بیزاری، بدھ اور جین مذہب، مہاویر کی تعلیم اور ان کے پیرو، گوتم بدھ کی پیدائش اور ابتدائی حالات، بدھ مذہب کی اشاعت، بدھ کی تعلیم، بدھ مذہب کا عروج اور اس کے اسباب، جین اور بدھ مذہب کا مطالعہ۔

مذکورہ مباحث سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پروفیسر شیخ خورشید صاحب نے ہندوستانی ادیان اور تہذیب کا جائزہ نہایت تعمق و گیرائی سے کیا ہے۔ یہ کتاب ہندوستانی مذاہب پر تو نہیں ہے البتہ شروع میں انھوں نے ہندوستانی ادیان کا ذکر کیا ہے۔ مطالعۂ ادیان کے قارئین اور محققین کے لیے اس کے اندر انتہائی اہم مواد موجود ہے۔

قدیم تاریخ ہند کے ماخذ

ہندوستان کی قدیم تاریخ کو جاننے کے لیے کوئی ایسا تحریری و یقینی سرمایہ موجود نہیں ہے جسے اعتماد سے کہا جاسکے کہ ہندوستان کی معتبر تاریخ یہ ہے۔ پروفیسر خورشید صاحب نے بھی اپنی کتاب میں اس جانب اشارہ کیا ہے:

> ''عہد قدیم کی تاریخ لکھنے اور پڑھنے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اس زمانے کی کوئی تاریخ موجود نہیں۔ اور ہم مجبور ہیں کہ دوسرے ذرائع سے اس زمانے کے واقعات اور حالات معلوم کریں۔ اگرچہ ہر زمانے کے حالات کے لیے تاریخی کتابوں کے علاوہ پرانے سکے، عمارتیں اور کتبے وغیرہ نہایت ضروری اور مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کے قدیم حالات معلوم کرنے کا ذریعہ صرف یہی چیزیں ہیں''۔[1]

گویا تاریخ کے نقوش اس قدر دھندلے ہیں کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ کو جاننے کے لیے کتبات، سکے اور عمارتوں پر تکیہ کرنا ضروری ہے۔ اسی وجہ سے پروفیسر موصوف ہندوستان کی قدیم تاریخ کے حوالے سے کتبات وغیرہ کی اہمیت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تاریخ کے ماخذوں میں سب سے پہلی جگہ کتبات کو دی گئی ہے اور درحقیقت

---

[1] تاریخ ہند، صفحہ ا

معلومات کا ان سے بہتر اور زیادہ معتبر ذریعہ اور کوئی نہیں۔ بدقسمتی سے تیسری صدی قبل مسیح سے پہلے کتبات کم دستیاب ہوئے ہیں، لیکن اس کے بعد کے زمانے کے کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ یہ کتبے پتھر یا کسی قسم کی دھات پر کندہ ہیں۔ بعض پر سرکاری تحریریں ہیں اور بعض کسی عمارت کی تعمیر یا بت خانے کے نصب کیے جانے کے متعلق ہیں۔ اس سلسلے میں اشوک کے ان فرامین اور ہندو نصائح کا ذکر ضروری ہے جو چٹانوں اور پتھروں کی بنیادوں پر کھدوائے گئے ہیں اور جن سے اس کی سلطنت کی وسعت، حکومت کے اصول، مذہبی عقائد اور کارناموں کا پتہ چلتا ہے۔ دوسرے ماخذ پرانی عمارتیں ہیں ان سے اس زمانے کا طرز معاشرت معلوم ہوتا ہے۔ موہن جوداڑو، ہڑپا، نالندا اور تکشلا کے کھنڈروں سے جو حال ہی میں کھود کر برآمد کیے گئے ہیں ان سے عہد قدیم کی تاریخ پتہ کرنے میں بے انتہا مدد ملتی ہے۔ پروفیسر موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ تاریخی واقعات ہم اکثر ان کتابوں سے جمع کرتے ہیں جو تاریخ کے علاوہ دوسرے فنون پر لکھی گئی ہیں۔ مثلاً مذہبی کتابوں میں اکثر تاریخی واقعات مل جاتے ہیں۔ وید، پران، رزمیہ مثنوی، مہابھارت، رامائن، بعض اوقات معمولی نظمیں، ڈرامے، قواعد اور قانون کی کتابوں جیسے ہرش برت اور منو کا کوڈ وغیرہ شامل ہیں، ان سے ہندوستان کی قدیم تاریخ معلوم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ چوتھا ماخذ ہندوستان کی قدیم تاریخ سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے سیاحوں کے سفرنامے ہیں۔ سب سے پہلا شخص جس کی کتاب میں ہندوستان کے حالات ملتے ہیں ''ہردوٹس'' یونانی ہے۔ البتہ اس کے اقوال زیادہ معتبر نہیں اس لیے کہ سکندر اعظم کے حملہ سے پہلے بیرونی دنیا کو ہند کی حالت سے بہت کم واقفیت تھی۔ اس حملہ کے بعد یورپ والوں کو یہاں کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا اور اس زمانے کے یونانی اور رومی مصنفوں کی کتابوں میں ہندوستان کے احوال ملتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ''میگاستھینز'' کی

ہستی خاصی اہمیت کی حامل ہے، چونکہ وہ یہاں بحیثیت سفیر کے آیا تھا اور اس کو صحیح حالات معلوم کرنے کا بہت اچھا موقع ملا تھا، افسوس اس کتاب کا اکثر حصہ اب ناپید ہے۔ جتنا بھی موجود ہے وہ ہندوستان کی قدیم تاریخ پر ایک دستاویز ہے۔اس کے بعد چینی مورخوں نے ہندوستان کے سفر کیے یہی وجہ ہے کہ دوسری صدی قبل مسیح سے چینی تاریخوں میں ہند کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ان تاریخی دستاویزات کے علاوہ وہ سفرنامے بھی کافی اہم ہیں جو چینی سیاحوں نے یہاں آ کر مرتب کیے۔ان سفرناموں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پانچویں صدی میں ''فاہیان'' ہندوستان آیا۔اس کا مقصد اولین بدھ مذہب کی تعلیم حاصل کرنا تھا۔لیکن اس نے اپنے سفر کے حالات قلمبند کر کے آئندہ نسلوں پر بڑا احسان کیا۔ اس طرح دوسرا چینی سیاح ''ہیون شانگ'' ہے اس نے ساتویں صدی قبل مسیح میں بدھ مذہب کے مقدس مقامات کی زیارت کی غرض سے یہاں آیا اس نے ہندوستان کے بہت سے مقامات کا سفر کیا اور بہت سے چشم دید واقعات اپنے سفرنامے میں تحریر کیے۔ ان کے علاوہ ہندوستان کی قدیم تاریخ پر اہم دستاویز ابوریحان البیرونی کی کتاب ہے جو اس نے یہاں مدت دراز تک رہ کر مرتب کی ہے''۔[1]

یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن چیزوں سے ہندوستان کی قدیم تاریخ و تہذیب، تمدن و معاشرت اور نظام حکومت کا پتہ چلتا ہے ان میں پروفیسر موصوف کی تحقیق کے مطابق چار مآخذ بڑی اہمیت کے حامل ہیں، یعنی کتابوسکے، پرانی عمارتیں، ہندومت کے مصادر اور سیاحوں کے سفرنامے۔

ہند کے قدیم باشندوں کا بود و باش:

پروفیسر موصوف نے اپنی کتاب میں ایک بحث یہ کی ہے کہ ہندوستان میں جو قومیں

---

[1] تاریخ ہند، صفحہ ۱-۵

طویل مدت سے آباد تھیں ان کا طرز معاشرت کیا تھا؟ وہ کن چیزوں پر گزر بسر کرتے تھے۔ کھانے میں کن کن اشیاء کا استعمال ہوتا تھا۔

انھوں نے لکھا ہے کہ:

''ابتداء میں لوگ غاروں میں رہتے تھے۔ مکانات بنانا نہیں جانتے تھے۔ زراعت سے واقفِ نہیں تھے، جانوروں کے گوشت اور پھلوں پر گزارا کرتے تھے۔ ان کو دھاتیں معلوم نہیں تھیں اور اپنے اوزار مثلاً چھریاں، کلہاڑیاں اور بھالے سب پتھر کے بناتے تھے، جسم کو درختوں کے پتوں اور جانوروں کی کھالوں سے ڈھانکتے تھے۔ مردوں کو اسی طرح سے چھوڑ دیتے تھے، نہ جلاتے تھے اور نہ دفن کرتے تھے۔ اس زمانے میں خوراک حاصل کرنے کا عام طریقہ شکار تھا۔ تاریخ میں اس زمانہ کو پتھر کا زمانہ کہتے ہیں۔ یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ اس زمانے میں جو لوگ آباد تھے وہ کون سی نسل سے تھے۔ بناء بریں قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ ''انڈمن'' کے باشندوں کی طرح حبشی تھے، ان کا رنگ سیاہ، سر چھوٹا، بال بڑے، قد چھوٹا اور ناک چپٹی ہوتی تھی۔ جوں جوں ترقی ہوتی گئی ان کے اندر معاشرتی شعور بھی آنے لگا۔ جدید ایجادات سے واقفیت پیدا ہوئی۔ چنانچہ وہ زراعت سے آشنا ہوئے اور اناج و پھل پیدا کرنے لگے۔ اسی طرح دیگر ضروریات کے سامان سے بھی واقف ہوئے، جن ایجادات میں انھوں نے ترقی کی وہ یہ تھیں برتن بنانا، لباس کے لیے درختوں کی چھال، چمڑا اور روئی کا استعمال، سونا بھی انھوں نے دریافت کرلیا تھا اور اس سے زیور تیار کرتے تھے۔ مردوں کو دفن کرنے لگے تھے۔ یہ زمانہ نیا پتھر کا زمانہ کہلاتا ہے۔ اس زمانے میں شمالی اور جنوبی ہند میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی قائم ہوگئیں تھیں۔ جنوبی ہند میں لوہے کی اشیاء استعمال کی جانے لگیں۔ لیکن شمالی ہند میں اس کے بعد تانبے کا زمانہ آتا ہے۔ تانبے کے اوزار ممالک متوسط، متھرا، کانپور، جنوبی پنجاب اور سندھ میں دستیاب ہوئے ہیں۔ حال ہی میں

پنجاب میں ہڑپا اور سندھ میں موہن جوداڑو کے مقامات پر کھدائی ہوئی ہے اور قدیم تہذیب کے متعلق حیرت انگیز انکشافات ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پانچ ہزار سال قبل یہ ایک خوبصورت شہر تھا، عمارتیں پکی ہوئی اینٹ کی ہیں، پتھر استعمال نہیں ہوتا تھا، سڑکیں باقاعدہ اور ترتیب کے ساتھ بنائی گئی تھیں، مکانوں میں کنوئیں اور غسل خانوں اور تہ خانوں کے آثار بھی ملتے ہیں۔ یہ لوگ جو اور گیہوں کی کاشت کرتے تھے اور جانوروں کا گوشت کھاتے تھے، اوزار اور برتن عام طور سے تانبے کے بنتے تھے اور نادار لوگ اس کو زیورات کے لیے بھی استعمال کرتے تھے، اون اور سوت سے کپڑا بنتے تھے، لڑائی میں بھالے، کلہاڑی، خنجر اور تیر وکمان استعمال کرتے تھے، نیز ایسی مہریں دستیاب ہوئی ہیں جن پر نقوش اور تصاویر کندہ ہیں، ان کو پڑھنا اور سمجھنا ہمارے لیے تقریباً ناممکن ہے لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ اس وقت فن نقاشی میں کافی ترقی ہو چکی تھی۔ دیوتاؤں اور دیویوں پر ایمان رکھتے تھے''۔[1]

مذکورہ حقائق سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہند کے قدیم باشندوں کو تمدن و معاشرت سے ہلکی پھلکی شد بد تھی جو آثار و شواہد دستیاب ہوئے ہیں ان سے بہت حد تک یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے بہت سے شعبوں اور ضروری اشیاء سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔

آریہ قوم کے دینی اور سیاسی حالات:

اس بابت پروفیسر موصوف نے اپنی کتاب میں یہ بحث کی ہے کہ آریوں کا وطن کون سا تھا؟ اسی طرح ان کا مذہب کیا تھا؟ انھوں نے لکھا ہے:

''نوع انسانی کی وہ نسل جو آریہ کے نام سے مشہور ہے غالباً تین ہزار سال قبل مسیح یا اس سے بھی پہلے اس ملک میں داخل ہوئی، یہ لوگ شمال مغرب کے پہاڑی دروں سے آئے اور اولاً پنجاب کے دریاؤں کے کنارے آباد ہوئے،

---

[1] تاریخ ہند، صفحہ ۱-۵

یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ ان کا اصلی وطن کون سا تھا۔ غالباً یہ لوگ یورپ اور ایشیا کے درمیان بحیرہ ارال اور بحیرہ اسود کے کنارے کے وسیع مرغزاروں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ یہاں یہ ایک مدت تک رہے، اس کے بعد یہ یہاں سے چل دیئے ان میں بعض قبیلے یورپ کی طرف نکلے اور بعض قبیلے ایران اور افغانستان پہنچے، اور یہاں سے سوات، کابل، کرم اور گومل ندیوں کی گھاٹیوں سے گزر کر ہندوستان میں داخل ہوئے یہاں ان کو قدیم ہندوستان کے باشندوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ البتہ انہیں غلبہ حاصل ہوا کیونکہ یہ فنون جنگ سے واقف تھے۔ اس طرح سے انھوں نے پورے ملک میں سکونت اختیار کرلی''۔[1]

اس ضمن میں مصنف نے ایک بحث یہ کی ہے کہ آریوں کا مذہب کیا تھا۔ چنانچہ موصوف نے لکھا ہے:

''ابتداء میں ان کا مذہب نہایت صاف اور سادہ تھا۔ وہ قدرت کے مناظر اور اس کی طاقتوں کو پوجتے تھے۔ سورج، چاند، سحر کی روشنی، بجلی، طوفان، آگ اور ہوا کی پوجا کرتے تھے۔ سوریہ دن کا دیوتا تھا۔ صبح یعنی آشا ایک حسین عورت خیال کی جاتی تھی۔ رور طوفان کا اور اگنی آگ کا دیوتا تھا، اسی طرح سے اندر باش اور وایو ہوا کے دیوتا سمجھے جاتے تھے۔ پجاری لوگ ان دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے اور ان کے قہر سے بچنے کے لیے قربانی کرتے اور دعائیں مانگتے تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ مرنے کے بعد نیک اور اچھے آدمیوں کی روحیں یم کے ساتھ سچائی اور نور میں رہتی ہیں۔ ہر برے آدمیوں کی روحیں ہمیشہ تاریکی اور ظلمت میں پڑی رہتی ہیں۔ البتہ مرور زمانہ کے ساتھ ان کے مذہبی اعتقادات بدل گئے۔ نئے دیوتاؤں کا اضافہ ہوگیا، پڑھے لکھے لوگوں کا یہ ایمان ہوگیا کہ ان تمام قوتوں پر ایک زبردست قوت ہے جس کے تحت میں

[1] تاریخ ہند، صفحہ ۲۲

یہ سب کام کرتی ہیں۔ واضح رہے کہ اس دور میں نہ مندر تھے اور نہ مورتی پوجا''۔[1]

گویا ابتدا میں آریوں کے یہاں مناظر قدرت کی پرستش ہوتی تھی اور لوگ انہیں دیوتا تصور کرتے تھے۔لیکن یہ بات صاف ہے کہ اس دور میں مورتی پوجا کا چلن نہیں تھا۔آریہ قوم کی طرز معاشرت اور سماجی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ہندوستان میں آباد ہو جانے کے بعد آریہ قوم نے زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کی۔عام لوگ تو مٹی بانس اور چھپروں سے تیار کیے ہوئے مکانوں میں رہتے تھے لیکن مالدار لوگ بڑے بڑے محل بنواتے تھے۔جن میں عمدہ قسم کے دروازے اور ستون ہوتے تھے۔ان کی عام غذا دودھ، مکھن، غلہ، ترکاریاں اور پھل تھی۔گوشت کھاتے تھے۔مگر کثرت سے نہیں، جانوروں کا شکار بھی کرتے تھے، ناچ گانے کے شوقین تھے، شراب نوشی، قمار بازی بھی موجود تھی۔ جو لوگ چوری اور ڈاکہ زنی کرتے تھے وہ برادری سے خارج کر دیے جاتے تھے۔کپڑا بننا جانتے تھے اور اون، سوت اور چمڑا لباس کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔کشتیاں تیار کرتے اور دریاؤں کو انہیں کے ذریعہ عبور کرتے تھے۔اس زمانے میں سکوں کا رواج نہ تھا اور لین دین کا طریقہ یہ تھا کہ ایک جنس کے بدلے دوسری جنس مل جاتی تھی۔آریہ سوسائٹی میں عورت کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، مذہبی رسومات کی ادائیگی میں اکثر وہ مردوں کے ساتھ شاملِ ہوتی تھیں۔ بہت سے منتر ایسے ہیں جو عورتوں کی طرف منسوب ہیں۔اسی طرح گھر کی مکمل دیکھ بھال اسی کے ذمہ ہوتی تھی۔بچپن کی شادی کا رواج نہ تھا، بیوہ عورتوں کی بھی شادی ہوتی تھی۔دان وخیرات کرنا اچھا سمجھا جاتا تھا۔ مرد وعورت دونوں رنگین کپڑے پہنتے تھے''۔[2]

---

[1] تاریخ ہند، صفحہ ۲۲-۲۳

[2] ایضاً، ص: ۲۱-۲۲

آریوں کی ریاستیں کہاں قائم تھیں اور اس کا کیا نظم ونسق تھا اس سلسلے میں پروفیسر موصوف نے درج ذیل معلومات بہم پہنچانے کی سعی کی ہے۔انھوں نے لکھا ہے:

''رامائن اور مہابھارت کے زمانے میں آریہ لوگ گنگا کی وادی میں آباد ہو گئے تھے اور غالباً آریہ تہذیب کا اثر دکن تک پہنچ چکا تھا۔ دراوڑوں سے آریوں کی لڑائی ختم ہو چکی تھی اور دونوں قومیں باہم خلط ملط ہونے لگی تھیں۔ یہ قیاس اس لیے کیا جاتا ہے کہ اب ایسے دیوتاؤں کا ذکر آتا ہے جو پہلے نہیں تھے۔ یہاں آباد ہونے پر آریوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔ جن میں پانچ بہت مشہور ہیں۔ کوروجس کا پایہ تخت ہستنا پور تھا۔

پانچال: اس خاندان میں پانچ قبیلے تھے اس لیے پانچال کہلاتا ہے۔ ان کی سلطنت گنگا اور جمنا کے درمیان کے علاوہ میں واقع تھی اور اس کا پایہ تخت کامپل تھا۔

کوشل: یہ سلطنت اس خطہ میں تھی جو اب اودھ کہلاتا ہے۔ اس کی راجدھانی اجودھیا تھی۔

ودیھ: یہ کوشل سے پورب کی طرف واقع تھی۔ اس کا پایہ تخت متھلا تھا۔

کاشی: جس کو آج ہم بنارس کہتے ہیں۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں کوشل کے راجہ نے ودیھ سلطنت کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور گوتم بدھ کے زمانے میں کاشی سلطنت کوشل کا ایک صوبہ تھا۔''[1]

گویا یہ کہنا مناسب ہے کہ آریہ قوم کے اندر، معاشرتی اقدار، مذہبی و دینی شعور اور سیاسی سوجھ بوجھ پائی جاتی تھی۔ ہاں یہ درست ہے کہ ان کی اپنی تہذیب وثقافت اور اپنا نظام تھا۔ مذہب کے متعلق جو روایات پائی جاتی تھیں ان میں نمایاں بات یہ ہیکہ مورتی پوجا اور مندر کے نام سے کوئی بھی عبادت خانہ نہیں تھا۔ اس لیے آریہ قوم کو اس اعتبار سے امتیاز حاصل ہے۔

---

[1] تاریخ ہند، صفحہ ۲۵-۲۶

ذات پات کا تصور

پروفیسر موصوف نے اپنی کتاب میں ایک بحث یہ کی ہے کہ ذاتوں کی تقسیم کا کیا فلسفہ ہے۔اس کے پس پردہ کیا وجوہات ہیں۔وہ رقم طراز ہیں:

''ذاتوں کی تقسیم بہت پرانی ہے اور اس ملک کی زندگی میں اس طرح پیوست ہوگئی ہے کہ ایک دم اس کا دور کرنا ناممکن ہے۔لیکن بہرحال ہم یہ کوشش کر سکتے ہیں کہ رفتہ رفتہ اس کی بندشوں کو ڈھیلا کریں، کیونکہ اس سے کسی کو انکار نہیں کہ اس ملک کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے''۔[1]

انھوں نے مزید لکھا ہے کہ:

''ایک ذات والا دوسری ذات والے کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور ایسے حالات میں یہ ناممکن ہے کہ برادرانہ تعلقات پیدا ہوسکیں یا لوگ مل کر ملک کی بھلائی کے لیے کوئی کام کرسکیں۔ہر شخص کو وہی پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے جو اس کے بزرگوں کا تھا، چاہے فطرتاً وہ اس کے لیے موزوں ہو یا نہ ہو۔نیچی ذات والے ذلیل وخوار سمجھے جاتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمیشہ وہ اور ان کی اولاد اسی طرح ذلیل اور خوار رہے گی۔کسی حالت میں بھی وہ اس پستی سے نہیں نکل سکتے۔برخلاف اس کے اونچی ذات والے معزز خیال کیے جاتے ہیں۔وہ مغرور ہوجاتے ہیں اور اپنی شرافت نفس پر بے جا گھمنڈ کرنے لگتے ہیں''۔[2]

یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوازم میں ذات پات کا جو نظام ہے وہ کئی اعتبار سے مناسب نہیں ہے۔ایک تو یہ کہ اس نظریہ سے سماج میں اونچ نیچ کا مزاج پیدا ہوتا ہے جو کسی بھی ترقی پذیر ملک وقوم اور معاشرے کے لیے مفید نہیں ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ اس سے خود ان

---

[1] تاریخ ہند، صفحہ ۳۱

[2] ایضاً، ص:۳۱

طبقات کے اندر احساس کمتری کا رجحان بڑھتا ہے جن کو نچلی ذات کہا جاتا ہے۔ اس لیے اس تصور کو نابود کرنے کی سخت ضرورت ہے تاکہ نوع انسانی کو ترقی و کامرانی کے یکساں مواقع حاصل ہوسکیں۔

برہمنوں کا عروج

برہمنوں کی عظمت و بلندی کے متعلق ہندو دھرم کے مذہبی مصادر میں کافی کچھ ملتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر موصوف نے منوسمرتی کے حوالے سے لکھا ہے:

''برہمن ایشور کے اوتار ہیں۔ دنیا کی ہر چیز برہمنوں کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ برہمن کی جان لینے سے بڑا دنیا میں کوئی پاپ نہیں۔ برہمن خواہ کوئی جرم کرے راجہ اس کے قتل کا حکم نہیں دے سکتا۔ اگر برہمن کو اس نے ناخوش کر دیا تو وہ اس کو شراپ یعنی بد دعا دے کر تباہی کر سکتا ہے۔ گنگا کی زرخیز وادی میں آباد ہونے کے بعد آریوں کے تمدن میں زبردست تبدیلیاں ہوگئیں۔ اب وہ بہت زیادہ مہذب ہوگئے تھے۔ سیاسی اور معاشرتی زندگی کے علاوہ مذہبی زندگی میں بھی انھوں نے بہت ترقی کر لی تھی۔ نئے دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا ہونے لگی اور رسومات مذہب کا جزو خیال کی جانے لگیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ فلسفہ اور مذہب کے ان مشکل مسائل پر غور کرنے لگے جن کا شروع میں کہیں ذکر بھی نہیں۔ آواگون کے مسئلہ پر سب کا اعتقاد تھا۔ قوم پرستی کا بھی دور شروع ہوگیا، یگیہ اور دیگر رسومات کی ادائیگی میں اس قدر پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں کہ اب سوائے برہمنوں کے جن کی زندگی اس کے لیے وقف تھی اور کوئی ان کو سمجھ بھی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ مذہبی اور تعلیمی معاملات میں برہمنوں کی ہر وقت ضرورت پڑتی تھی۔ لوگوں کی نظروں میں ان کی عزت اور اہمیت برابر بڑھتی گئی اور جیسا کہ منو کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ لوگ ان کو اوتار سمجھنے لگے۔ ان مشکل مسائل پر غور وخوض کرنے سے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا ہوتے گئے۔ مثلاً روح

کی حقیقت خدا کا وجود، موت اور زندگی کی تکالیف، یہ وہ مسائل ہیں کہ جس قدر ان پر غور کرتے تھے اسی قدر ان کے شکوک اور زیادہ بڑھتے تھے۔ اسی زمانے میں نئے رفارمر اور مجدد پیدا ہوتے ہیں اور ان مشکلات کے حل کرنے کے لیے نئے طریقے بتلاتے ہیں۔ یکیہ کرنا بالکل فضول ہے، اس سے انسان کی زندگی بہتر نہیں ہوسکتی۔ روح فنا ہونے والی چیز نہیں بلکہ دوسرے جسم میں منتقل ہوجاتی ہے اور ہمیشہ اسی طرح موت اور حیات کے چکر میں پھنسی رہتی ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ روح کو اس آواگون کے چکر سے نجات دے۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ جنگلوں میں تپسیا سوائے برہمنوں کے اور کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ کچھ عرصے بعد برہمنوں کی مخالفت شروع ہوئی اور اس قدر بڑھ گئی کہ لوگ ان سے اور ان کے مذہب سے بیزار ہونے لگے۔ ان ہی اختلافات کے باعث نئے مذہبی فرقے پیدا ہوئے جن میں سے بدھ اور جین مت بہت مشہور ہیں''۔[1]

اس اقتباس کے تناظر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب برہمنوں کی اجارہ داری مذہبی اور دیگر معاملات میں حد سے تجاوز کرگئی تو عوام کے ذہن میں شکوک وشبہات پنپنے لگے جس کے نتیجہ میں نہ صرف ان کی اجارہ داری پر زد آئی بلکہ بعض دیگر افکار ونظریات کے حاملین بھی رونما ہوئے اور انھوں نے باضابطہ جدید دین ودھرم کی حمایت کی۔ اسی کے نتیجہ میں جین مت اور بدھ دھرم کا وجود وقوع پذیر ہوا۔

رامائن مہابھارت اور گیتا کا عہد

پروفیسر موصوف نے بتایا ہے کہ:

''ویدوں کے زمانہ کے بعد جو دو ہزار قبل مسیح سے ایک ہزار قبل مسیح تک زمانہ مانا جاتا ہے، رزمیہ نظموں کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اس عہد کے حالات معلوم

[1] تاریخ ہند، صفحہ ۳۱-۳۳

کرنے کا ذریعہ رامائن اور مہابھارت ہیں اور سہولت کی وجہ سے ہم اس کو رامائن اور مہابھارت کا زمانہ کہتے ہیں۔ ان دونوں نظموں کے علاوہ غالبا ہندوؤں کی دوسری مقدس کتابیں، براہمن، آرنیک اور اپنشد بھی اسی زمانہ میں مرتب ہوئیں، ان کتب کے مطالعہ سے اس دور کے سیاسی، اخلاقی اور مذہبی حالات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ رامائن اور مہابھارت کی تصنیف کی تاریخ ٹھیک طور پر نہیں بتلائی جاسکتی ہے۔ رامائن کے مصنف والمیک رشی ہیں۔ اس میں چوبیس ہزار اشعار ہیں۔ اکبر بادشاہ کے عہد میں گوسوامی تلسی داس نے رامائن کا ترجمہ ہندی میں کیا جو شمالی ہندوستان کے ہندو خاندانوں میں اب تک پڑھا جاتا ہے۔ مہابھارت کے مصنف ویاس جی ہیں اس میں بھی چوبیس ہزار اشلوک تھے لیکن بعد میں اضافہ کردیا گیا یہاں تک کہ ایک لاکھ ہوگئے۔ گیتا کے متعلق لکھا ہے کہ۔ شری کرشن جی نے مہابھارت کی جنگ میں پانڈوں کا ساتھ دیا۔ ہندو لوگ سری کرشن جی کو اوتار مانتے ہیں۔ لڑائی میں جب ارجن نے دیکھا کہ بہت آدمی اپنے اور دشمن کے ہلاک ہوئے جاتے ہیں تو وہ لڑائی سے بیزار ہوگئے اور چاہتے تھے کہ کنارہ کشی اختیار کریں۔ لیکن سری کرشن جی نے ان کی ہمت افزائی کی اور بہت سے اپدیش دیئے۔ ان کو بتایا کہ ایک چھتری کا کیا دھرم ہے۔ روح کبھی نہیں مرتی۔ اگر ایک شخص مرگیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ روح اس کا جسم چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کے بعد پھر دوسرے جنم میں نمودار ہوگی۔ سچائی کے لیے لڑائی بھی جائز ہے۔ انسان کو اپنا ارادہ اور نیت ٹھیک رکھنا چاہئے۔ ان اپدیشوں کے مجموعہ کا نام بھگوت گیتا ہے''۔[1]

ان حقائق وشواہد کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر شیخ خورشید صاحب نے اپنی معروف کتاب تاریخ ہند میں میں ہندو دھرم کے متعلق جو چیزیں پیش کی ہیں وہ بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے

[1] تاریخ ہند، صفحہ ۲۴-۲۵

ہندوستانی مشترکہ تہذیب خصوصا ہندو تہذیب وثقافت کا کافی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب میں ہندو دھرم کے متعلق وہ بنیادی اور اہم نکات ملتے ہیں جن سے قدیم ہندو تہذیب کو سمجھنا بہت آسان ہے۔ اس کتاب کا عمومی فایدہ یہ ہے کہ عوام میں جو اردو دان طبقہ ہے اسے ہندوستان کی مذہبی، سیاسی، سماجی ومعاشرتی اور اخلاقی قدریں بآسانی معلوم ہو جائیں گی۔ خاص طور پر ہندو مذہب، ان کی ثقافت سے واقفیت حاصل ہو جائے گی۔ کسی بھی مشترکہ تہذیب میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی تہذیب کو جاننے کے ساتھ ساتھ دیگر ہم عصر اور ہم جلیس تہذیبوں کا سنجیدگی اور رواداری سے نہ صرف مطالعہ کیا جائے بلکہ ان کی خوبیوں اور اچھائیوں کو بھی اجاگر کیا جائے۔ امید ہے یہ کتاب بہت حد تک اس امر کو پورا کرنے میں مدد کرے گی۔

ہندو احیائی تحریکیں اور شیخ محمد اکرام

شیخ محمد اکرام ۱۹۰۸ء-۱۹۷۳ء) نے ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کے دور میں جو رواداری اوران کی تہذیب وعلوم وفنون کی قدر کی اس پر تفصیل سے لکھا ہے۔

ہندوؤں کا مسلمانوں سے مشفقانہ برتاؤ

ابن بطوطہ کے حوالے سے شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے:

''جب ابن بطوطہ نے آٹھویں صدی ہجری میں کھنبائت سے چین کا سفر کیا۔تو اس نے مالابار کے ساحل پر جا بجا مسلمانوں کی معقول آبادیاں دیکھیں۔ضلع کاروار صوبہ بمبئی کی قدیم بندرگاہ ''ہونادر'' میں سلطان جمال الدین ایک ہندو راجہ کی طرف سے حکمراں تھے اوراس شہر میں کئی مسلمان عالم اوراسلامی مدارس موجود تھے۔منگلور میں مسلمانوں کی آبادی چار ہزار کے قریب تھی۔کالی کٹ کا راجہ ہندو تھا، لیکن سوداگروں اور تاجروں کا سردار مسلمان تھا اور بحری تجارت میں انہیں بڑا دخل تھا''۔[1]

معبر ایک ساحلی خطہ ہے۔اس کا وقوع مشرقی ساحل پر راس کماری کے شمال مشرق کی طرف کارومنڈل پر ہے۔ جسے معبر کہا جاتا ہے۔اس علاقے میں مسلمانوں کی قدیم بستیاں تھیں۔سب سے اہم اور پرانی بستی ''ٹنے ولی'' صوبہ مدراس کا شہر'' کیالا پٹم'' ہے۔کیالا پٹم کی آبادی گزیٹر کی رپورٹ کے مطابق تیرہ ہزار کے قریب تھی اوراس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔مشہور

[1] شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، ص: ۴۷

ہے کہ پانڈیا خاندان کے راجاؤں نے نو وارد عربوں کو چار میل لمبا اور ڈیڑھ میل چوڑا علاقہ دیا اور یہاں انھوں نے اپنی بستیاں آباد کیں۔ اور یہاں کی مقامی عورتوں سے شادیاں کیں اور آہستہ آہستہ اس علاقے میں کافی اثر حاصل کرلیا۔ نیز مسلمان ضلع ''ٹنے ولی'' کی کل آبادی کا چھ فی صدی ہیں اور تین تحصیلوں میں دس فی صدی ہیں۔ اس علاقے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات خوشگوار ہیں۔ پوٹن پودار (pottanpodar) کی مسجد کی نسبت لکھا ہے کہ وہاں ہندو زائرین کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ شیخ اکرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہاں کی مزارات کا ہندو احترام کرتے ہیں اور مسجدوں کے تبرکات بڑی شوق سے لیتے ہیں''۔[1]

مذکورہ شواہد و روایات کی روشنی میں یہ پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں جو مسلمان باہر سے آئے یا وہ یہیں کے رہنے والے تھے ان کے ساتھ ہندو راجاؤں نے نہ صرف حسن سلوک اور توازن و اعتدال کا رویہ اختیار کیا بلکہ انہیں رہنے سہنے اور اسلامی ثقافت کے عروج کے مواقع بھی عطا فرمائے۔ اس طرح ان کو تجارت کے مواقع بھی فراہم کئے۔ ان حقائق سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں دونوں قومیں باہم مل کر رہتی تھیں۔ افکار و عقائد اور تہذیب و ثقافت کے متغایر ہونے کے باوجود دونوں برادریوں کے خوشگوار تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ آج بھی ہمیں ضرورت ہے کہ ہم ماضی کی روشن و تابناک روایتوں کو فروغ دیں اور ملک میں ایسے خطوط متعین کریں جن سے باہم طبقات انسانی کے رشتے مستحکم ہوسکیں۔

محمد بن قاسم کا ہندوؤں کے ساتھ سلوک

محمد بن قاسم نے ہندوستان میں ۷۱۲ھ میں قدم رکھا اس پر عام طور سے یہ الزام ہے کہ اس نے سندھ کے ہندوؤں کے ساتھ برا سلوک کیا۔ اس طرح کی روایتیں بچ نامی وغیرہ میں ملتی ہیں۔ ان روایتوں کے متعلق اہل علم نے اطمینان کا اظہار نہیں کیا ہے۔ لہٰذا محمد بن قاسم پر ہندوؤں کے ساتھ زیادتی اور ظلم کا الزام لگانا مناسب نہیں ہے کیونکہ مورخین نے جو واقعات

[1] شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، ص: ۴۹-۵۰

درج کیے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے تمام طبقات کے ساتھ برابری کا رویہ اپنایا۔ اس بابت شیخ اکرام نے اپنی کتاب آب کوثر میں لکھا ہے:

''اہل سندھ سے بڑی نرمی کا برتاؤ کیا۔ جن لوگوں نے اطاعت قبول کر لی، انہیں کسی طرح تنگ نہیں کیا بلکہ ہر طرح امان دی۔ ہندوؤں کو وہ مراعات عطا کیں جو بعض فقہاء کے نزدیک اہل کتاب کے لیے مخصوص تھیں اور ایسے نظم ونسق کی بنیاد رکھی جو پہلے راجاؤں سے یقیناً بہتر تھا'' [1]

شیخ محمد اکرام نے داہر کے باپ راجہ چچ کے متعلق ایک اقتباس ڈاکٹر تاراچند کی معروف کتاب 'تاریخ اہل ہند' سے نقل کیا ہے:

''چچ ایک متعصب حاکم تھا۔ اس نے اپنی رعایا کے ایک حصے کے لیے سخت جابرانہ قوانین نافذ کیے۔ انہیں ہتھیار رکھنے، ریشمی کپڑے پہننے، گھوڑوں پر زین ڈال کر سوار ہونے کی ممانعت کر دی اور حکم دیا کہ وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر اور کتوں کو ساتھ لیکر چلا کریں۔ محمد بن قاسم کے متعلق وہ لکھتے ہیں، مسلمان فاتح نے مفتوحوں کے ساتھ عقلمندی اور فیاضی کا سلوک کیا۔ مال گزاری کا پرانا نظام قائم رہنے دیا۔ قدیمی ملازموں کو برقرار رکھا۔ ہندو پجاریوں اور برہمنوں کو اپنے مندروں میں پرستش کی اجازت دی اور ان پر فقط ایک خفیف سا محصول عائد کیا، جو آمدنی کے مطابق ادا کرنا پڑتا تھا۔ زمین داروں کو اجازت دی گئی کہ وہ برہمنوں اور مندروں کو قدیم ٹیکس دیتے رہیں۔ آگے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم نے پرانے نظام کو حتی الوسع تبدیل نہ کیا۔ راجا داہر کے وزیر اعظم کو وزارت پر برقرار رکھا اور اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے تمام نظام سلطنت ہندوؤں کے ہاتھ میں رہنے دیا۔ عرب فقط فوجی اور سپاہیانہ انتظام کے لیے تھے۔ مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ قاضی کرتے تھے، لیکن ہندوؤں کے لیے ان کی پنچایتیں بدستور قائم رہیں۔ محمد بن قاسم کی یہی رواداری اور

[1] شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، ص: ۲۵-۲۷

انصاف تھا جس کی وجہ سے اس کی مخالفت کم ہوئی۔ کئی شہروں نے خود بخود اطاعت قبول کر لی علامہ بلاذری نے تو فتوح البلدان میں یہاں تک لکھا ہے کہ جب محمد بن قاسم قید ہو کر عراق گیا تو ہندوستان کے لوگ روتے تھے اور کیرچ (علاقہ کچھ) کے لوگوں نے تو اس کا مجسمہ بنایا''۔[1]

محمد بن قاسم کے حسن سلوک اور توازن و اعتدال نے یقیناً وہاں کی ہندو رعایا پر مثبت اثر ڈالا۔ جس کی وجہ سے یہاں کی ہندو رعایا اس کے متوازی کارناموں کو پسند کرتی تھی۔ آج بھی اسی حسن سلوک اور مثبت کردار کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

بھگتی تحریک

لودھیوں کے دور حکومت (۱۳۲۱ء-۱۵۲۶ء) بھگتی تحریک کا ظہور ہوا اس تحریک کے متعلق شیخ محمد اکرام نے درج ذیل تفصیلات بہم پہنچائی ہیں:

'' ہندوستان میں کئی ایسے بزرگوں کا ظہور ہوا جنھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے عقائد کو ملانا چاہا۔ اور ایسے فرقوں کا آغاز کیا جن میں دونوں مذہبوں کے عقائد شامل تھے۔ ان بزرگوں میں کبیر سب سے پہلے تھے۔ جو ۱۴۴۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۱۸ء میں وفات پائی۔ تذکرہ اولیاء میں انہیں شیخ کبیر جولاہہ قدس سرہ لکھا ہے اور کہا ہے کہ یہ حضرت تقی سہروردی کے خلیفہ تھے اور تمام موحدان وقت سے ممتاز تھے۔ چند روز رامانند بیراگی کی خدمت میں رہ کر فن شاعری زبان ہندی میں حاصل کی۔ ہندی زبان میں پہلے معرفت انھوں نے بیان کی۔ ان کی تقلید گرونانک نے کی، کبیر صاحب نے بعد اس کے حضرت شیخ بھیکا چشتی کی خدمت میں رہ کر خلافت حاصل کی اور ہندو مسلمان دونوں گروہ آپ کے معتقد تھے۔ ہر ایک آپ کو اپنے میں شمار کر لیا کرتا تھا اور جو اہل ہنود آپ کے سلسلے کے ہیں وہ کبیر پنتھی کہلاتے ہیں۔ طریق ان کا اذکار و اشغال میں بالکل اہل اسلام کے مطابق ہے۔ مگر الفاظ کا فرق ہے''۔[2]

---

[1] شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، ص: ۲۵-۲۷ [2] ایضاً

ان چیزوں کی وجہ سے اسلام نے جو اثر ہندو عقائد پر کیا اس کا ذکر تاراچند کی کتاب 'تاریخ ہند' کے حوالے سے شیخ اکرام نے ایک اقتباس نقل کیا ہے:

''جنوب میں جہاں مسلمان پہلے بسے، ہندوؤں کے مذہبی و معاشرتی خیالات میں تبدیلیاں شنکر اچاریہ، شیو اور وشنومت کے سادھوؤں کی وجہ سے تھیں۔ رامانج نے ان کا خاص اسلوب ترتیب دیا۔ اور بھگتی تحریک کو اس کے فلسفے سے ایک بنیاد مل گئی۔ اس کے پیروؤں نے اس تحریک کو تمام ہندوستان میں پھیلا دیا۔ بھگتی یا پریم اور عبادت کا مذہب، جو آہستہ آہستہ شمال اور جنوب کے تمام ہندوؤں میں پھیل گیا۔ ایک لحاظ سے اپنشد اور بھاگوت گیتا کی تعلیمات پر مبنی تھا۔ لیکن ازمنہ وسطی میں اس کی مقبولیت اسلامی اثرات کی وجہ سے ہوئی۔ بھگتی تحریک کے پرانے پہلوؤں پر اسلامی اثرات کی وجہ سے زیادہ زور دیا جانے لگا اور کئی پہلو تو اسلام سے اخذ کیے گئے تھے''۔

اس کے علاوہ مولانا نجیب اشرف کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''اشاعت اسلام کا کام صوفیوں نے جو باہمہ و بے ہمہ کی زندہ مثال، وسیع المشرب آزاد خیال اور روادار ہوتے تھے، شروع کیا۔ ہندوؤں نے بھی اس رنگ کو اختیار کر لیا۔ رامانند، گرونانک، سوامی چیتنیا اسی قسم کے گرو تھے۔ انھوں نے نہ صرف ''ویدانتی توحید'' اور متصوفانہ ''فنافی اللہ'' کے اصول کو عام کر دیا۔ بلکہ اپنی برادری میں داخل ہونے کے لیے ہندو و مسلمان کی قید بھی اٹھا دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے معتقدین میں نہیں بلکہ خلفاء میں ہم کو مسلمان نظر آتے ہیں۔ کبیر پنتھی، داؤد پنتھی اس کی زندہ مثالیں ہیں''۔

اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لودھی دور حکومت میں رواداری اور باہمی رکھ رکھاؤ کا فروغ بڑی حد تک ہوا۔ تاہم بھگتی تحریک کے فلسفہ پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں اس

---

۱ شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، ص:

کے نظریاتی پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالنا نہایت درست ہوگا کہ ہندو مسلم اس حد تک معتدل تھے کہ ہندوؤں نے اپنے متصوفانہ اسلوب میں اسلامی تعلیمات کو بالکل رچا لیا تھا۔ اسی طرح یہ بات بھی نکل کر سامنے آتی ہے، جب اس حد تک اتحاد تھا تو دیگر معاشرتی اور تمدنی پہلوؤں میں بھی بہت حد تک یکسانیت ہوگی۔

اکبر کا نظام حکومت

اکبر نے زمام اقتدار ۱۵۵۶ء میں سنبھالا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ اکبر کے دور میں اسلام بہت کمزور ہوا اس کی مورخین نے متعدد وجوہات لکھی ہیں۔ البتہ اس نے نظام حکومت چلانے کے لیے صلح کل کا طریقہ اختیار کیا اس طریقے پر بھی بہت سے لوگوں نے تنقیدیں کی ہیں۔ ان تمام باتوں کو یہاں ترک کیا جا رہا ہے۔ البتہ اکبر کے اس نظام حکومت کے متعلق شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے:

> ''صلح کل جس کی جہانگیر نے اتنی تعریف کی ہے، اسلامی ہندوستان کی تاریخ میں بالکل نئی چیز نہ تھی۔ جہاں جہاں تک مختلف مذاہب کے ساتھ رواداری اور سب طبقوں کو حکومت میں حصہ دینے کا تعلق ہے، فاتح سندھ محمد بن قاسم نے اس پر پوری طرح عمل کیا۔ کشمیر میں سلطان زین العابدین کا عہد حکومت طریق صلح کل کے لیے یادگار ہے۔ فرق کمی اور بیشی کا تھا۔ بلاشبہ اکبر نے اسے بڑی وسعت دی اور اپنی حکومت کے آغاز سے اس پر عمل پیرا ہوا۔ پہلی راجپوت شہزادی سے شادی ۱۵۶۲ء میں ہوئی۔ راجا بھگوان داس اور راجا مان سنگھ کو اعلیٰ مناصب اس کے فوراً بعد ملے۔ جزیہ ۱۵۶۴ء میں برطرف ہوا۔ یاترا ٹیکس بھی اگلے سال موقوف ہو گیا۔ دربار میں اس وقت مخدوم الملک اور صدر الصدور کا زور تھا۔ لیکن ان کی طرف سے کسی مزاحمت کا بدایونی یا کسی اور مورخ نے ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ صلح کل کی پالیسی سے مسلمانوں کو نظام حکومت میں جو اہمیت حاصل تھی اس میں کسی قدر کمی ہوگئی اور ایک حد تک غیر مسلم بھی شریک

حکومت ہوگئے۔اس سے بعض پیچیدگیاں بڑھیں اور ہندوؤں نے اطراف ملک میں اسی پالیسی کا کس طرح ناجائز فایدہ اٹھایا۔لیکن چونکہ یہ اقدامات زیادہ تر سیاسی اور انتظامی تھے، مذہبی نہ تھے۔اور اسلامی ہندوستان کی تاریخ میں ،(مثلاً شیر شاہ سوری اور اس کے جانشینوں کے عہد میں) ہندوؤں کو اعلیٰ عہدے دیے جانے کی مثالیں مل جاتی ہیں۔اس لیے ان اقدامات کی مسلمان امراء یا علماء نے مخالفت نہ کی اور صلح کل کا طریقہ مغل نظام کا جزو ہوگیا، جو تغیر و تبدل کے ساتھ اکبر کے بعد بھی جاری رہا''۔[1]

یہ کہا جاسکتا ہے کہ اکبر کی پالیسی تمام رعایا کو ساتھ لے کر چلنے کی تھی، اس کا نظریہ تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کو بھی اعزاز اور مناصب جلیلہ پر فائز کیا جائے تا کہ عدل کا تقاضا پورا ہوسکے اور ملک میں کسی بھی طرح کی بدامنی فرو نہ ہونے پائے۔اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر نے صلح کل کا جو طریقہ اپنایا تھا وہ کوئی معیوب نہ تھا بلکہ شہادت وقرائن کی بات کریں تو پتہ چلتا ہے اس سے قبل بھی اس طرح کی چیزیں مل جاتی ہیں۔آج بھی ضرورت ہے کہ صاحب اقتدار اسی پالیسی کو اپنا نصب العین بنائیں تا کہ کسی کے ساتھ عدم رواداری اور نا انصافی نہ ہوسکے۔

ہندوؤں کی تہذیب وفنون سے دلچسپی

ہندوؤں کے علوم وفنون کے متعلق شیخ اکرام نے نہایت دلچسپ بحثیں کی ہیں انھوں نے لکھا ہے۔ ہندوؤں کی بہت ساری سنسکرت زبان کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا گیا اس بابت وہ تحریر کرتے ہیں:

''ہندوستان کی پہلی کتاب جس کا عربی میں ترجمہ ہوا، سدھانت تھی۔۷۷۱ء میں سندھ کے ایک وفد کے ساتھ اور ریاضیات کا ایک فاضل پنڈت یہ کتاب لے کر بغداد پہنچا اور خلیفہ کے حکم سے ایک عرب ریاضی دان نے اس کا عربی

[1] رود کوثر، ص۸۵-۸۶

میں ترجمہ کیا۔ یہ علم ہئیت میں تھی اور عربی میں السند ہند کے نام سے مشہور ہوئی۔ اسی طرح علم حساب میں بھی عرب ہندوستانیوں اور اہل مغرب عرب سے مستفید ہوئے۔ عربوں کا بیان ہے کہ انھوں نے حسابی رقم (ہندسے) لکھنے کا طریقہ ہندوؤں سے سیکھا۔ اس لیے وہ ہندسوں کو حساب ہند یا ارقام ہند یہ کہتے تھے۔ علم طب پر بھی کئی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں۔ جن میں سشرت اور چرک کی کتابیں بہت مشہور ہیں۔ حکمت ودانش کی بھی کئی سنسکرت کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا ان میں سے کلیلہ ودمنہ اور بوذاسف دبلوہر دنیا کی اہم ترین کتابوں میں سے ہیں۔ کلیلہ ودمنہ پنچ تنتر کا ترجمہ ہے۔ پہلے یہ کتاب سنسکرت سے فارسی میں ساسانیوں کے عہد حکومت میں منتقل ہوئی۔ پھر دوسری صدی ہجری میں عبداللہ بن المقفع نے اسے عربی میں ترجمہ کیا۔ اصل فارسی ترجمہ تو کھوگیا، لیکن عربی ترجمہ سلامت رہا۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ۔ یہ کتاب گوتم بدھ کی پیدائش، تربیت اور حکایات وتمثیلوں کے پیرائے میں سے دنیا کے سربستہ رازوں پر اس کی گفتگو کا بیان ہے۔ مذہبی حلقوں میں یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ عیسائیوں نے اس کو اپنے ایک مذہبی عالم سے منسوب کیا اور مسلمانوں کے ایک گروہ نے اسے اپنے امام کی تصنیف بتایا۔ رسائل اخوان الصفا میں جو چوتھی صدی کی نیم مذہبی ونیم فلسفیانہ تصنیف ہے۔ اس کتاب کے کئی ابواب ہیں۔ اس کے علاوہ عربوں نے بدھ مت کی کئی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ عرب مصنّفین (مثلاً ابن ندیم، الاشعری، شہرستانی) کی تصانیف میں ہندوستانی مذاہب اور فلسفہ کے متعلق مستقل ابواب ہیں۔ ان کے علاوہ اس زمانے کے اسلامی لٹریچر میں بدھ سادھوؤں اور یوگیوں کا ذکر بالوضاحت ملتا ہے''۔[1]

[1] آب کوثر، ص ۳۲-۳۵

ان تمام تاریخی دستاویزات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ تمام طبقات کے ساتھ برادرانہ برتاؤ کیا جاتا تھا۔ عام طور سے آج مسلم حکمرانوں پر یہ اعتراض عائد کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کے مخالف تھے۔ انھوں نے ہندوؤں کی سرکوبی کی۔ جب کہ حقائق اس کے برعکس ہیں۔ سچ یہ ہے کہ یہ اعتراض سیاسی ملغوبہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ کوئی بھی انصاف پسند مسلم حکمرانوں کے دور میں صادر ہونے والے واقعات کا تعصب کی عینک ہٹا کر مطالعہ کرے گا تو یقیناً وہ ضرور اس بات کا قائل ہوگا کہ مسلم حکمرانوں نے بڑی توسع اور رواداری کا مظاہرہ کیا۔ ان کی تہذیب، دین و دھرم اور زبان و ادب کے فروغ کے مواقع فراہم کیے۔ آج بھی اسی روایت کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔

ہندو احیائی تحریکیں

مغل سلطنت میں ایک تحریک ایسی رونما ہوئی جس نے بنگال کے مسلمانوں پر بہت اثر ڈالا۔ چیتنیہ تحریک یا وشنو تحریک، چیتنیہ کے متعلق شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے:

> ''اس کی پیدائش ۱۴۸۶ء کو ہوئی، اس نے بعد میں مسلمان پیروؤں سے مسئلہ توحید پر بحث کی۔ اس کے طریقے میں کئی چیزیں ایسی ہیں جن میں شاید صوفیا کے طریق کار کو دخل تھا۔ اس کے قریبی اور بااثر ساتھیوں میں کم از کم ایسے تھے جو فارسی اور عربی کے ماہر اور بنگال کے مسلمان بادشاہ کے دربار میں دو بڑی باعزت اسامیوں پر مامور تھے۔ روپ اور سناتن دو برہمن بھائی تھے۔ ویشنو تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ ان دو بھائیوں کی شہرت اکبر تک پہنچی اور اس نے ۱۵۷۳ء میں متھرا آ کر ان سے ملاقات کی۔ (گرچہ اکبر کی اس ملاقات کے سلسلے میں مورخین نے اختلاف کا اظہار کیا ہے) لیکن یہ بات درست ہے کہ بنگالہ کا مغل صوبے دار مان سنگھ ان کا بڑا معتقد تھا۔ اور سرجادوناتھ سرکار کہتے ہیں کہ چیتنیہ کی تحریک کو راجستھان کے راجپوت خاندان سے بڑی مدد ملی۔

بندرابن میں اس زمانہ میں جو سر بفلک مندر تعمیر ہوئے ان میں سب سے بڑا اپر شکوہ (گوبند جی کا مندر) مان سنگھ نے ایک کروڑ روپیہ کی لاگت سے تعمیر کرایا اور مندر کے ایک سنسکرت کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مندر ۱۵۹۰ء میں مہاراجا پرتھوی راج کی نسل کے راجا مان سنگھ نے اپنے گرو روپ اور سناتن کی زیر ہدایت تعمیر کرایا''۔[۱]

چیتنیہ کی تحریک کا مسلمانوں پر جو اثر ہوا اس کے متعلق شیخ اکرام نے لکھا ہے کہ:

''اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ تحریک بابا نانک کی تعلیمات کی طرح ہندو مذہب اور اسلام کو ملانے کی ایک کوشش تھی۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس تحریک کا مقصد کبیر مت یا ابتدائی سکھ مذہب کی طرح ہنود اور مسلمانوں کو ملانا نہیں تھا، بلکہ ہندو مذہب کا احیاء تھا اور اس مقصد میں یہ تحریک اس حد تک کامیاب ہوئی کہ نہ صرف بنگال میں اشاعت اسلام رک گئی، بلکہ بعض مسلمانوں نے ویشنو مذہب اختیار کر لیا اور عامۃ المسلمین اور وسطی اور شمالی بنگال کے ان پڑھ اور غریب مسلمانوں کے عقائد و اطوار میں ہندو طریقے داخل ہو گئے''۔[۲]

ویشنو تحریک کے متعلق شیخ اکرام نے یہ بھی لکھا ہے:

''اس تحریک کا مقصد فقط دفاعی نہیں بلکہ جارحانہ تھا۔ اس نے فقط ہندوؤں کو مسلمان ہونے سے نہیں روکا، بلکہ مسلمانوں میں ویشنومت کی اشاعت کی۔ اور اس میں اسے خاصی کامیابی ہوئی، چیتنیہ نے خود بعض مسلمانوں کو ارتداد کا راستہ دکھایا۔ اس کا ایک قریبی ساتھی ''ہری داس'' پہلے مسلمان تھا اور قاضیوں کے خاندان سے تھا۔ اسی طرح ''بجلی خان'' ایک افغان سورما اس کے ہاتھ پر

---

۱ رود کوثر ۴۹۴-۴۹۵

۲ ایضاً ۴۹۳

وشنو ہوا۔ شیامانند نے کثرت سے مسلمانوں میں پرچار کیا اور کامیاب رہا۔ اس نے اس مقصد کے لیے اقتصادی حربے بھی استعمال کیے اور راجا رائن گڑھ سے کہا کہ مسلمان مزدور جب تک اپنا مذہب ترک نہ کریں انہیں کام نہ دیا جائے۔ نچلی ذاتوں میں یہ سلسلہ بہت وسیع تھا۔

مسلمانوں کو پورا ویشنو بنانے کے علاوہ ویشنو طریقے کی کئی شاخیں ایسی شروع ہوئیں، جن کا مقصد مسلمانوں کو ویشنو سلسلے سے منسلک کرنا تھا ایک گروہ درویشی تھا جو سناتن سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ایک نہایت وسیع سلسلہ ''باؤل'' فقیروں کا تھا، جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ فرقہ تھا''۔[1]

اس تحریک کے متعلق مزید شیخ اکرام لکھتے ہیں ویشنو تحریک نے ادب کے ذریعہ بھی بنگالہ مسلمانوں کو متاثر کیا۔ ایک تو اس جاندار وسیع تحریک نے بنگالہ ہندوؤں میں نشاۃ ثانیہ کی کیفیت پیدا کر دی اور اب زندگی کے ہر شعبے میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر ہاتھ مارنا شروع کر دیا۔ دوسرے کرشن بھگتی کی شدید جذباتی کیفیت نے کثرت سے بااثر اشعار کا جامہ اختیار کیا۔ اس کا اثر مسلمانوں پر دو طرح ہوا۔ ایک تو اس نئے ادب نے بنگالہ زبان اور ادب کو ایک خاص رنگ دے دیا۔ جس نے بنگلی بننے اور سمجھنے والے مسلمانوں کو متاثر کیا۔ دوسرے کرشن بھگتی کے اشعار اس طرح مقبول ہو گئے کہ کئی مسلمانوں نے جو ویشنو نہ تھے، ان مضامین پر نظمیں لکھیں۔ بالآخر حالت یہاں تک پہنچی کہ چشم پیروں کی مجالس سماع میں بشن پد (وشنو گیت) گائے جاتے اور ان پر اہل حال وجد کرتے۔ اس زمانے کی ایک دلچسپ تصنیف ''مسائل الشیوخ'' ہے جو حضرت نور قطب عالم کے سلسلے کے ایک بزرگ، شاہ قطب الدین حقانی نے نویں صدی ہجری کے آخر میں مرتب کی۔ اس کتاب میں حضرت نور قطب عالم سے ایک روایت منسوب کی گئی ہے کہ جب ان کی محفل میں ''بشن پد'' دوسری نعتوں وغیرہ کے ساتھ گائے جاتے، اور کسی نے کرشن رادھا اور

[1] رود کوثر ۴۹۷

اس طرح ہندو ناموں پر اعتراض کیا تو جواب دیا گیا کہ قرآن مجید میں بھی فرعون، نمرود کے نام ہیں۔ اس روایت سے شیخ اکرام نے درج ذیل نتیجہ اخذ کیا ہے:

''حضرت قطب عالم سے اس روایت کا انتساب تو غالباً بشن پد کے جواز کے لیے ایک مستند اور مشہور بزرگ کے ارشاد ڈھونڈنے کا نتیجہ ہے۔ اتنا قرین قیاس ہے کہ جن بزرگوں نے یہ روایت اپنی کتاب میں درج کی ہے، ان کی مجلس میں کم از کم اس زمانہ کی صوفیہ مجالسِ میں بشن پد نعتوں اور قوالیوں کے ساتھ ساتھ پڑھے جاتے تھے''۔[1]

[1] رود کوثر، ص: ۴۹۷-۴۹۸

ہندوؤں کی کتب، عبادت اور عقیدہ تناسخ
ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے خیالات کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۱۹۰۸-۲۰۰۲) کی علمی و تحقیقی فتوحات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ انھوں نے قرآن و ترجمہ قرآن، فقہ و اصول فقہ، حدیث و تخریج حدیث، قانون بین الممالک اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ کے متنوع اور جدید جہات سے دنیائے علم و ادب کو واقف کرایا۔ یوں تو آپ نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کے تمام گوشوں اور نکات کو اجاگر کر دیا۔ نیز آپ کی تحریروں میں تشنگی کا شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا ہے۔ البتہ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کی جملہ تحقیقات اور علمی کاوشیں وقیع اور جامع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو مجدد سیرت جیسے القاب و آداب سے اصحاب علم و فضل یاد کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ آپ متعدد زبانوں کے ماہر تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی تصنیفات و تالیفات کئی زبانوں میں دستیاب ہیں۔ انگریزی، عربی اور اردو کے علاوہ فرنچ، جرمن، اطالوی، ترکی جیسی زبانوں پر بھی قدرت حاصل تھی۔ یہ ایک ایسا امتیاز ہے جو عموماً علماء کے یہاں نہیں پایا جاتا ہے۔ یہی شناخت اور آپ کا منفرد و جداگانہ تحقیقی شعور آپ کے علمی رتبہ و فضل کو بڑھاتا ہے۔ سیرت پر آپ کی معروف کتابیں محمد رسول اللہ، (یہ کتاب اصل فرنچ میں لکھی تھی لیکن اب اس کا اردو ترجمہ محمد رسول اللہ کے نام سے ہو گیا ہے) عہد نبوی کا نظام حکمرانی، عہد نبوی کے میدان جنگ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی اور الوثائق السیاسیۃ معروف و متداول ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر حمید اللہ نے قانون بین الممالک پر نہایت اہم کتاب تصنیف کی اور پہلی مرتبہ قانون بین الممالک جیسی اصطلاح سے دنیا کو متعارف کرایا۔ گویا آپ کی علمی و فکری جہات کے شعبے گوناگوں ہیں۔ آپ کی

تحریروں کی خصوصیت یہ ہے کہ زبان سلیس، سادہ، استعمال کرتے ہیں۔ لیکن تحریریں قاری کے دل و دماغ کو پوری طرح متوجہ کر لیتی ہیں۔ کتاب و تحریر کا ہر ہر لفظ تحقیق و تفتیش سے مملو نظر آتا ہے۔ جس موضوع کو اٹھا کر دیکھ لیجئے وہ اپنے آپ میں ایک دستاویز و سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر حمید اللہ کی تقابل ادیان خصوصا غیر سامی ادیان کے متعلق افکار کا مطالعہ مقصود ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیقات میں تقابل ادیان پر مستقل کوئی کتاب نہیں ہے۔ لیکن آپ نے متعدد کتب میں تقابل ادیان کے متعلق جگہ جگہ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً خطبات بھاول پور، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی، Introduction of Islam، تراجم قرآن وغیرہ میں کچھ بحثیں ملتی ہیں۔ اسی طرح جن حضرات نے ڈاکٹر حمید اللہ کی سیرت و سوانح پر گفتگو کی ہے انھوں نے بھی ڈاکٹر حمید اللہ کے مطالعہ ادیان کے گوشے کو تشنہ چھوڑا ہے۔ اس پر ایک مضمون راقم کی نظر سے گزرا ہے۔ ''ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا مطالعۂ ادیان و مذاہب''۔

تقابل ادیان کی طرف متوجہ ہونے کے اسباب

اگر آپ کی کتب اور جملہ تحریروں کو بغور دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ کی تحریری کاوشوں میں تقابل ادیان پر بڑی مفید بحثیں ملتی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مطالعۂ ادیان کی طرف آپ کی توجہ کیسے مبذول ہوئی؟ اس بابت یہ کہنا صحیح ہے کہ ایک تو آپ متعدد زبانوں کے ماہر تھے اس بناء پر دیگر تہذیبوں اور ان کا مذہبی و دینی لٹریچر نظر سے گزرا ہوگا اس لیے تقابل ادیان پر آپ نے اپنی کتابوں میں اظہار خیال کیا ہے۔ اسی طرح آپ مغربی تہذیب سے ایک زمانے تک وابستہ رہے۔ ان کی تہذیب ان کے عقائد و نظریات اور دین و مذہب کو جاننے کی کوشش کی۔ چنانچہ پروفیسر عبد القیوم قریشی نے خطبات بھاول پور کے تعارف میں (واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب ۲۰۰۱ء میں ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد سے شائع ہوئی ہے۔ اسی پر پروفیسر موصوف نے انتہائی اہم تعارف لکھا ہے۔) ڈاکٹر حمید اللہ کی تقابل ادیان میں دلچسپیوں کے محرکات و اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ڈاکٹر صاحب السنہ شرقیہ یعنی اردو فارسی، عربی اور ترکی کے علاوہ انگریزی،

فرانسیسی، جرمن، اطالوی وغیرہ زبانوں پر بھی عبور رکھتے ہیں۔اسی وجہ سے آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ چنانچہ مختلف اقوام وادیان کے تاریخی اور تقابلی مطالعے کی بدولت آپ کے مقالات اور تصانیف کا علمی وتحقیقی مرتبہ نہایت بلند ہے۔تبلیغ اسلام کے سلسلے میں آپ کو اسی لسانی مہارت سے بڑی مدد ملی''۔[1]

ڈاکٹر محمد عبداللہ اپنے ایک مقالے میں'' ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا مطالعہ ادیان و مذاہب'' میں تحریر کرتے ہیں:

''مغرب کے مسیحی پس منظر کے پیش نظر ڈاکٹر محمد حمید اللہ اپنی تصنیفات کے ذریعے اسلام اور دیگر مذاہب بالخصوص مسیحیت کا تقابلی جائزہ پیش کرتے رہے۔فرانس کے بعض اشاعتی اداروں نے مختلف دینیاتی و مذہبی مسائل پر ایسی کتب شائع کی ہیں جن میں مختلف مذاہب کے علماء کی تحریریں کہ جن میں مصنفین نے اپنے مذہب کا موقف پیش کیا ہے، شامل کی گئی ہیں۔محمد حمید اللہ ایسی متعدد کتب کے شریک مصنف ہیں۔ایسی ہی ایک کتاب حضرت ابراہیم علیہ السلام پر شائع ہوئی ہے۔تین ابواب پر مشتمل اس کتاب کا ایک باب ڈاکٹر صاحب کے قلم سے نکلا ہے۔ جب کہ بقیہ دو ابواب یہودی اور عیسائی علماء کے ہیں۔ اس باب میں انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت ورسالت اور ان کی دعوت تعلیمات کو اسلامی ماخذ کی روشنی میں اجاگر کیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحب اپنی علالت سے قبل مسیحی اور اسلامی ماخذ کی روشنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات بھی تصنیف کر رہے تھے۔ نیز ڈاکٹر صاحب دعوت اسلام کے سلسلے میں دیگر مذاہب خصوصا مسیحیت کے تقابلی مطالعہ پر بڑا زور دیتے تھے''۔[2]

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ کے اندر تقابل ادیان کے جو محرکات آئے، وہ

---

[1] خطبات بھاول پور صفحہ ۱۵

[2] ایضاً،

ان کی مغربی تہذیب میں رہائش اور متعدد زبانوں کے ماہر ہونے کی وجہ سے۔ چونکہ راقم کو ڈاکٹر حمید اللہ کے غیر سامی ادیان کا مطالعہ پیش کرنا ہے۔ سطور ذیل میں ان کو ملاحظہ کیجئے۔

مذاہب عالم کے مصلحین

اگر ڈاکٹر حمید اللہ کی تحریروں کا بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مطالعۂ ادیان کے حوالے سے نہایت دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی معروف کتاب introduction of Islam (واضح رہے کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ سید خالد جاوید مشہدی نے کیا ہے۔ اور یہ لاہور سے ۲۰۱۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔) میں مذاہب عالم کے مصلحین کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''انسانی تاریخ میں ایسی شخصیات کی کمی نہیں جنھوں نے اپنی زندگی اپنی قوموں کی سماجی اور مذہبی اصلاح کے لیے وقف کر دیں۔ ایسے افراد ہر دور اور ہر ملک میں موجود رہے ہیں۔ ہندوستان میں ویدوں کے تخلیق کار تھے وہاں گوتم بدھ بھی تھا۔ چین میں اس شخصیت کا نام کنفیوشس جب کہ ایران میں اویستا تھا۔ سرزمین بابل کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو جنم دیا جن کا شمار دنیا کے عظیم ترین مصلحین میں ہوتا ہے۔ اہل یہود اپنے پیغمبروں اور مصلحوں کی ایک طویل لڑی پر بجا طور پر نازاں ہیں ان میں موسیٰ، سیموئیل، داؤد، سلیمان اور عیسیٰ علیہ السلام کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں''۔[1]

البتہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان انبیاء پر نازل ہونے والے صحیفے اور کتب پوری طرح مسخ ہو چکی ہیں۔

ہندومت کی کتب

ڈاکٹر محمد حمید اللہ اپنی کتاب خطبات بھاول پور میں ہندومت کی کتب کے متعلق

---

[1] اسلام کیا ہے؟ صفحہ ۱۷

نہایت دلچسپ بات لکھتے ہیں:

''مجوسیوں کا مذہب زرتشت کی لائی ہوئی کتاب اوستا پر مبنی ہے۔ اوستا کے بارے میں کچھ معلومات ہیں۔ زرتشت کی کتاب اس وقت کی ژند زبان میں تھی کچھ عرصہ کے بعد ایران پر دوسری قوموں کا غلبہ ہوا اور نئے فاتحین کی زبان وہاں رائج ہوئی۔ پرانی زبان متروک ہوگئی نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں مٹھی بھر عالم اور متخصصین کے سوا ژند زبان جاننے والا کوئی نہ رہا۔ اس لیے زرتشتی مذہب کے علماء نے نئی زبان پاژند میں اس کتاب کا خلاصہ اور شرح لکھی۔ آج کل ہمارے پاس اس نسخے کا صرف دسواں حصہ موجود ہے۔ باقی غائب ہو چکا ہے۔ اس دسویں حصے میں بھی کچھ چیزیں عبادات کے متعلق ہیں اور کچھ دیگر احکام ہیں۔ بہر حال دنیا کی ایک اہم کتاب کو اوستا کے نام سے جانتے ہیں لیکن وہ مکمل حالت میں ہم تک نہیں پہنچ سکی'' ۔[1]

اس کے بعد ہندومت کی کتب کے متعلق لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں بھی کچھ دینی کتابیں پائی جاتی ہیں اور ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے الہام شدہ ہیں۔ ان مقدس کتابوں میں وید، پران، اپنشد اور دوسری کتابیں شامل ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ سب کتابیں ایک ہی نبی پر نازل ہوئی ہیں۔ ممکن ہے متعدد نبیوں پر نازل ہوئی ہوں۔ بشرطیکہ وہ نبی ہوں۔ ان میں خصوصاً پران نامی کتابوں میں کچھ دلچسپ اشارے ملتے ہیں۔ پران وہی لفظ ہے جو اردو میں پرانا قدیم ہے۔ اس کی طرف قرآن مجید میں ایک عجیب وغریب اشارہ ملتا ہے۔ وانہ لفی زبر الاولین۔ اس چیز کا پرانے لوگوں کی کتابوں میں ذکر ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا پران سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ بہر حال دس پران ہیں ان میں بھی آخری نبی کے بارے میں پیشین گوئی موجود ہے'' ۔[2]

---

[1] خطبات بھاول پور، صفحہ ۲ [2] ایضاً، ص: ۳

ان شواہد کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے ہندومت کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا تبھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہندوؤں کا صرف ویدوں کے متعلق یہ دعویٰ ہے کہ وہ الہامی ہیں۔ بقیہ کتابوں پر ان کا اس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ کا یہ کہنا کہ وید کے علاوہ اپنشد اور پران کے متعلق بھی ہندوؤں کا دعویٰ الہامی ہونے کا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر حمید اللہ کا یہ درست خیال نہیں ہے۔ البتہ یہ ان کا اپنا نظریہ ہے۔ اس سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے دیگر مذاہب کی کتب کے متعلق روادارانہ اور معتدل رویہ اپنایا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

> ''اگر میں کسی یہودی یا کسی عیسائی کو یہ کہوں کہ تیرا مذہب جھوٹا ہے، تیری نجات کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ تو اسلام قبول کرے، تیرے پاس جو کتابیں ہیں وہ لغو اور جلا دینے کے قابل ہیں، تو اسے دکھ ہوگا اور غالباً وہ جوش غضب سے اس قدر مغلوب ہو جائے گا کہ اسلام کی حقانیت کے بارے میں میری کوئی بات سننے یا ماننے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر اسے یہ کہوں کہ تمہارا دین بھی سچا ہے، تمہارے ہاں کی کتاب بھی سچی ہے، وہ اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب ہے اور وہی اللہ جس نے تمہیں یہ کتاب دی اس نے ایک آخری کتاب بھی بھیجی ہے، تم اس کو پڑھو اور غور کر کے دیکھو کہ اس میں کیا بیان ہوا ہے، وہ نسبتاً زیادہ خوش دلی کے ساتھ پڑھنے اور غور کرنے کے لیے تیار ہوگا۔ اسی طرح اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان لانے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس میں بھی وہی فراخ دلی، وسیع القلبی، تحمل رواداری کا پہلو نظر آتا ہے''۔[1]

یقیناً موصوف کی اس بات سے مکمل اتفاق ہے کہ آج ہمارے رویہ میں اعتدال و میانہ روی سے زیادہ ترشی، تلخی اور مصلحت و موقع شناسی یکا یک مفقود ہو چکی ہے۔ جب کہ وقت اور حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہم فراخ دلی اور وسیع القلبی کا عملی مظاہرہ کریں۔

---

[1] خطبات بھاول پور، صفحہ ۱۶۱-۱۶۲

عبادت کا تصور

یہ سچ ہے کہ دنیا کی ہر دین وتہذیب میں عبادت کا تصور پایا جاتا ہے۔ عبادت کرنے کے اپنے اپنے طریقے ہیں۔ اسی اعتبار سے وہ اپنی اس مذہبی رسم کی ادائیگی کرتے ہیں چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ نے غیر سامی ادیان میں عبادت کے متعلق بھی لکھا ہے:

''ہندوستان میں جب آریہ آئے تو انھوں نے اپنی زرعی معیشت میں گائے کو سب سے زیادہ مفید اور منفعت بخش پایا، تو خدا کی اس سب سے بڑی نعمت کے گن گانے لگے اور خدا کی نعمتوں کی سب سے بڑی علامت کے طور پر اس کا احترام کرنے لگے۔ اللہ ایک منعم ہے۔ لہٰذا اس کا شکر ادا کرنے کے لیے وہ اس کی سب سے اچھی عمر کی تعریف کرتے ہیں اور اس کا ادب کرتے ہیں یوں بالواسطہ وہ اللہ کا ادب کرنا چاہتے ہیں اور اللہ کی تعریف کرنا چاہتے ہیں''۔[1]

روزہ کا مفہوم ہندوؤں میں بھی پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے:

''ہندوؤں کے یہاں روزہ ہے۔ لیکن زمانہ اور تعداد زیادہ معین نہیں۔ اور لزوم بھی کم ہے۔ بانیان مذہب کی تاریخ پیدائش اور سورج گرہن اور چاند گرہن جیسے اثر انداز کرشمہ ہائے قدرت کے موقعوں پر دین دار لوگ روزہ رکھتے ہیں۔ اور سہ پہر کے تقریباً تین بجے افطار کر لیتے ہیں''۔[2]

اسی طرح حج کے متعلق گویا ہیں:

''دوسری قوموں کا حج یا تو اپنے کسی بزرگ، کسی ولی کسی بانی مذہب کی زیارت کرنا ہے۔ یا مظاہر قدرت اور عجائبات میں سے کسی بہت عجیب چیز کی زیارت کرنا ہے۔ چنانچہ ہندو دریائے گنگا کے منبع کی زیارت کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس میں بڑا ثواب ہے۔ دریائے گنگا اور جمنا کا سنگم الٰہ آباد کے مقام پر

---

[1] خطبات بھاول پور، صفحہ ۱۷۳

[2] ایضاً، ص: ۱۷۷

ہے۔اس کی زیارت میں بڑا ثواب سمجھتے ہیں''۔[1]

تناسخ ارواح کا مفہوم

ہر مذہب کے یہاں دوزخ اور جنت کا تصور پایا جاتا ہے۔یعنی اگر کوئی شخص دنیا میں اچھے عمل کرے گا تو اس کو اس دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد اجر عطا کیا جائے گا۔اگر کوئی فرد بدی اور کریہ چیزوں میں لت پت رہے گا تو اس کو اسی طرح کا بدلہ ملے گا۔ہندومت میں بھی اس بابت نظریہ ملتا ہے۔اس نظریہ کو ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب 'خطبات بھاول پور' میں بیان کیا ہے:

> ''ہندوؤں اور بدھ مت والوں کا تصور اس کے بارے میں کچھ اور ہے۔یہ دلچسپ ضرور ہے لیکن ظاہر ہے کہ اسے مسلمان قبول نہیں کر سکتے۔وہ کہتے ہیں کہ کائنات کا وجود ازل سے ابد تک صرف اتنا ہی ہے جتنا ایک بلبلے کا وجود، جو دریا میں موج تلاطم سے پانی کی سطح سے اچھل پڑتا ہے پھر آن کی آن میں دوبارہ گر کر دریا کے پانی میں غائب ہوجاتا ہے۔انسان کی ہستی بھی اس کائنات کے محض ایک جزو کی ہے۔اسی طرح ان کا تصور تناسخ یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی اچھا کام کرے تو اسے جزا ملے گی۔اور اگر برا کام کرے گا تو سزا ملے گی۔ہندوؤں کے عقائد کے مطابق یہ ہے کہ وہ سزا اس برائی کی نوعیت کے مطابق ہوگی۔اگر اس نے تھوڑی برائی کی ہے۔مثلاً وہ بادشاہ ہے تو مرنے کے بعد غلام کے طور پر پیدا ہوگا۔اگر اس نے اس سے بھی زیادہ برائی کی ہے تو وہ مرنے کے بعد کتا یا بلی بن جائے گا۔اس کی برائی اگر اس سے بھی زیادہ ہے تو وہ درخت بنے گا۔اس سے بھی بڑی برائی ہے تو وہ پتھر بن جائے گا۔جمادات، نباتات، حیوانات یہ سب ارتقاء کی مدارج ہیں۔اسی لحاظ سے وہ کہتے ہیں کہ اگر کسی کو پتھر بننے کی سزا دی گئی تو اس پتھر کو ارتقاء کے ذریعے سے صدیوں کی

---

[1] خطبات بھاول پور، صفحہ ۱۷۶-۱۷۷

مدت کے بعد درخت کا موقع ملے گا۔ اگر درخت اپنی مدت حیات میں مفید کام کرتا ہے تو اس درخت کو صدیوں بعد جانور بننے کا موقع ملے گا۔ اگر شودر کی حیثیت سے انسان اچھے کام کرتا رہے اور فرائض انجام دیتا رہے تو وہ مرنے کے بعد ویش بنے گا۔ اس کے بعد کھشتری بنے گا۔ اس کے بعد برہمن بنے گا۔ اگر برہمن کی حیثیت سے اپنی زندگی اچھی گزاری تو مرنے کے بعد خدا کی ذات میں ضم ہو جائے گا۔ جس طرح کہ وہ بلبلہ پانی میں دوبارہ گرا اور پانی بن گیا، برہمن دوبارہ خدا بن جائے گا۔ اگر برہمن نے زندگی برائی کے ساتھ گزاری تو اسے وہی سزا ملے گی اور یہ ان کا آواگون یا تناسخ کا تصور ہے''۔[1]

بدھ مت کا ذکر قرآن میں ہے؟

ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب خطبات بھاول پور میں ایک انتہائی اہم مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

''قرآن مجید میں ایک ایسے پیغمبر کا بھی ذکر آیا جسے ہم ہندوستان سے متعلق کہہ سکتے ہیں۔ ان کے متعلق قرآن و حدیث میں تفصیلی صراحت موجود نہیں ہے بعض محدثین و مفسرین نے اس سلسلے میں اگر چہ لکھا ہے۔ لیکن وہ قابل اعتماد نہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کے استاد مولانا مناظر احسن گیلانی کفل کہتے تھے غالباً اس سے مراد گوتم بدھ ہے اس کی وجہ وہ یہ بتاتے تھے کہ ذوالکفل کے لفظی معنی کفل والے کے ہیں۔ اور کفل ''کپل وستو'' کی معرب شکل ہے یہ بنارس کے قریب ایک شہر ہے۔ جس میں گوتم بدھ پیدا ہوئے تھے اس کی مزید تائید کے لیے وہ سورہ التین کی آیات ۱ تا ۳ کی طرف اشارہ فرماتے تھے جس میں تمام مفسرین کے خیال میں چار پیغمبروں کا ذکر آیا ہے زیتون سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے، سینا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی

[1] خطبات بھاول پور، صفحہ ۱۶۸-۱۶۹

طرف، بلد الامین سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف۔ والتین کیا ہے؟ بعض لوگوں نے کہا کہ اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے نبیوں کی زندگیوں میں انجیر کو کوئی اہمیت نہیں رہی جب کہ مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے تھے کہ گوتم بدھ کے ماننے والوں کا متفقہ بیان ہے کہ گوتم بدھ کو جنگلی انجیر کے نیچے نروان حاصل ہوا تھا۔ اس سے وہ استنباط کرتے تھے کہ قرآن مجید میں جہاں دنیا کے بڑے مذاہب کا ذکر ہے وہاں بدھ مت کا بھی ذکر ایک بہت لطیف انداز میں کر دیا گیا ہے۔ گوتم بدھ کے حالات چونکہ عربوں کو تفصیل سے معلوم نہیں تھے لہٰذا اس پر زور نہیں دیا گیا''۔[1]

اس اقتباس کے ذیل میں یہ کہنا ہے کہ یہ ڈاکٹر حمید اللہ کی اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی اپنی ذاتی رائے ہے۔ اہل علم کو اس سے اختلاف کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ میری خواہش ہے اس پر مزید تحقیق آنی چاہئے۔ اگر کوئی اہل علم اس سلسلے کو آگے بڑھائیں تو بڑی نوازش ہوگی۔

خوش آئند اقدام

ڈاکٹر حمید اللہ نے تقابل ادیان اور تہذیبی تنوع پر کئی اہم مقالے بھی لکھے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا کہ انہیں ادیان و مذاہب اور اقوام کے رسوم و رواج اور تہذیبوں کے متعلق کافی گرفت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں تقابل ادیان جیسی علمی بحثیں گاہ بگاہ مل جاتی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے فرانسیسی ترجمہ قرآن میں بھی مذاہبِ عالم سے متعلق بڑی دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر حمید اللہ نے اُردو زبان کے ہندو شاعر پنڈت جگن ناتھ آزاد کی نعتیہ شاعری کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے۔ جو Hommage a Mahomet کے نام سے معروف ہے۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۹۹۰ء میں ہوئی ہے۔ اس سے

[1] خطبات بھاول پور، صفحہ ۲۷۵-۲۷۶

انھوں نے یہ پیغام دیا ہے کہ صرف مذہبی اہل علم یعنی مسلمانوں نے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف نہیں کرتے ہیں بلکہ ہندوؤں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نعت وتوصیف پیش کی ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کے افکار کی افادیت

مذکورہ مباحث کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے مطالعۂ ادیان کے حوالے سے جو معلومات فراہم کی ہیں ان میں اعتدال اور بلا کا توازن پایا جاتا ہے۔ یقیناً ان سے قومی ہم آہنگی کو فروغ ملے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے مذکورہ بالا افکار علمی نقطۂ نظر سے اہم ہیں، وہیں ان کی افادیت ومعنویت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ غیر سامی ادیان پر محمد حمید اللہ کی جو آراء پیش کی گئی ہیں وہ اہل علم و فکر اور مطالعہ ادیان کے ماہرین کو کئی اعتبار سے غور وفکر کے پہلو فراہم کرتی ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ حمید اللہ کے ان علمی نکات کا از سر نو جائزہ لیا جائے اور معاشرے میں اس کی افادیت کو بیان کیا جائے۔ ہوسکتا ہے ان آراء پر کسی کو اتفاق نہ ہو مگر علمی سنجیدگی اور روایت کو فروغ دینے کے لیے ایک بار پھر سنجیدہ بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

مذہبی تکثیریت کی افادیت
پروفیسر اختر الواسع کی تحریروں کے تناظر میں

ہندوستان مذہبی، لسانی اور تہذیبی تنوع کے لیے پوری دنیا میں اپنی منفرد اور امتیازی شناخت رکھتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بھارت کی دینی و ثقافتی تکثیریت کے نمایاں خدوخال ہمارے کھانے پینے، رہنے سہنے، شادی بیاہ کی رسم و رواج اور لباس سے جگ ظاہر ہیں۔ ہمارے اس مشترکہ اور قومی ورثہ کی روایات سال دو سال پر محیط نہیں ہیں، بلکہ ان کی صدیوں پرانی تاریخ ہے، جو ہمارے سماج میں اس قدر پیوست ہو چکی ہیں کہ اب ان کو نظر انداز کرنا ناممکن ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندو مسلم ثقافت و تہذیب اور یہاں کی مشترکہ سماجی اقدار کے بغیر ایک مکمل بھارت کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی ان تعدد پسند روایات کو پروان چڑھانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا برابر کا حصہ ہے۔ ایک طرف ہمیں مہاتما گاندھی نظر آتے ہیں تو دوسری طرف سرسید، مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت امیر خسرو وغیرہ وغیرہ۔ اگر ہم ان کی تحریروں، کتابوں اور مضامین کو پڑھتے ہیں تو مذہبی تکثیریت کے عناصر صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ آزادی کے بعد اگر ہم ان شخصیات کی تلاش کریں جنھوں نے اپنے خطبات، افکار، اور تحریروں کے توسل سے ہندوستان کی یکجہتی، مشترکہ اقدار، ثقافتی تنوع اور جمہوری و سیکولر قدروں کو جلا بخشنے کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم اتحاد و سالمیت کو یقینی بنایا ہے تو ہم بلاشبہ نامور اسلامی اسکالر پدم شری پروفیسر اختر الواسع کا نام جلی حروف سے لکھ سکتے ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع جہاں اسلامیات کے ماہر ہیں تو وہیں ان کی نگاہ ہندوستانی سماج اور اس میں پائی جانے والی تہذیبوں و تمدنوں پر بھی بڑی گہری ہے۔ مذہبی تکثیریت کا تحفظ، سماجی ہم آہنگی اور رواداری کے فروغ میں

آنجناب کا قلم ہر دور اور وقت رواں دواں نظر آتا ہے۔ وہ متوازن اور معتدل سوچ کے علمبردار ہیں۔ انیکتا میں ایکتا پر ان کا یقین ہے۔ اسی فکر اور روایت کی وہ ترویج واشاعت کرنے اور بھارت جیسی سرزمین پر پرامن بقائے باہمی کے مکمل حامی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ بین مذہبی افہام وتفہیم، مذاکرات اور ہندوستانی اقدار کے سچے امین و پاسبان اور شناور دیکھنا ہے تو پروفیسر اختر الواسع کو بحسن وخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کی تحریروں میں حب الوطنی، انسان دوستی، قومی یکجہتی اور تعدد وتکثیریت کے عناصر واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ لہٰذا اس مضمون میں پروفیسر اختر الواسع کے مذہبی تکثیریت پر مبنی افکار پر روشنی ڈالی جائے گی۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ اس وقت جس طرح سے روادارانہ سوچ اور بھارت کی مشترکہ ثقافت کو دھندلا کیا جارہا ہے وہ نہایت شرمناک بھی ہے اور افسوسناک بھی۔ نیز اس کے اثرات یقیناً مایوس کن ہوتے جارہے ہیں۔ اس لیے ملت اسی وقت محفوظ رہے گی جب کہ بھارت اپنی تمام تر روایات کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے گا۔ پروفیسر اختر الواسع کی شخصیت اس تناظر میں بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ انھوں نے ہندوستانی مذاہب وادیان کے ساتھ ساتھ یہاں کی مشترکہ ثقافت پر متواتر عالمانہ اور دانشمندانہ گفتگو کرتے رہے ہیں۔

مذاکرات کی ضرورت

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ مذاکرات ومکالمات عہد حاضر کی ناگزیر ضرورت ہے۔ آج ہر طرف اس حوالے سے مضامین لکھے جارہے ہیں۔ کتابیں تصنیف کی جارہی ہیں۔ سیمینار کانفرنسیز کا انعقاد کیا جارہا ہے۔ تاہم مذاکرات سے جہاں غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں، دوریاں ختم ہوتی ہیں، وہیں باہم احترام وتوقیر کی راہ بھی ہموار ہوتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ دوسرے ادیان یا دیگر اقوام کے متعلق بہت ساری غلط فہمیاں صرف سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر پال لی جاتی ہیں۔ پھر یہ قوموں اور معاشروں کے سماجی رشتوں، باہمی خوشگوار تعلقات اور انسان دوستی جیسے مراسم کو نابود کر ڈالتی ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ باہمی رشتوں کا احترام رکھا جائے تو پھر اس کے لیے ہمیں مذاکرات کی اہمیت کو سمجھنا ہوگا اور ہمیں دیگر مذاہب کے حاملین کے ساتھ سیاسی، سماجی اور دینی

مکالمات کرنے ہونگے۔ یقیناً یہ وہ راستہ ہے جو ہندوستان کی تکثیری روایات اور مذہبی تنوع کو وجود بخشے گا۔ چنانچہ پروفیسر اختر الواسع نے اپنی تحریروں میں مذاکرات ومکالمات کے متعلق جو گرانقدر سرمایہ ثبت کیا ہے اس کی افادیت سے قطعی روگردانی نہیں کی جاسکتی ہے۔ پروفیسر واسع کا نظریہ اس حوالے سے نہایت واضح ہے وہ چاہتے ہیں کہ موجودہ تناظر میں ڈائیلاگ کا نظم ہو اور یہ مکالمہ برادران وطن سے کیا جائے تاکہ ہمارے رشتے میں جو چیزیں سدراہ ہورہی ہیں ان کا قلع قمع کیا جاسکے۔ وہ اپنے ایک مطبوعہ مضمون (جو کہ روزنامہ انقلاب میں ۰۳/۰۴/۲۰۲۲ء کو شائع ہوا، مضمون کا عنوان ہے ''شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات'' میں رقم طراز ہیں:

> ''مسلمانوں کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ وہ برادران وطن سے ایک سرگرم، مثبت اور حکمت پر مبنی مکالمہ کا آغاز کریں اور خاص طور پر جو اکثریتی طبقے کے مذہبی رہنما ہیں ان سے رابطہ کریں۔ رشتہ بنائیں اور دوریوں کو کم کرنے، غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کریں جو کہ آج اکثریت کو خوف کی نفسیات اور مسلمانوں کو جارحانہ مدافعت پر مجبور کررہی ہیں۔ جب ہم نے یہ بات لکھی تو اس کے پیچھے ہندوستان میں مسلمانوں کا وہ ہزار سال سے زیادہ کا تاریخی پس منظر تھا جس میں ہندوستان سے رشتے بنائے اور یہاں پر اپنے لیے جگہ بنانے کے واسطے مسلمانوں نے سب سے پہلے شعوری طور پر اس ملک کو جاننے، سمجھنے اور یہاں کی مذہبی اور سماجی تعلیمات اور ڈھانچے کو خاص طور سے جاننے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی کوشش تو 'بچ نامہ' ہے۔ اس کے بعد ابوریحان البیرونی کی 'کتاب الہند' ہے۔ البیرونی نے اس ملک کے مذہب، روایات اور سماجی زندگی کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، زبان سیکھی، برہمنوں کے ساتھ وقت گزارا اور ان کے ذریعے ہندوستان کو سمجھ کر اپنی مایہ ناز تصنیف 'کتاب الہند' کے ذریعہ دنیا کو ہندوستان سے روشناس کرایا۔ یہ ایک عجیب ستم ظریفی ہے کہ ہم ہندوستان شناسی کے لیے جرمن مستشرق میکس مولر کے سرسہرا باندھتے ہیں جب کہ درحقیقت ہندوستان کو دنیا سے متعارف کرانے

والا 'البیرونی' تھا۔ عہد اکبری میں ہندوؤں کی مقدس کتابوں راماین اور مہابھارت کے ترجمے ہوئے۔ بعد میں اسی روایت کی توسیع کرتے ہوئے محسن فانی جو شاہ جہاں کا درباری تھا، نے 'دبستان مذاہب' لکھ کر اکثر مذاہب کے بارے میں عام لوگوں کو واقف کرانے کے لیے اس کتاب کی تالیف کی۔ اس کے بعد داراشکوہ نے ہند اسلامی مذاہب کے مطالعہ کو ایک نئی سمت اور رفتار عطا کی، سر اکبر ہو یا مجمع البحرین، آج بھی ہندومت اور اسلام میں مماثلتیں تلاش کرنی ہوں تو داراشکوہ کی خوشہ چینی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ جب انگریزوں کا دور آیا تو سرسید احمد خاں نے بائبل کی تفسیر، تبیین الکلام، کے نام سے لکھی اور غیر مسلموں کے ساتھ آداب طعام پر رسالہ لکھ کر مذہبی ہم آہنگی اور سماجی رشتوں کو مضبوط بنانے کی کوشش کی۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر قرآن بعنوان 'ترجمان القرآن' پہلی جلد میں صرف سورہ فاتحہ کی وہ معرکۃ الآراء تفسیر لکھی جس میں وحدت الہ، وحدتِ آدم اور وحدت دین کی اسلامی روح کو اپنے قلم سے زندہ کر دیا اور آج بھی وہ اسلام کی توحید پرستی اور انسان دوستی کا آفاقی بیان ہے''۔[1]

اس اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے اکابر نے مذاکرات ومکالمات کے حوالے سے جو عملی، علمی اور تاریخی کاوشیں کی ہیں ان کو تاریخ کا روشن باب کہا جاسکتا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ ہم اس سلسلہ کو آگے بڑھائیں اور مثبت خطوط پر افہام وتفہیم کی راہ ہموار کریں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ پروفیسر اختر الواسع نے اپنے اس مضمون میں جو علمی وتحقیقی گفتگو کی ہے اس سے بھی ہمیں تقویت ملتی ہے کہ ہم اس جانب کوئی ایسا طریقہ مرتب کریں جس کی روشنی سے ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی غلط فہمیاں زائل ہوسکیں۔ گویا مذاکرات کے جواز اور دیگر قوموں سے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے لیے اسلامی مصادر میں بھی بڑے نمایاں اور بین ثبوت ملتے ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع بھی اپنے اس مضمون سے یہی پیغام دینا

[1] انقلاب میں شائع شدہ مضمون، شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات، سے ماخوذ

چاہتے ہیں کہ مکالمات مسلمانوں کی تاریخ اور تہذیب دونوں کا حصہ رہا ہے بالآخر اب اس معاملے میں کیوں سستی اور تساہلی برتی جارہی ہے۔

اسی طرح اس روایت کو مزید تقویت دیتے ہوئے پروفیسر واسع نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی فیکلٹی دینیات میں ہونے والی عالمی کانفرنس جو کہ ۲۶-۲۷ / جون ۲۰۰۱ء میں ''آسمانی کتب اور دیگر مذہبی کتابیں: تاریخ و تعارف'' کے عنوان سے منعقد ہوئی تھی۔ اس ویبینار میں پروفیسر اختر الواسع نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی تھی، اس موقع پر جو پرمغز اور قیمتی خطبہ ارشاد فرمایا تھا وہ ہندوستان کی سماجی قدروں کو ہم آہنگ کرنے اور بقائے باہم کے اصولوں کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہیں تقابل ادیان، مطالعۂ ادیان اور مذاکرات و مکالمات کے حوالے سے جو گراں قدر گفتگو کی تھی وہ ہندوستان کی تکثیری روایت کی امین ہے۔ اس خطبہ کا ایک اقتباس ذیل میں پیش ہے۔

> ''میں ہمیشہ اس بات کا حامی رہا ہوں کہ ہم صرف کلمہ طیبہ پڑھ کر ہی مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہم اللہ کی توحید و کبریائی اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری رسول کی حیثیت سے تائید و توثیق نہ کریں، ان پر ایمان نہ لائیں اور ایسا کرتے ہی ہم فوراً ایمان مفصل پر اپنے اس ایمان و یقین کا اعلان نہ کریں جو اللہ اور اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ہونا لازمی ہے۔ قرآن کے لفظوں میں ''ہم صرف ان رسولوں پر ایمان ہی نہیں لاتے بلکہ ان میں سے کسی میں فرق بھی نہیں کرتے'' میری نظر میں اس ویبینار کا علی گڑھ میں ہونا غیر فطری نہیں تھا۔ اس لیے کہ عہد اکبری میں رامائن اور مہابھارت کے جو فارسی تراجم ہوئے تھے ان کو سب سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پبلی کیشن ڈویژن نے شائع کیا۔ اسی طرح سرسید نے قرآن کے علاوہ انجیل کی بھی تفسیر لکھی''۔[1]

پروفیسر اختر الواسع اپنے متذکرہ مضمون (شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات،

---

[1] علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی فیکلٹی دینیات میں عالمی ویبینار کے موقع پر پیش کیے گئے خطبہ سے ماخوذ

شائع شدہ انقلاب میں باہمی اتحاد و اتفاق اور یگانگت و ہمدردی ہندوستان کی برادریوں میں کیسے آگے بڑھے اس حوالے لکھتے ہیں:

''صوفیاء کرام نے جس طرح اخوت ومساوات کے اسلامی پیغام کو عام کیا اور عمومی طور پر اس کو ممکن کر دکھایا۔ اس کے نتیجہ میں اس ملک کی غالب ترین اکثریت اور مسلمانوں میں وہ باہمی خیر سگالی کا ماحول پیدا ہوا جس نے نہ صرف ایک نئی زبان اُردو کو جنم دیا اور پروان چڑھایا بلکہ اپنی خانقاہوں کے دروازے بلاتخصیص مذہب وملت سب کے لیے کھول کر جبر کے ماحول میں صبر کا راستہ دکھایا۔ ان کے دکھ درد کو بانٹا اور ان کی بھوک اور پیاس کو مٹانے کے لیے لنگر کی روایت کو قائم کیا۔ ہندوستان کی مقامی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے مقامی لوگوں کی روایات کو فروغ دیا، ان کی خوشیوں اور غم دونوں میں ان کے ساتھ کھڑے ہوئے اور اسی طرح اپنی خاکساری، تواضع اور ملنساری کو عام کر دیا۔ آج بھی ہماری درگاہوں پر اجمیر سے دہلی، پانی پت سے گلبرگہ، بہار شریف سے کچھوچھہ، تلنگانہ سے تمل ناڈو، کشمیر سے ممبی غرض پورے ہندوستان میں اس ملک کی غالب ترین اکثریت کس طرح فرطِ عقیدت کے ساتھ مزارات پر حاضری دیتے ہیں۔ اس لیے ہمیں سوچنا چاہیے کہ کہیں نہ کہیں ہم سے کوئی ایسی کمی واقع ہوئی ہے کہ جو ہمارے مردوں کی تعظیم کرتے ہیں وہ ہم سے کیوں بیزار ہیں؟'' [1]

یعنی مسلمان علماء نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے توسل سے جو رشتہ غیر مسلم عوام یعنی ہندوستان کی دیگر قوموں سے استوار کیا تھا وہ اب ہمارے عدم میل ملاپ اور افہام وتفہیم کے بہت حد تک مخدوش ہو چکا ہے۔ صوفیاء نے ہندوستان میں آکر یہاں کے لوگوں کے ساتھ جو سلوک ورویہ اپنایا تھا جس سے اسلام کے متعلق نہ صرف غلط فہمیاں اور شکوک وشبہات دور ہوئے تھے بلکہ لوگ اسلام کے قریب آنے لگے تھے۔ اس لیے پروفیسر اختر الواسع کا درد یہ ہے

[1] روزنامہ انقلاب میں شائع شدہ مضمون، شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات، سے ماخوذ

کہ ہمارے یہاں تمام مذاہب کے حاملین کے ساتھ مثبت اور معنی خیز افہام وتفہیم، مذاکرات ومکالمات کے ٹھوس شواہد ہیں۔ لہٰذا ہندوستان جیسے تکثیری سماج میں جب تک ہم اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا نہیں کریں گے اس وقت تک یقین جانیے ایک دوسرے کی بابت اسی طرح غلط فہمیاں پھیلائی جاتی رہیں گی۔

اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کردوں کہ مورخہ ۱۳/فروری ۲۰۱۹ء کو المصطفی انٹرنیشنل یونیورسٹی، ایران (شاخ ہند) کے زیر اہتمام اور بہ اشتراک؛ سینٹر فار انٹر فیتھ انڈر اسٹینڈنگ؛ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منعقد عالمی کانفرینس بعنوان ''مذاہب عالم میں خاندانی نظام'' کے تحت جو مثالی، وقیع اور جامع ومانع کلیدی خطبہ ارشاد فرمایا وہ آب زر سے لکھنے کے لائق ہے ذیل میں اس کا ایک اقتباس افادہ عام کے لیے شامل اشاعت کررہا ہوں:

> ''صاحبو! مجھے اس بات کی اجازت دیجئے کہ میں اس بین الاقوامی سیمینار کے موضوع کے انتخاب کے لیے منتظمین کو مبارک باد دوں کیونکہ ایک ایسی دنیا میں جہاں قراق وفصل کے تمام پرانے تصورات بے معنی ہوکر رہ گئے ہیں اور نقل وحمل نیز ترسیل وابلاغ کی ترقی نے زمین کی طنابیں کھینچ لی ہیں اور اس طرح یہ دنیا بظاہر ایک طرف عالمی گاؤں میں تبدیل ہوگئی ہے تو دوسری طرف یہ بھی کم المیہ نہیں کہ انسانی رشتے جس طرح اس دور میں پامال ہورہے ہیں؛ خاندانوں کو ہم پارہ پارہ ہوتے دیکھ رہے ہیں؛ انسان لفظوں کے فشار اور میڈیا کے شور وشر میں جس طرح آج مکالمے کی لذت سے محروم ہورہے ہیں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ انسان جو کبھی غم زمانہ کا نقیب تھا وہ اب درد تنہا کا بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے۔ مذاہب عالم نے سارے انسانوں کو اجتماعیت کے رشتے میں باندھا تھا۔ انسانوں کو ہی نہیں بلکہ تمام مخلوقات کو ایک اللہ کو کنبہ یا وسودھا کو کٹمب قرار دیا تھا۔ انسانی تاریخ کے ارتقاء کو وہ سفر جو آدم کی تخلیق اور حوا کے ساتھ ان کی رفاقت سے شروع ہوا تھا اس میں خاندان کی بنیادی اکائی شوہر اور بیوی ہی تھے جو ایک دوسرے کے لیے قرآن کے لفظوں میں لباس کی مانند ہیں۔ جن کا

باہمی تعلق محض جنسی تلذذ کے لیے نہیں بلکہ نسل انسانی کی توسیع کے لیے تھا۔ شوہر اور بیوی کے مقدس رشتۂ ازدواج میں وابستہ ہونے سے وہ خاندان وجود میں آتا ہے، جس میں بیٹا بیٹی، بھائی بہن اور بعد ازاں تایا تائی، چچا چچی، ماموں ممانی، دادا دادی، جیٹھ دیور، بھاوج نند، پھوپھا پھوپھی، اور خالہ خالو کے رشتے ایک منظم شکل میں انسانی سماج کو اعتبار و اعتماد اور استحکام بخشتے ہیں۔ کسی سماج میں رشتوں کی حرمت ہی اس کے مہذب ہونے کا ثبوت ہوتی ہے''۔

جس طرح پروفیسر اختر الواسع مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنے برادران وطن سے مکالمات کریں۔ اسی طرح وہ برادران وطن خصوصًا اصحاب اقتدار سے بھی گزارش کرتے ہیں کہ وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ ڈائیلاگ کا انعقاد کریں تا کہ ہندوستان کی سماجی تکثیریت اور یہاں کا سماجی رکھ رکھاؤ پوری شان کے ساتھ محفوظ رہ سکے۔ کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہ ہو۔ تبھی جا کر ہندوستانی معاشرہ وشوگرو بن پائے گا۔ اسی حوالے سے انھوں نے ابھی حال ہی میں ایک خط جناب وزیر اعظم نریندر مودی کے نام لکھا، اس خط کو روزنامہ راشٹریہ سہارا نے اپنے ادارتی صفحہ پر ۱۹/ ۶/ ۲۰۲۲ء کو شائع کیا ہے۔ یہ خطہ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی زبان میں بھی موجود ہے۔ اس خط میں پروفیسر اختر الواسع نے ہندوستان میں ہونے والی اقلیات خصوصاً مسلمانوں پر ہو رہے مظالم کا بھی ذکر ہے، اسی طرح آنجناب نے اپنے اس خط میں پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر حالیہ ایام میں کی جانے والی گستاخی کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ ان کو قرار واقعی سزا کا مطالبہ بھی کیا۔ اس خط میں وزیر اعظم سے درخواست کی گئی ہے کہ اس وقت ملک کے اقلیتی طبقہ میں بے چینی بڑھ رہی ہے۔ اسے دور ہونا چاہئے اور سماج میں یک جہتی و پر امن بقائے باہمی کی پیش رفت ہو۔ اس سے ہندوستان کی تکثیریت کو جلا ملے گی۔ اسی خط میں پروفیسر اختر الواسع نے کہا ہے کہ وزیر اعظم کو چاہیے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ڈائیلاگ کریں تا کہ شکوہ شکایت دور ہو سکیں۔ اس خط کا آخری پیراگراف ملاحظہ کیجئے:

''محترم وزیر اعظم صاحب

معاملہ صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ انتقامی جذبہ کے تحت شہروں کے ناموں کی

تبدیلی، تاریخ کو بدلنے کی کوشش، حجاب کے نام پر مسلمان بچیوں کو تعلیم سے محروم کرنے کی کوشش ایسے مسائل ہیں جو مسلمانوں کو ہر لمحہ مضطرب کیے ہوئے ہیں۔ آپ اس ملک کے وزیر اعظم ہیں۔ سارے ہندوستان کی قیادت اور سیادت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اپ کسی ایک مخصوص مذہب یا فرقے کے نمائندہ نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں آپ کا خاموش رہنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے اگر ہندوستان میں کوئی عدم استحکام یا بے چینی پیدا ہوگی تو وہ ہم سب کے لیے تکلیف کا باعث ہوگی۔ اس لیے میری آپ سے گزارش ہے کہ اپنی خاموشی کو ختم کیجیے اور تحمل، رواداری اور بردباری سے کام لیتے ہوئے پرانی باتوں کو بھول کر آپ مسلمانوں کو ایک مثبت اور سرگرم مکالمہ کے لیے بلائیں تاکہ وہ آپ کے سامنے اپنا دکھ درد بیان کرسکیں، وہ کیا چاہتے ہیں اور وہ کیسے ممکن ہے، اس پر بات ہو۔ آپ بحیثیت وزیر اعظم کیا ہوسکتا ہے اور کیا نہیں اور کیوں نہیں، اس کو انہیں بتائیں اور اس دوطرفہ مکالمے کے ذریعے پر امن بقائے باہم، داخلی استحکام اور تعمیر وترقی کی نئی بلندیوں تک پہنچا سکیں۔

اگر چہ اب بھی بہت دیر ہو چکی ہے لیکن اگر آپ اب بھی ہماری اس گزارش پر کھلے دل ودماغ سے توجہ دیں اور اسے ممکن کر دکھائیں تو بہر حال یہ اس ملک اور اس کے رہنے والوں سب کے لیے خوش آئند بات ہوگی۔ اس مکالمے کے لیے آپ پارلیمنٹ کے مسلمان ممبروں، تمام مسلم جماعتوں کے سربراہوں، مسلم دانشوروں، سول سوسائٹی کے اہم لوگوں اور مقتدر مسلم صحافیوں کو بلا سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسی پہل ہوگی جس سے بہتر مستقبل کے لیے بہتر امکانات پیدا ہوسکتے ہیں''۔[1]

پروفیسر اختر الواسع کی یہ وہ تاریخی اور مثالی تحریریں ہیں، جو ہندوستانی سماج کو باہم مل جل کر رہنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ اسی طرح ہمیں پتہ چلتا ہے کہ افہام وتفہیم اور ایک دوسرے

[1] روزنامہ راشٹریہ سہارا شائع شدہ مضمون، وزیر اعظم کے نام ایک کھلا خط، سے اقتباس ماخوذ

کے دین، ثقافت اور دیگر سماجی قدروں کو جانے یا سمجھے بغیر معاشرے کی تشکیل وتعمیر ان خطوط پر نہیں کی جاسکتی جن کو اختیار کر کے معاشرے اور اس میں رہنے والے افراد دنیا کی تمام ثقافتوں کے لیے مثالی کردار پیش کرتے ہیں۔ مخاصمت یا عداوت کو محض غلط فہمیوں کی بنیاد پر بڑھانا کسی بھی سماج کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ دانشمند قومیں دشمنی کو ختم کرتی ہیں اس کو ہوا نہیں دیتی ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ہم مکالمات کی افادیت کو سمجھیں اور اس کے نفاذ میں معنی خیز کوشش بھی کریں۔

ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت

ہندوستان کی تکثیری قدروں اور یہاں کی صدیوں پرانی یکجائیت کو برقرار رکھنے کے لیے دوسرا اہم نکتہ ہندو مسلم اتحاد ہے۔ ظاہر ہے ہندو مسلم اتحاد کے حوالے سے کی جانے والی تمام کاوشیں اسی وقت برگ وبار لاسکتی ہیں جب کہ ہمارے اندر ایک دوسرے کے ساتھ میل ملاپ کا جذبہ پوری طرح موجزن ہوگا۔ اتحاد وسالمیت اور اشتراک واجتماعیت کسی بھی سماج کی ترقی اور خوشحالی کے لیے ایسی قدریں ہیں کہ بغیر ان کے ایک صالح اور پرامن معاشرے کا تصور ناممکن ہے۔ آج ہندوستان میں جو باہمی نفرت یا بیزاری پنپ رہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ہندو مسلم رشتے کو دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کمزور کر رہے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے جب ہمارا یہ اشتراک و تعاون ساتھ ساتھ تھا تو ہندوستان سے انگریزوں کو اپنا بوریا بستر اسمیٹنا پڑ گیا تھا۔ لہٰذا آج جو مفاد پرست عناصر یا خود ساختہ مصلحتوں کے اسیر اور محدود مفادات کے قیدی ہمارے اس اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں تو انھیں یاد رکھنا چاہیے ان کے اس عمل سے صرف دو قوموں کا اتحاد ہی پاش پاش نہیں ہوگا بلکہ اس سے ہندوستان کی وہ شفاف روایتیں بھی مضمحل ہوں گی جنھیں ہندوستان کا نام آتے ہی دنیا ہندو مسلم اتحاد کا مضبوط خاکہ اپنے دماغ میں بٹھا لیتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم ایسے لٹریچر کو فروغ دیں جس میں ہندو مسلم اشتراک واجتماعیت کے عناصر پائے جاتے ہوں۔ بناء بریں پروفیسر اختر الواسع کی قیمتی اور وقیع تحریروں میں وحدت انسانیت، انسان دوستی اور باہمی محبت ومودت کے حوالے سے خاصا سرمایہ ملتا ہے۔ جو ہندوستانی معاشرے کے لیے

مشعل راہ ہے۔ اب ذیل میں چند ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ پروفیسر اختر الواسع اپنے ایک مضمون ''سرسید اور مولانا آزاد کی فکر میں تکثیریت کے عناصر'' میں سرسید کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ غیر مذہب والوں سے سچی دوستی اور دلی محبت کرنا ممنوع ہے، یہ ان کی غلطی ہے۔ جو چیز کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں بنائی ہے وہ برحق اور بالکل سچ ہے۔ ہم کو تمام دوستوں سے خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں سچی دوستی اور دلی محبت رکھنی اور برتنی چاہیے۔ مگر وہ تمام محبت اور دوستی میں حب انسانی کے درجے میں ہو، نہ کہ حب ایمانی کے۔ کیونکہ حب ایمانی بلا اتحاد مذہب بلکہ بلا اتحاد مشرب ہونی غیر ممکن ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہدایت ہم کو ہمارے سچے مذہب اسلام نے دی ہے''۔[1]

پروفیسر اختر الواسع نے اپنے متذکرہ مضمون میں مولانا ابوالکلام آزاد کی حب الوطنی اور ہندو مسلم اتحاد کے حوالے سے کئی اہم اقتباسات نقل کیے ہیں۔ ذیل میں مولانا آزاد کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

> ''ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان، ہندوستان کے ۲۲ کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندوستان کی قوم اور ایک نیشن بن جائیں۔ آپ میں سے اب مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد جو سب سے بڑی آواز ہو سکتی ہے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان تھی جس نے صلح نامہ لکھا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں صلح کرتے ہیں۔ اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک نیشن بننا چاہتے ہیں ایک قوم بننا چاہیے''۔[2]

---

[1] تہذیب الاخلاق، ج نمبر ۵، بابت یکم ربیع الثانی ۱۲۹۱ھ، ص ۴۸

[2] پروفیسر اختر الواسع کے شائع شدہ مضمون، سرسید اور ابوالکلام آزاد کی فکر میں تکثیریت کے عناصر، سے ماخوذ

ہندوستان مذہبی تکثیریت کا علم بردار

ہندو مسلم اتحاد و سالمیت کی ضرورت سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ البتہ ہمارا عملی طور پر باہمی اتحاد آج بھی موجود ہے اور اس کی مثالیں ہمیں کسی تہوار، شادی بیاہ اور دیگر سماجی سرگرمیوں میں دیکھنے کو ملتی رہتی ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب کچھ مفاد پرست عناصر نے ہمارے اس رشتہ کو کمزور کرنا شروع کر دیا ہے۔ لہٰذا جن بنیادوں پر ہمارا سماجی رشتہ مستحکم تھا آج بھی انہیں روایات کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ یہ عرض کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی تکثیریت بھارت کی ایک اہم قدر اور یہاں کا اٹوٹ حصہ ہے۔ مذہبی تکثیریت کے حوالے سے پروفیسر اختر الواسع نے اپنی تحریروں کو بارہا زینت بخشی ہے۔ ہندوستان میں مذہبی تکثیریت کی ضرورت وافادیت اور اس کے اطمینان بخش نتائج کے متعلق اپنے ایک مضمون ''سرسید اور مولانا آزاد کی فکر میں تکثیریت کے عناصر'' میں نہایت مفید گفتگو کی ہے۔ واضح رہے کہ پروفیسر واسع کا یہ مضمون ڈاکٹر حارث کی مرتب کردہ کتاب ''دانش راہ بین'' ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کو براؤن پبلی کیشنز نئی دہلی نے شائع کیا ہے:

> ''کہا جاتا ہے کہ ہندوستان انسانیت کی اولین آماجگاہ ہے۔ سب سے پہلے انسانی قدم اسی خطہ ارضی پر پڑے اور پھر یہیں سے دنیا کے دیگر خطوں میں انسانی آبادی کی توسیع عمل میں آئی۔ بعد کے ادوار میں بھی اس ملک کی ہریالی ،خوش حالی اور حسن نے ہمیشہ لوگوں کو نہ صرف یہ کہ اپنی جانب متوجہ کیا ہے بلکہ اپنا اسیر بھی کیا ہے۔ فاتحین ہوں، تجار ہوں یا مذہبی مبلغین یا مختلف وجوہ سے دیگر علاقوں میں بے گھر ہونے والے لوگ، سب کے لیے اس سرزمین نے اپنا دامن کھولے رکھا اور پھر مختلف اکائیوں کو ملا کر ایک ایسی وحدت تشکیل دینے میں کامیاب ہوئی جس میں دنیا کی تمام مذہبی، ثقافتی اور لسانی روایتوں کے لیے احترام ہے۔
>
> ہندوستان کی منفرد حیثیت نے اسے دنیا کی تمام اہم مذہبی، ثقافتی

اور لسانی روایتوں کے مرکز کی حیثیت سے فروغ دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے کا باشندہ ہو ہندوستان آ کر وہ خود کو اجنبی محسوس نہیں کرتا بلکہ اس کی رنگارنگی میں اپنا مخصوص رنگ دیکھ خوش ہوتا ہے اور اس کی عظمت کو سلام کرتا ہے۔ ہندوستان کی یہی انفرادیت ہے جس نے ہمیشہ اسے ایک تکثیری معاشرے والے ملک کے طور پر پیش کیا ہے۔ تکثیری معاشرہ جدید ہندوستان کا مظہر نہ ہو کر اس کی قدیم روایت کا حصہ ہے۔ ہندوستان کی تکثیریت مذہبی بھی ہے اور لسانی بھی۔ اسی طرح تقسیم سماج کے جن مسائل سے دنیا کے بیشتر ممالک اور خطے آج دوچار ہوئے ہیں اور انہیں حل کرنے کی اپنی سی کوشش میں مصروف ہیں، ہندوستان میں وہ مسائل نہ صرف یہ کہ ایک طویل عرصے سے موجود ہیں بلکہ مختلف تناظر میں ان مسائل کو یہاں پر حل کرنے کی کامیاب کوششیں بھی ہوتی رہی ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے اگر گفتگو کی جائے تو یہاں مسلمانوں کا وجود اسلام کی ابتدائی صدی (پہلی صدی/ ساتویں صدی عیسوی) سے ہی ہے۔ اسی طرح ہندوستانی مسلمانوں کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ ہندوستان میں اپنے قیام کے طویل دورانیے میں یہاں پر ان کی مختلف حیثیتیں رہی ہیں۔ کبھی انھوں نے محکوم کی حیثیت سے زندگی گزاری ہے تو کبھی حکمران بھی رہے ہیں۔ اور جب دور جدید میں سیکولر جمہوری نظام کا چلن عام ہوا تو انہیں ہندوستان میں برابر کا شہری رہتے ہوئے شریک اقتدار رہنے کا موقع بھی ملا۔ اس میں نہ وہ محکوم ہیں نہ ان کی حیثیت حاکم کی ہے بلکہ ایک ایسے معاہدہ اور اقتدار میں شریک کار کی ہے جو اس ملک میں اپنے لیے فیصلے بھی خود کرتے ہیں۔ اور خود ہی انہیں اپنے اوپر نافذ بھی کرتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی یہ انفرادیت ہی ہے جو یہاں موجود فقہی کتب میں ایسے تمام مسائل اور ان کے ممکنہ حل کے نمونے موجود ہیں جو مسلمانوں کو بحیثیت حاکم، بحیثیت محکوم یا

بحیثیت معاہد یا اقتدار میں شریک کے طور پر پیش آسکتے ہیں۔ یہ روایت ہندوستان میں پہلے بھی جاری تھی اور موجودہ حالات اور تقاضوں کے تحت پیش آنے والے مسائل کے حوالے سے اس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور آئندہ بھی اس سلسلے میں پیش رفت کے امکانات ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں لیا جانا چاہئے کہ ہندوستان میں صدیوں کے سفر کے دوران جو تکثیری معاشرہ وجود میں آیا اور جو ملی جلی تہذیب تشکیل پائی، اسے اس سفر کے دوران رکاوٹوں سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ مسائل پیدا ہوئے، رکاوٹیں درپیش آئیں، کئی بار ان الجھاؤں میں پھنس کر آگے کی جانب سفر ختم ہوتا ہوا بھی محسوس ہوا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ایک مذہب کے ماننے والوں نے مختلف وجوہ سے دوسرے مذہب کے ماننے والوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہا، کئی بار ایسا لگا کہ بظاہر دریا کے دو کناروں کی طرح چلنے والے ساتھ ساتھ رہنے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن گئے لیکن ہندوستان کے خمیر میں انیکتا میں ایکتا جو رنگ ہیں، اس نے دریا کے اس پانی کا کردار ادا کیا جو ساتھ چلنے کے باوجود بظاہر نہ ملنے والے کناروں کو نہ صرف یہ کہ جوڑے رکھتا ہے بلکہ ان کی یکجائی کو یقینی بناتا ہے''۔[1]

پروفیسر موصوف نے اپنے اس اقتباس میں ہندوستانی معاشرے کی دینی، سماجی اور لسانی تکثیریت پر جو مدلل گفتگو کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس سے جہاں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہندوستان ایک مذہبی تکثیریت کا عظیم الشان مرکز و محور ہے، وہیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بالآخر ہندوستان جیسے معاشرے کے لیے تکثیریت کیوں ضروری ہے۔ اس کے فوائد و ثمرات کیا ہیں، اسی طرح ہندوستانی سماج میں یہاں کی تکثیری کرنوں کی شعائیں کہاں کہاں جا کر منور ہوئی ہیں۔ یہ جامع اقتباس جس معاشرے میں تمام مذاہب کے افراد اور قوموں کو یکجائیت و مرکزیت کے ساتھ رہنے کی دعوت دیتا ہے تو وہیں ہمیں اس بات کا بھی درس دیتا ہے کہ مذہبی تکثیریت کو

[1] حارث منصور، (ڈاکٹر) دانش راہ بین، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۱۷، ص ۳۹-۴۱

اسی وقت مستحکم اور متحرک بنایا جا سکتا ہے جب ہم اپنے فکر وعقیدہ کے تحفظ وصیانت کے ساتھ ساتھ دوسروں کے نظریات، مذہبی روایات کا پوری طرح احترام ملحوظ رکھیں گے۔

اسی تناظر میں پروفیسر اختر الواسع اپنے ایک مضمون جو روزنامہ انقلاب میں ۱/۵/۲۰۲۲ء میں بعنوان ''یونیفارم سول کوڈ: ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا'' میں رقم طراز ہیں:

> ''ایک ایسے ملک میں جہاں دنیا کی تقریباً تمام مذہبی روایات یکجا ہوں، جس کو کثرت میں وحدت کے اپنے کردار پر ناز ہو، جہاں دستور کے شیڈول-8 میں 22 زبانوں کو تسلیم کیا گیا ہو، جہاں کچھ میلوں کی دوری پر بانی اور پانی دونوں بدل جاتے ہوں، جہاں نہ جانے کتنے دریا الگ الگ سوتوں سے پھوٹتے ہوں، الگ الگ راستوں سے اپنا سفر طے کرتے ہوئے بحر عرب اور خلیج بنگال میں مل جاتے ہوں اور پھر بحر عرب اور خلیج بنگال میں مل کر ایک عظیم بحر ہند کو وجود میں لاتے ہوں، جس طرح ان دریاؤں کے بغیر آپ عظیم بحر ہند کا کوئی تصور نہیں کر سکتے اسی طرح مختلف مذہبی اکائیوں کے بغیر ہندوستان کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کچھ دنوں سے اس رنگا رنگی یک رنگی میں بدلنے کی بار بار آوازیں اٹھ رہی ہیں، کوششیں ہو رہی ہیں اب ایک ایسی ہی آواز ایک بار پھر ہندوستان میں گونج رہی ہے اور وہ ہے یکساں سول کوڈ کی مانگ اور جو لوگ برسوں سے اکثر یکساں سول کوڈ کا مطالبہ کرتے آئے ہیں وہ خود یہ نہیں بتا سکتے کہ یکساں سول کوڈ سے ان کی کیا مراد ہے؟ جس یکساں سول کوڈ کا مطالبہ کر رہے ہیں اس کا ڈھانچہ کیا ہوگا؟ شکل وصورت کیا ہوگی؟ ہندو سول کوڈ ہو یا دیگر مختلف مذہبی اکائیوں کے پرسنل لاء، ان سب کی جڑیں مذہبی معتقدات میں پیوست ہیں۔ کیا آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ کوئی ہندو بیاہ 'سناتن پرمپرا' کے مطابق سات پھیروں کے بغیر ہو سکتا ہے؟ کیا سکھ گرو گرنتھ صاحب کی ساکشی مانے بغیر ایک دوسرے کو رفیق حیات کے طور پر قبول کر سکتے ہیں؟ اسی طرح

کیا کوئی عیسائی چرچ میں پادری کے ذریعے دلائے گئے حلف کے بغیر میاں بیوی ہو سکتے ہیں؟ اسی طرح کوئی مسلمان سنی ہوں یا شیعہ، بغیر قاضی اور مجتہدین کے بغیر رشتۂ ازواج میں منسلک ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر یکساں سول کوڈ کی رٹ کیوں'' ۔[1]

یقیناً ہماری روایتیں الگ الگ ہیں۔ ہر مذہب اور عقیدہ کی اپنی خصوصیات ہیں۔ یہ تعدد اور عائلی وسماجی نظام ہمارے معاشرے میں چار چاند لگاتا ہے، اسی مناسبت سے ہندوستان دنیا کی تمام تہذیبوں اور معاشروں میں امتیازی وصف کا حامل ہے۔ لہٰذا ان تمام سماجی ومعاشرتی رسم و رواج اور عائلی قوانین کی رنگا رنگی کو برقرار رکھنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ پروفیسر اختر الواسع اپنے متذکرہ مضمون میں ہندوستان کی رنگا رنگی کو یک رنگی میں تبدیل کرنے کے سخت ترین مخالف ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے ہندوستان کی مذہبی اور مختلف دینی اکائیوں کے سماجی نظام کو پیش نظر رکھتے ہوئے، کئی اہم سوالات بھی کیے کہ اگر ملک میں یکساں سول کوڈ جیسا کوئی نظام مرتب ہوتا ہے اور اس کا نفاذ عمل میں آتا ہے تو پھر متعدد ادیان کے عقیدت مند کیا اپنی مذہبی رسومات کی ادائیگی سے سبکدوش ہو سکتے ہیں؟ اپنے اس اہم اور قابل قدر مضمون میں ہندوستانی تکثیریت کی مجموعی قدروں کے احترام اور اس کے تانے بانے کو جوڑنے رکھنے کا جواز ائین ہند سے بھی پیش کرتے ہیں:

''ہندوستان کا دستور ملک کے ہر مذہبی فرقے کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دیتا ہے اور یہی اس ملک کے مذہبی تنوع کے لیے قابل عمل بھی اور مفید بھی۔ عائلی قوانین دین کو ہر مذہب نے اپنے مذہب کا حصہ سمجھا ہے اور دستوری آزادی کے تحت وہ اپنے عائلی قوانین کے تحفظ کا یقین رکھتے ہیں۔ یونیفارم سول کوڈ اس دستوری آزادی سے محروم کرنے والا قدم ہوگا اور اسے دستور ہند اور مذہبی معتقدات کو ماننے والا کوئی بھی مذہبی فرقہ نہیں کر سکے گا'' ۔[2]

---

[1] اختر الواسع، (پروفیسر) مضمون یونیفارم سول کوڈ: ایک معمہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا، شائع شدہ روزنامہ انقلاب، ۱/۵/۲۰۲۲ء [2] ایضاً

اس مسئلہ کو مزید وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

''جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو ان کا موقف بالکل صاف ہے. وہ اپنا مکمل مذہب رکھتے ہیں اور ان کے عائلی قوانین کا اصل ماخذ قرآن وحدیث اور اجماع اور قیاس ہے اور یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اجماع اور قیاس بھی وہی قابل قبول ہے جو قرآن و حدیث کے مخالف نہ ہوں یا اس سے متصادم نہ ہوں ۔ ملک کے دستور کے تحت انہیں اپنے مذہب اور مذہبی قوانین پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہے۔ ہندوستان میں مختلف مذاہب کے ماننے والے بستے ہیں جن کے اپنے مذہبی اور عائلی قوانین ہیں اور ہر مذہبی اکائی اپنے عائلی قوانین کو محبوب رکھتی ہے اور وہ کسی قیمت پر اپنے عائلی قوانین کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوگی'' [1]

ہندوستان کی تکثیریت اور یہاں کا متنوع ثقافتی نظام ایک زندہ حقیقت ہے۔ ہم مانیں یا نہ مانیں کیوں کہ نہ ہم تاریخ کو محو کر سکتے ہیں اور نہ ہندوستان کے ان عظیم سپوتوں اور دانشوروں کی خدمات کو جنھوں نے ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کو تشکیل دینے اور اس کی شناخت کو محفوظ رکھنے کے لیے کامیاب کاوشیں کی ہیں ۔ تاریخ کو ممکن ہے کوئی جھٹلا دے مگر ان نقوش اور ثبوتوں کو کون نظر انداز کر سکتا ہے جو تکثیری سماج کے حوالے سے صفحۂ قرطاس پر رقم ہو چکے ہیں۔ اس تناظر میں پروفیسر اختر الواسع کا ذیل میں اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''تاریخی تناظر میں یہاں کی ملی جلی تہذیب کے نہ صرف نمونے سامنے آئے ہیں بلکہ علماء اور دانشوروں کی ان کوششوں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت کو لے کر یہاں کے رہنے والے غیر مسلموں سے تعلقات کے حوالے سے ہوتی رہی ہیں ۔ صوفیاء کرام کی صلح کل کی پالیسی ہو یا مسلم حکمرانوں کے غیر مسلم رعایا کے تئیں اقدامات کا مقصد یہی تھا کہ

---

[1] اختر الواسع، (پروفیسر) مضمون یونیفارم سول کوڈ: ایک معمہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا، شائع شدہ روزنامہ انقلاب، ۱/ ۵/ ۲۰۲۲ء

ہندوستان جنت نشاں میں ایک ایسی گنگا جمنی تہذیب کی تشکیل پائے اور ایک ایسا ملا جلا معاشرہ وجود میں آئے اس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے اپنی شناخت کو باقی رکھتے ہوئے نہ صرف یہ کہ ایک ساتھ رہیں بلکہ اس کی ترقی اور خوشحالی میں اضافہ بھی کریں''۔[1]

گویا ہندوستانی تکثیری سماج کے حوالے سے پروفیسر اختر الواسع کی تحریروں میں جو نمایاں اور متوازن افکار ملتے ہیں وہ اس بات کے متقاضی ہیں کہ اب ہم مل کر، بلاتفریق دین و مذہب ہندوستانی تکثیری روایات کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ ان کے تحفظ و بقاء کو بھی یقینی بنائیں۔ یاد رکھیے قوموں میں جب نفرتیں بڑھتی ہیں اور جب معاشروں میں باہم مخالف نظریات کی نشو ونما ہونے لگتی ہے تو پھر اس سے نہ صرف معاشرہ ٹوٹتا ہے، بلکہ باہمی اعتماد و بھروسہ بھی چکنا چور ہو جاتا ہے۔ جو کسی بھی متنوع سماج کی روح ہے۔ یہی اسباب پھر معاشرے کو تنگ نظری اور تعصب کی جانب لے جاتے ہیں۔ پھر لامحالہ اس کے نتائج مایوس کن ہوتے ہیں۔ اس لیے بنیادی طور ہمیں ان خطوط کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے، جن سے ہندوستان کی تکثیری روایات اور یہاں کا ملا جلا معاشرہ پوری آب و تاب اور اپنی تمام تر روایات و اقدار کے ساتھ باقی رہے۔ وہ ہندوستان چاہیے جس میں ایک ساتھ مل کر تمام ادیان کے حاملین اپنے عائلی قوانین، مذہبی امور، سماجی سرگرمیوں اور تہذیبی ولسانی امتیاز کے ساتھ رہیں۔ نہ کسی کو کسی کے مذہب سے شکایت ہو اور نہ کوئی کسی کے مذہبی معاملات یا معاشرتی زندگی میں دراندازی کر سکے۔ جب اس طرح سے ہم اپنے شب و روز کو ترتیب دیں گے تو مجھے پورا یقین ہے کہ موجودہ ہندوستان کا منظر نامہ ایک بار پھر باہمی اتحاد واشتراک اور اعتماد و اعتبار کی راہ پر گامزن ہوگا۔

آخر میں راقم یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ پروفیسر اختر الواسع کی تحریروں میں جس حق وصداقت کی ترجمانی ملتی ہے وہ ان کو ممتاز کرتی ہے، وہ ہندوستان میں ہونے والے مظالم خواہ کسی بھی کیمونٹی کے ساتھ ہو اس پر پوری ہمت اور بے باکی سے لکھتے ہیں تو وہیں وہ اس بات

[1] دانش راہ بین، ص ۴۲

کی بھی دعوت دیتے ہیں کہ ہندوستانی معاشرے کو پوری طرح یکجہتی کے ساتھ رہنا چاہیے۔ کسی بھی طرح کی غلط فہمی کی بنیاد پر ہندوستان کی تکثیریت پر کوئی آنچ نہ آئے۔ پروفیسر اختر الواسع کی تحریریں ہندوستان کی سماجی اور متنوع قدروں کی مکمل امین و پاسبان نظر آتی ہیں۔ ان کی تحریروں کے روشن حروف تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ جھلملاتے رہیں گے۔ جب بھی کوئی محقق، مصنف یا مؤلف ہندوستان کی مذہبی تکثیریت کو اپنی تحقیق کا موضوع بنائے گا تو وہ یقیناً پروفیسر اختر الواسع کی تحریروں سے نہ صرف استفادہ کرے گا بلکہ ان کی اس بابت مخلصانہ کاوشوں کو جلی حروف سے لکھے گا۔

ہندوؤں کے ساتھ مذاکرات کی معنویت
ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد کی تحریروں میں

ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد عظیم مفکر، مدبر سیاسی وسماجی تجزیہ نگار ہیں۔ ان کی اب تک تقریباً ایک درجن تصنیفات وتالیفات منظر عام پر آچکی ہیں، خوشی کی بات یہ ہے کہ مصنف کی تمام تحریریں اور تصنیفات اصحاب علم وفضل اور دانش وبینش سے داد تحسین وصول کرچکی ہیں۔ آپ کی تحریروں کا امتیاز یہ ہے کہ جہاں آپ سماجی مسائل ومباحث پر کھل کر گفتگو کرتے ہیں، وہیں آپ عصری تقاضوں اور سیاسی مسائل پر نہایت وقیع رائے ونظریہ پیش کرتے ہیں۔ سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی مباحث کے حوالے سے آپ کی آراء گرانقدر اور نہایت اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی شخصیت جہاں اہل علم وادب کے یہاں مقبول ہے وہیں آپ کی مقبولیت اہلیانِ سیاست کے یہاں بھی کچھ کم نہیں ہے۔ چنانچہ اس مضمون میں خواجہ افتخار احمد کے ان نظریات وافکار کو پیش کیا جائے گا جو انھوں نے مطالعۂ ادیان، تفاہم ادیان اور مکالمہ بین المذاہب، ہندوازم اور ہندوتوا کے حوالے سے ضمنی بحثیں کی ہیں۔ خواجہ افتخار نے باضابطہ مطالعہ ادیان یا مکالمہ بین المذاہب پر کتاب تو تحریر نہیں کی ہے۔ البتہ ان کی کتابوں میں اس بابت نہایت دلچسپ معلومات ملتی ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد نے ایک کتاب عہد حاضر کے سیاسی، سماجی مسائل پر ''ذہنی وفکری ہم آہنگی آرزو وجستجو'' کے عنوان سے رقم کی ہے، اس کتاب میں ہندوستان، ہندوازم، ہندوتوا اور مکالمہ پر بڑی وقیع اور جامع گفتگو کی ہے۔ یہ ناقابلِ تردید صداقت ہے کہ ہندوستانی معاشرے میں آج جو باتیں گشت کررہی ہیں ان میں بنیادی طور پر یہ چیز شامل ہے کہ ہندوتوا کیا ہے؟ ہندوازم کی کیا تعلیمات ہیں؟ ادھر مخصوص فکر کے حامل افراد

ہندو دھرم کی جو تشریح و تعبیر پیش کر رہے ہیں کیا اصل میں وہی ہندو دھرم ہے؟ اسی طرح یہ سوال بھی اپنی جگہ درست ہے کہ ہندو دھرم اور ہندوتوا میں اشتراک ہے یا دونوں میں تغایر و تفاوت ہے؟ ان تمام حساس مسائل پر خواجہ افتخار احمد نے نہایت، عالمانہ اور بصیرت افروز گفتگو کی ہے۔

ہندوستان ادیان کی آماجگاہ

متذکرہ مسائل کو سمجھنے سے قبل یہ سمجھنا ضروری ہے کہ خواجہ افتخار مادر وطن یعنی ہندوستان کے حوالے سے کیا کہتے ہیں۔ چنانچہ خواجہ افتخار اپنی معروف و متداول کتاب ''ذہنی و فکری ہم آہنگی آرزو و جستجو'' میں لکھا ہے۔

> ''ہم دنیا کے کے دیگر ممالک کی طرح ایک عام ملک نہیں ہیں۔ ہندوستان کا ارتقاء کئی صدیوں اور کئی ثقافتوں کے باہمی امتزاج کے بعد ہوا ہے۔ یہ عظیم رشیوں، منیوں، صوفیوں، سنتوں، مذہبی و روحانی پیشواؤں اور حرکت و عمل پر یقین رکھنے والوں کی سرزمین ہے۔ اس کا وجود ہزاروں سال پہلے ہوا ہے۔ ایک جانب چاروں وید، پورانے، بھاگوت گیتا، رامائن اور مہابھارت ہماری روحانی و ثقافتی جڑوں کی نشاندہی کرتی ہیں تو دوسری جانب بدھ مت ،جین مذہب اور سکھ دھرم اس ارتقاء کا لازمی جزو قرار پاتے ہیں۔ یہودیت ،عیسائیت اور اسلام بھی اپنے ابتدائی دور ہی میں ہندوستان آ چکے تھے۔ لہٰذا ان مذاہب نے بھی ہندوستانی روایت اور اخلاقیات کو مزید وسعت، گہرائی و گیرائی اور جاذبیت عطا کی۔ اس افزودہ تہذیب نے ہندوستان کو فطری طور پر ایک جامع وحدت بنا دیا۔ یہیں سے دنیا میں کوسمو پولیٹن ثقافت کا ماحول پروان چڑھنا شروع ہوا اور بہتر نشو و نما پا کر ہماری سرحدوں سے باہر پھیلنے لگا۔ عرب، یونانی، یورپی، افریقی اور دنیا کی دیگر نسلیں بالواسطہ یا بلاواسطہ اس عظیم سرزمین اور اس کی سنسکرتی سے اپنا تعلق جوڑنے میں فخر محسوس کرتی رہی ہیں۔ ہم عملاً ایک براعظم سے زیادہ وسیع و عریض جغرافیائی شناخت کے حامل ہیں

یہی وجہ کہ ہم پورے کرہ ارض پر پھیلے ہوئے ہیں۔نظریہ ہندوستان اپنی وسعت پذیری کے عمل کو چار دیواری تک محدود رکھنے کا متحمل ہی نہیں ہوسکتا'' وسودھیوا کٹمب کم'' اور'' سروے بھونتو سکھی نا'' کی ویدک تعلیم ہندوستان کے وسیع و عریض ثقافتی نظریے کو بیان کرتی ہے۔اجماع کا ہدف آئینی سیاق وسباق ہمارے یہاں اشتراک اور بقائے باہم کے اصولوں کا پاس رکھتے ہوئے حاصل کیا جاسکتا ہے اس میں جذبۂ حب الوطنی اور قوم پرستی کے مابین فطری رشتہ کلیدی کردار ادا کرتا ہے اس طرح عوام سے خواص تک سب ہی کڑی کا جزو اور کل بن جاتے ہیں۔ یہ عمل ہندوستان کو آج کا ہندوستان بنا دیتا ہے اور دونوں کی مجموعی شکل ہندوستانی شہریت کی اساس اور اس کی تشریح وتفہیم کے معیار بھی مقرر کردیتی ہے''۔[1]

ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد کے مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستانی معاشرہ تکثیریت اور تعدد کا عظیم ترین مرکز ومحور ہے۔ یہی تعدد اور تکثیریت ملک کو دنیا کی تمام تہذیبوں، ثقافتوں اور معاشروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ہندوستان میں ادیان کی کثرت، زبان کا تعدد اور ثقافتوں کی جداگانہ حیثیت اس بات پر شاہد عدل ہے کہ ہمارا ملک کثرت میں وحدت کا آئینہ دار ہے۔ملک کے اس عظیم ترین اور قومی ورثہ کی حفاظت وصیانت کرنے کی ضرورت ہے۔ وطن عزیز کی جو مشترکہ اقدار وروایات ہیں ان کے تحفظ کی ضرورت اس لیے بھی مزید دوچند ہوجاتی ہے کہ کچھ ناعاقبت اندیش افراد ہمارے تہذیبی ورثہ کو داغدار نہ کردیں۔خواجہ افتخار دوسری جگہ ہندوستانی سماج وکلچر اور یہاں کی مشترکہ اقدار کے اوصاف درج ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

'' ہندوستان ہمیشہ سے مذہب، روحانیت اور اخلاقیات کا ایسا عالمی مرکز رہا ہے جہاں ہر نظریے، فکر اور تحریک کا خیر مقدم کیا گیا لیکن اتنا ہی نہیں بلکہ ان کی متواتر پرورش وآبیاری کے لیے بھی سرزمین فراہم کی گئی ہے۔ یہاں رشیوں،

[1] خواجہ، افتخار احمد، (ڈاکٹر) ذہنی وفکری ہم آہنگی آرزو وجستجو، مانک پبلی کیشن، ۲۰۲۰ء، ص ۴۰۲-۳۰۳

سنتوں، صوفیاء کرام، عظیم روحانی رہنماؤں، سماجی مصلحین، وحدانیت کے علمبرداروں، مشرکین، ملحدین اور دیگر سبھی افراد کو اپنی استطاعت، قابلیت، اہلیت اور صلاحیت کے مطابق اپنے پر و بازوؤں کو دراز کرنے کا موقع نصیب ہوتا رہا ہے۔

ہماری زندگی کے کلیدی اور بنیادی شعبوں میں موجود وسیع تر دیکھی ان دیکھی جارحیت اور مختلف طرزِ زندگی اور فلسفہ حیات کے باوجود زندہ حقیقت یہی ہے کہ ۱۳۰ بلین افراد اور عالمی آبادی کا تقریباً ایک چھٹا حصہ ہماری اجتماعی کامیابیوں اور حصولیابیوں پر فخر محسوس کرتا ہے۔ ہم مادہ پرست قوم نہیں ہیں۔ کیا اس زندہ حقیقت سے کسی کے لیے بھی انکار ممکن ہے کہ وطن عزیز ہندوستان میں ہر رنگ و بو کو پھیلنے اور پھولنے کے مواقع بکثرت موجود رہے ہیں۔ تمام تر فطری اختلافات کے باوجود ہمارا فلسفہ حیات وسیع النظری اور وسیع القلبی کا مظہر رہا ہے۔ ہماری تاریخ، تہذیب، طرز زندگی، معاشرتی خدوخال، نظریاتی جہتیں، فکری اساس اور انسانی اقدار صدیوں پر محیط ہماری عظیم مشترکہ ثقافتی وراثت کی آئینہ دار ہیں۔ اور امین بھی۔ یہی وخوشنما حقیقت ہے جو ایک سو تیس کروڑ لوگوں پر مشتمل ہمارے ملک کو عالمی برادری میں ممتاز اور منفرد بناتی ہے۔ ہمارا یہ قومی حسن و جمال اقوام عالم میں ہمیں ایک مہذب، پر امن اور باوقار معاشرے کی حیثیت سے متعارف کرتا ہے۔ ہمارا طرہ امتیاز ہی یہ ہے کہ ہماری کامیابیوں اور حصولیابیوں پر عالمی برادری اپنا فطری حق سمجھتی ہے''۔[1]

ہم اس بات پر بجا طور پر فخر محسوس کر سکتے ہیں کہ ہندوستان ہی وہ سرزمین اور معاشرہ ہے جس میں ہر طرح کے افکار و نظریات اور عقائد و خیالات کو پروان چڑھنے کا موقع ملتا رہا ہے۔ خواجہ افتخار کے مطابق ہندوستان ایک ایسی مقدس محترم سرزمین ہے جس میں ہر طرح کے خیالات اور نظریات کی نشر و اشاعت ہوئی ہے۔ جب کہ باہم ایک نظریہ دوسرے نظریہ، فکر اور

[1] خواجہ، افتخار احمد، (ڈاکٹر) ذہنی و فکری ہم آہنگی آرزو و جستجو، ص ۴۸۱

فلسفہ سے ممتاز ہے اس کے باوجود تمام افکار کا نشو ونما پانا، ان کا اپنا وجود برقرار رہنا بڑی بات ہے۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سارے معاشروں میں غالب تہذیبیں اور افکار اپنی ہم عصر دیگر کمزور نظریات کو معدوم کر ڈالتی ہیں۔ مگر ہندوستان کی سرزمین پر ہمیشہ تمام تہذیبوں اور نظریات کو متواتر آگے بڑھنے کا موقع ملتا رہا۔ اس سے بھی بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ یہاں کی عوام خواہ ان کے عقائد ایک دوسرے کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں کبھی کسی کو کسی کے دین، دھرم اور مذہب سے کسی بھی طرح کی شکایت نہیں ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ ہر دور اور موڑ پر وسیع القلبی اور کشادہ ظرفی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ سرزمین ہند میں ایسے سیکڑوں مقامات ہیں کہ ایک گلی میں مختلف عقائد، نظریات اور افکار کے حاملین موجود ہیں مگر ان کی معاشرتی زندگی میں قطعی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ پورے اطمینان اور امن وامان کے ساتھ رہتے آرہے ہیں۔ یعنی ہندوستان ایک ایسی سرزمین ہے جو ادیان و مذاہب اور افکار و نظریات کی آماجگاہ ہے۔ خواجہ افتخار کا ماننا بھی یہی ہے۔ نیز یہی امتیاز ہمیں عالمی برادری سے ممتاز کرتا ہے۔ لہٰذا اس تنوع اور تکثیریت کا باقی رہنا معاشرتی ضرورت اور عصری افادیت ہے، تو وہیں اس کے دوررس نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں۔

بین الاقوامی مذاکرات کی ضرورت

عہد حاضر کا یہ ایک بڑا دلچسپ اور قابل ذکر موضوع ہے۔ پوری دنیا میں مذاکرات، افہام وتفہیم اور مذاہب کے مابین مشترکہ اقدار تلاش کرنے کی بات ہورہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج قومی سطح پر ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر ہمیں دیگر تہذیبوں، ادیان اور افکار ونظریات کے ساتھ بات چیت کرنے کی ضرورت ہے۔ بات چیت اور میل ملاپ سے غلط فہمیاں اور شکوک وشبہات رفع ہوتے ہیں۔ سماجی اور بین الاقوامی تعلقات مستحکم ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ معاشرے میں امن وامان کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ تصادم، کشمکش اور پرخاش کا خاتمہ آسانی سے ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد نے بات چیت اور مکالمات کے حوالے سے اپنی کتاب ''ذہنی وفکری ہم آہنگی آرزو وجستجو'' میں بڑی بنیادی اور اہم باتیں پیش کی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں

نے اس بات کی جانب بھی توجہ مبذول کرائی ہے کہ آج مسلمان عمداً رواں حکومت اور اس کی ہمنوا تنظیموں سے عداوت بڑھا رہے جب کہ دانش مند قوموں کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ اپنی دشمنی کم کرتی اور دوستی کو فروغ دیتی ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے سنگھ-آر ایس ایس اور بی جے پی سے بات چیت کرنے کی حمایت کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب کا تیرہواں باب ڈائیلاگ اور مذاکرات پر ہی رکھا ہے۔ مکالمہ کی تعریف اور اس کی افادیت پر گفتگو کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''یہ ایک مہذب فعل ہے جس میں مختلف گروہ کے نمائندے نتائج کی حامل سوچ، نقطۂ نظر یا موضوعات کی پیروی کرتے ہوئے مل بیٹھتے ہیں اور ایک دوسرے کے خیالات اور نظریات کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور منطق و استدلال کے ذریعے باہمی قابل قبول تجاویز پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہ عمل گھر سے شروع ہوکر زندگی کے ہر شعبہ میں پھیلتے ہوئے خیالات وعمل کی تمام جہات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اس کی حدیں لامحدود اور دوررس ہیں۔ اس کے اثرات اوپر سے نیچے تک تنظیموں، معاشروں اور نظام حکومت پر پھیلے ہوئے ہیں۔ خاندان، گروہ، ادارے، حکومت، ملک اور عالمی برادری اس کے بنیادی عوامل وعناصر ہیں۔

خیالات اور ترجیحات میں فرق مقامی، گھریلو، علاقائی، قومی اور عالمی نوعیت کے تنازعات پیدا کرتا ہے۔ ان کا جھکاؤ معاشرتی، ادارہ جاتی، سیاسی، علاقائی، معاشی یا یہاں تک کہ مذہبی بھی ہوسکتا ہے۔ اسی تناظر میں آج دنیا میں تنازعات کا حل مشترکہ انسانی کوششوں میں اولین ترجیح بن جاتا ہے اور یہاں سے سماجی ضرورت کے مدنظر اندرون اور بیرون سماج مکالمہ یا بات چیت کا عمل شروع ہوتا ہے''۔[1]

گویا سماجی اور معاشرتی یا پھر دیگر ضروری مسائل کے حل کے لیے مکالمہ کی میز آراستہ کی جاتی ہے۔ جہاں یہ ایک خاندان اور گھر کی ضرورت ہے وہیں اس کی ضرورت ملکی اور عالمی سطح

[1] خواجہ، افتخار احمد، (ڈاکٹر) ذہنی وفکری ہم آہنگی آرزو وجستجو، ص ۱۸۳

پر بھی محسوس کی جارہی اور اسی ضرورت کے پیش نظر اب باضابطہ مکالمات کے جلسے، نشستیں اور محفلیں منعقد ہورہی ہے۔ خواجہ افتخار مکالمات کی اہمیت اور اس کی وسعت کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''سیاست، ڈپلومیسی، ٹکنالوجی، اخلاقیات، مذہب، تعلیم، ثقافت اور انسانی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو جو اس کے دائرہ اثر میں نہ آتا ہو۔ مکالمہ اور طرز مکالمہ کے پھیلاؤ اور مقاصد کے حصول میں مدد فراہم کی ہے۔ اس مقصد کے لیے مواصلات کے رسمی اور غیر رسمی دونوں ذرائع کا استعمال کیے جاتے ہیں۔ انتظامی اور سفارتی امور میں خالص نقطۂ نظر رسمی اور غیر رسمی تنظیموں کا اہم جزو ہوتا ہے۔ یہ چیز بات چیت کے عمل میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ مکالمہ یا بات چیت ایک ایسا فطری راستہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے تنازعات اور اختلافات کو بہ آسانی حل کر سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے گزشتہ چند سالوں میں بطور ادارہ یا تنظیم خاندانی گرفت کمزور پڑ چکی ہے، ذاتی نوعیت کے تعلقات اور ذمہ داریوں نے اپنی ترجیحات بدل دی ہیں۔ جذبات و احساسات پچھلی صفوں میں جا چکے ہیں، مادی اشیاء اور اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے کے اصول ہمارے ذہن و نفسیات کو متاثر کر رہے ہیں''۔[1]

خواجہ افتخار احمد کی یہ رائے باور کراتی ہے کہ مکالمہ یا بات چیت ایک ایسی ضرورت ہے جسے کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جو قومیں بات چیت یا مذاکرات و مکالمات سے محروم رہی ہیں وہ ہمیشہ مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہوگئی ہیں۔ لہٰذا آج مکالمہ کی ضرورت اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس سے جہاں ملکی، سیاسی، سماجی اور مذہبی مسائل کو حل کیا جاتا ہے وہیں قومیں اپنے داخلی، خاندانی اور ذاتی مسائل میں بھی امن کی راہ نکالتی ہیں۔

اسی کے ساتھ خواجہ افتخار احمد نے مکالمہ اور بات چیت کے جو اصول و ضوابط اور

---

[1] خواجہ، افتخار احمد، (ڈاکٹر) ذہنی و فکری ہم آہنگی آرزو و جستجو، ص ۱۸۳-۱۸۴

اخلاقیات قلم بند کی ہیں ان کو بھی ذیل میں پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ خواجہ افتخار احمد رقم طراز ہیں:

کسی بھی کے مکالمہ یا بات چیت کا لازمی جزو اخلاقیات ہے۔ کامیاب طرزِ مکالمہ وضع کرنے کے لیے درج ذیل ضروری اجزاء پر عمل کرنا لازمی ہے۔

اسے ماہرین اور مختلف شعبوں کے تجربہ کار افراد کے مابین ہونا چاہیے۔

سننے اور اسے اہمیت دینے کی اس کی اہم طاقت ہے۔

کسی بھی قسم کے مکالمہ میں مخالفین کو اپنے نکات پہلے پیش کرنے کی اجازت دینا ماسٹر اسٹروک یا آدھی بازی جیتنے کی طرح ہوتا ہے۔

مخالف نظریات ہی حقیقی مکالمے کو دعوت دیتے ہیں۔

یہ صرف ایک بار کی ذہنی وفکری سرگرمی نہیں ہے۔

الزام تراشیاں اور سازشیں مثبت نتائج برآمد ہونے کرنے میں ناکام ہو جاتی ہیں۔

بار بار کی ناکامیوں کے باوجود بات چیت کے عمل کو روکا نہیں جانا چاہیے۔

درمیانی راستے کی تلاش کبھی بھی مذاکرات کاروں کی مرضی اور ان کی دانشمندی کو ختم نہیں کرتی۔

صبر ایوب اور استقامت اس کے حقیقی جوہر ہیں۔

بات چیت میں اعصابی جنگ شامل ہوتی ہے اس لیے فولاد جیسی قوت ارادی رکھنے والے ہی اس میں کامیاب ہوتے ہیں۔

بنیادی ایجنڈے کے نکات کی فریقین کے مابین پیشگی ترسیل اس عمل کو مزید معنیٰ خیز، ٹھوس اور سودمند بنا دیتی ہے۔

بات چیت کے دیئے گیے ماڈیول کا خیال رکھنا، بدترین مخالفتوں کے باوجود شمولیت کے اس عمل کو مفید اور نتیجہ خیز بنا دیتا ہے'' [1]

[1] خواجہ، افتخار احمد، (ڈاکٹر) ذہنی وفکری ہم آہنگی آرزو و جستجو، ص ۱۸۴-۱۸۵

مکالمات یا بات چیت کے متعلق خواجہ افتخار احمد نے جو بنیادی نکات مرتب کیے ہیں اگر ان پر عمل کیا جائے تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ہمارا معاشرہ بقائے باہم اور قومی یکجہتی و مذہبی ہم آہنگی کا شاندار مرکز تصور کیا جانے لگے گا۔ اولا تو مسلمانوں میں ڈائیلاگ یا مکالمہ کی عادت نہیں ہے اگر گاہ بگاہ کہیں اور کبھی بھی اس طرح کا عمل کیا جاتا ہے تو اپنا صحیح اور درست ہدف متعین نہ کرنے کی وجہ سے کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی ہے۔ اس لیے مکالمہ یا گفتگو اہلیان مذاہب کے مابین ہو، سماجی مصلحین یا پھر سیاسی رہبروں کے مابین ہو، یہ اسی وقت کامیابی سے ہمکنار ہوسکتی ہے جب کہ ہم مکالمہ کے وقت درج بالا اخلاقیات کا پوری طرح لحاظ رکھیں۔

مکالمہ سے مسلمانوں کی دوری

عالمی منظر نامہ پر نظر ڈالنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں میں مکالمہ کی کمی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مکالمہ مسلمانوں کی عادت میں نہیں ہے۔ خواجہ افتخار احمد نے اپنی کتاب ''ذہنی وفکری ہم آہنگی آرزو وجستجو'' میں مسلمانوں کو احساس دلایا ہے کہ انھوں نے مکالمہ نہ کر کے بڑے بڑے نقصانات اٹھائے ہیں۔ چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:

> ''عالمی تناظر میں ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی تشکیل کے وقت عربوں کے پاس یہ اختیار تھا کہ وہ یروشلم کو دارالحکومت بناتے ہوئے غزہ کے مغربی کنارے پر ریاست فلسطین کو تشکیل دے سکیں۔ لیکن انھوں نے دنیا بھر کے یہودیوں، مغرب اور یورپی دنیا میں آباد ان کے ہمدردوں کا کھیل سمجھے بغیر اپنی پوری قوت نئی آبادی یہودی ریاست کو تباہ اور کم کرنے پر لگا دی۔ اس کے بعد فلسطین اپنی اصل سرزمین ہی پر اجنبی ہوگیا۔ ۱۹۶۷ء کے عرب اسرائیل تنازعہ سے پہلے اسرائیلی قیادت نے اپنے بحری جہازوں کے لیے تجارت کے راستے تلاش کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ مصر کے دریائے نیل سے گزر سکیں۔ کسی خام خیالی میں مصر کے حکمراں ناصر نے ان کی درخواست ٹھکراتے ہوئے یہودی ریاست کو نیست و نابود کرنے کی دھمکی دے دی۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں

۲ے گھنٹوں ہی میں اسرائیلیوں نے عرب دنیا کی فضائی طاقت کو تباہ و برباد کر دیا۔عربوں کو اب تک کی اپنی بدترین شکست کا ذائقہ چکھنا پڑا۔نوشتہ دیوار کو نہ پڑھنے اور مخالفین کے ساتھ تعلقات نہ بنانے میں ہمیں مہارت حاصل ہے۔لیکن اس کے نتائج ہر شخص کے لیے روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔کیا ان حالات کے لیے دنیا میں مسلمانوں کے علاوہ کوئی اور ذمہ دار ہے؟

مسلمان ہندوستانی تناظر میں اسی ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں حالانکہ ہماری جڑیں تقریبا اسی ملک میں پیوست ہیں۔گزشتہ سات دہائیوں سے ہم ہندو حلقہ کو کمزور کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں لیکن ہمارے اس عمل کا اختتام اس کے استحکام پر ہوا۔ہم نے نہ کوئی سبق لیا نہ اپنے رویہ میں تبدیلی کی۔ہم اپنی ہی منطق اور حکمت عملی کے ساتھ چپکے رہے۔سنگھ پریوار اور اس کے حلقہ اثر کے ساتھ روابط اور بات چیت کے ذریعے اپنے کلیدی خدشات، ترجیحات اور مسائل کو حل کرنے کے بجائے ہم اپنے تاش کے پتے سیکولرزم اور نام نہاد سیکولر وادیوں کی جھولی میں ڈالتے رہے۔کیا ہم اپنی مرضی سے ان سیاہ کی جانب گامزن نہیں ہیں؟''۔[1]

اب یقیناً اس ضرورت سے قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہمیں بات چیت اور مکالمات کی طرف توجہ دینی چاہیے۔اس پہلو کی طرف خواجہ افتخار نے توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے:

''اب وقت آ گیا ہے کہ مسلمان اپنے درمیان ہی بحث و مباحثہ کا انعقاد کرتے ہوئے زندگی کو نئے سرے سے دیکھیں، اس کے بعد سنگھ پریوار کی قیادت، ان کے کیڈر اور ان کے مختلف گروہوں سے بات چیت کریں۔ ہندو ، ہندو جذبات، ہندو تسلط یا ہندوتوا یا کسی اور کے بارے میں بات کرنا جرم نہیں ہے۔ان سے بات کرنا ہماری مجبوری ہے۔لیکن ہمیں اسے دوستانہ ماحول میں انجام دینے کی ضرورت ہے۔یہی عصر حاضر کی سیاست اور حقیقت پسندی کی

[1] خواجہ، افتخار احمد، (ڈاکٹر) ذہنی و فکری ہم آہنگی آرزو و جستجو، ص ۱۵۶-۱۵۷

سیاست ہے'' [1]

خواجہ افتخار کی یہ رائے بہت معقول اور مناسب ہے کہ اب وقت اور حالات کے مطابق ہمیں اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا اور موجودہ وقت میں ڈائیلاگ اور مکالمہ کی افادیت کو بھی سمجھنا ہوگا۔ تعطل اور انحلا یہ ایسے عوامل ہیں جو معاشروں کو ترقی اور عروج کی طرف لے جانے سے صرف روکتے ہی نہیں ہیں بلکہ ان سے قوموں، معاشروں اور برادریوں میں نفرت و بیزاری اور عداوت و پرخاش بھی بڑھتی ہے۔ فوری طور پر ہمیں انسانی حقوق اور سماجی فلاح و بہبود اور خوشحالی کو فروغ دینے کے لیے ہندوستان کی اعلی قیادت اور سنگھ پریوار کے کیڈر سے بات چیت کرنی ہوگی تبھی جا کر کسی مسئلہ کا حل نکل پائے گا۔

خواجہ افتخار کے مکالمات کے لیے عملی اقدامات

خواجہ افتخار کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے سماجی یا ملکی اور قومی، ملی مسائل کو صرف کتابوں، مضامین و مقالات کی ہی زینت نہیں بنایا بلکہ انھوں نے سماجی مسائل کے حل کے لیے عملی اقدامات بھی کیے اور سنگھ پریوار کی اعلی قیادت، اسی طرح رواں حکومت کے اعلی عہدے داروں سے انھوں نے باقاعدہ گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ اس دوران جس نیک نیتی، اخلاص، وفا اور صداقت کے ساتھ قومی، سماجی اور مسلمانوں کے مسائل کو اٹھایا، خواجہ افتخار کا یہ رویہ بڑا نہایت قابلِ قدر اور قابل تحسین ہے۔ ضرورت ہے کہ ملک کے مسلمان اور سماجی تنظیمیں ان کے اس تابناک کردار کو سراہیں۔ خواجہ افتخار نے اپنی کتاب ''ذہنی وفکری ہم آہنگی آرزو و جستجو'' میں اس حوالے سے نہایت تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ چنانچہ ان کی ملاقات ایک مسلم وفد کے ساتھ وزیر اعظم نریندر مودی سے ۱۹/ جنوری ۲۰۱۷ء کو ان کی رہائش گاہ پر ہوئی اس مکالمہ میں خواجہ افتخار نے جن مسائل کو اٹھایا وہ بڑے اہم ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں اس بات چیت کے اہم نکات کو نظر قارئین کیا جائے۔

خواجہ افتخار احمد کے خطاب کے اہم اجزاء درج ذیل ہیں۔

---

[1] خواجہ، افتخار احمد، (ڈاکٹر) ذہنی وفکری ہم آہنگی آرزو و جستجو، ص ۱۵۵

جناب وزیر اعظم عام طور پر جب مسلم وفود آپ سے ملنے آتے ہیں تو بیشتر صرف مسلم مسائل ہی اُٹھاتے ہیں۔ میرا اعتراض مسلم مسائل اٹھانے پر نہیں ہے البتہ میری نظر میں پہلی ترجیح قومی اور بین الاقوامی موضوعات کو ملنی چاہیے۔ وزیر اعظم سے ملاقات ایک نادر موقع ہے اور ہمیں اس موقع کو پہلے ملک اور اس کے بعد ملی مسائل اٹھانے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ ان فکری اور کلیدی الفاظ کے بعد جو باتیں خواجہ افتخار احمد نے جناب وزیر اعظم نریندر مودی کے سامنے اٹھائی ان کو بھی پیش کرنا ضروری ہے۔ خارجہ پالیسی پر خواجہ افتخار احمد نے اپنی رائے اس طرح رکھی:

''خطے میں روس، چین اور پاکستان کے بڑھتے گٹھ جوڑ اور اس کے ہم پر پڑنے والے اثرات پر بات کیں۔ ہم ایسا کیوں ہونے دے رہے ہیں؟ روس ایک وقت سے ہمارا اتحادی اور دوست رہا ہے اور اب اس کا جھکاؤ ہمارے مستقبل کے ہمہ جہتی عزائم اور مفادات کے منافی ہے۔ پاکستان کے تعلق سے میں نے کہا تھا کہ ہم ہندوستانی مسلمان ہمیشہ اپنی قومی پالیسی کے ساتھ کھڑے رہتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہم کسی بھی قومی، علاقائی یا بین الاقوامی امور میں ایسا کچھ بھی نہیں کرتے جس سے ہمارے قومی مفادات کو نقصان پہنچے۔ پاکستان میں ہمارا ایک مضبوط حلقہ ہے اور ہمیں ایسا کچھ نہیں کرنا چاہیے جس سے اس حلقے میں ہمارے اثر ورسوخ پر ضرب پڑے۔

اے ایم یو اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اقلیتی کردار کی طرف آتے ہوئے، میری پیش کش فرقہ وارانہ نہیں تھی۔ اے ایم یو اور جامعہ کے ساتھ اقلیتی کردار کی اصطلاح استعمال کیے بغیر میں نے وزیر اعظم کو اس معاملے کی جانب قومی مثالوں کے ذریعے متوجہ کیا اور وہ مثالیں یہ ہیں: بی ایچ یو محض یونیورسٹی نہیں ہے بلکہ اس کے بانی پنڈت مدن موہن مالویہ ہندو اصلاح پسند تحریک کے جنم وکرم داتا (جنک) اور اس یونیورسٹی کے سرپرست بھی ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور، شانتی نکیتن کے بانی ہمارے قومی نقطہ نظر کی پابندی کرتے ہیں

یہی وجہ ہے کہ شانتی نکیتن قدرتی ماحول میں تعلیم وتعلم کا مرکز بنا۔ بھارتیہ ودیا پیٹھ بھی محض یونیورسٹی نہیں ہے، یہ ہمارے ثقافتی ورثے کی پاسبان ہے۔ اسی طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی محض ایک یونیورسٹی نہیں ہے۔ جب کبھی ہم عدم تعاون تحریک یا قومی جدو جہد آزادی پر تبادلہ خیال کرتے ہیں تو اس عظیم ادارے کا کردار ہمیں اس کا لازمی حصہ نظر آتا ہے۔ آخر میں، میں نے کہا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی صرف یونیورسٹی نہیں بلکہ یہ مسلم اصلاح پسند تحریک کا مرکز بھی ہے۔ اور اس کے بانی سرسید احمد خاں اس کے بنیادگزار ہیں۔ اس موقع پر اے ایم یو کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ اور جامعہ کے پروفیسر طلعت احمد بھی موجود تھے وہ میرے ان الفاظ کے گواہ ہیں۔

مثالوں کے ساتھ اس باب کا اختتام کرتے ہوئے، میں اب قابل احترام وزیراعظم سے گزارش کرتا ہوں کہ ان کی قیادت اور ان کی میعاد میں ملک کے ان قومی اثاثوں کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے''۔[1]

مصنف مزید لکھتے ہیں کہ میری اس درخواست کو تین سال سے زائد کا عرصہ گزر گیا ہے۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ ان تمام قومی اثاثوں کی حیثیت جوں کے توں برقرار ہے۔[2]

اب اس بات کو پورے پانچ سال کا عرصہ گزر گیا ہے الحمدللہ خواجہ افتخار احمد کی مخلصانہ کاوش اور جدو جہد کا نتیجہ ہے کہ ابھی تک ہماری یہ قومی، ملی دانش گاہیں جوں کی توں محفوظ ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہ آگے بھی اسی طرح اپنے امتیاز و شناخت کے ساتھ محفوظ رہیں گی۔ اس لیے اس بات کے کہنے میں مجھے کوئی تردد نہیں ہے کہ خواجہ افتخار کی یہ رائے نہایت موزوں، مناسب اور حقیقت پر مبنی ہے کہ ہمیں بات چیت کا سلسلہ منقطع کرنا نہیں چاہیے۔ یہ بات ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ بات چیت سے ہی مسائل کا حل نکلتا ہے۔ غلط فہمیاں، شکوک وشبہات اور نفرتوں کا

---

[1] خواجہ، افتخار احمد، (ڈاکٹر) ذہنی وفکری ہم آہنگی آرزو و جستجو، ص ۱۶۳-۱۶۴

[2] ایضاً، ص: ۱۶۴

خاتمہ ہوتا ہے۔

آر ایس ایس سے گفتگو

یہ سچ ہے کہ آر ایس ایس ایک فکری اور نظریاتی تنظیم ہے۔ ملک میں اس کا اثر ورسوخ کافی مضبوط و مستحکم ہے۔ اس کے اپنے نظریات اور خیالات ہیں گویا آر ایس ایس ایک ایسی زندہ حقیقت ہے کہ نہ تو اس کے وجود کا انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے فکری رویوں سے انحراف کرنا ممکن ہے۔ اس لیے سماج و ملک اور معاشرے میں ہم آہنگی اور رواداری لانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یعنی مسلم طبقہ آر ایس ایس کی اعلی قیادت سے گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھائے۔ تاہم خواجہ افتخار نے اس باب میں بھی نہایت گراں قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ انھوں نے آر ایس ایس سے مکالمات کی ابتداء ۱۹۹۶ء میں بننے والی پہلی بی جے پی حکومت کے خاتمے کے بعد شروع کی تھی۔ اس کی تفصیل انھوں نے اپنی کتاب ''ذہنی وفکری ہم آہنگی آرزو وجستجو'' میں قلم بند کی ہے۔[1]

ہندومت اور موجودہ منظرنامہ

خواجہ افتخار احمد نے اپنی کتاب ''ذہنی وفکری ہم آہنگی آرزو وجستجو'' میں ہندوازم کے حوالے سے منطقی اور موجودہ تناظر میں نہایت اہم اور دلچسپ گفتگو کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہندوازم پر اب تک سیکڑوں کتابیں اور مضامین و مقالات زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں ان کی قدر و قیمت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن یہاں جو نظریاتی گفتگو خواجہ افتخار احمد صاحب نے کی ہے اس کو پیش کرنا مقصود ہے۔ ہوسکتا ہے ہے کہ ان کی اس رائے سے اتفاق نہ ہو لیکن غور وخوض کے جو پہلو اس میں ملتے ہیں وہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

چنانچہ خواجہ افتخار احمد صاحب ہندو کو ایک ''قومی شناخت'' بتاتے ہیں:

> ''ہر ہندوستانی ہندو ہے۔ ہندوستان اور بھارت مشترکہ تشبیہات ہیں۔ انہیں تشبیہات کے ذریعے ہندوستانی یونین ہمارے حکومتی ادارے اور شہری سماج

---

[1] دیکھیے تفصیل خواجہ، افتخار احمد، (ڈاکٹر) ذہنی وفکری ہم آہنگی آرزو وجستجو، ص ۱۹۱-۱۹۷

ایک خود مختار ملک کی حیثیت سے اقوام عالم میں ہماری شناخت کرواتے ہیں۔ عالمی سطح پر بھی انہی تشبیہات کو قبول کیا جاتا ہے اور سراہا جاتا ہے لہٰذا یہی اب استعمال میں ہے۔ انگریزی میں تحریر آئین ہند کے سرورق پر'' کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا'' ہندی میں تحریر آئین ہند کے سرورق پر'' بھارت کا سنویدھان'' اور اردو میں تحریر آئین ہند کے سرورق پر'' بھارت کا آئین'' درج ہے۔ جب تک آئین ہند اور ہماری آئینی مشینری ملک کو انڈیا اور بھارت کی حیثیت سے تسلیم کرتی رہے گی تب تک ملک کا ہر شہری اسی طرح کی مشابہت کا استعمال کرتا رہے گا۔ اس تناظر میں ہم ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے انڈین یا بھارتی کی حیثیت سے سرکاری طور پر پہچانے جائیں گے۔ یہ ہماری مشترکہ قومی شناخت ہے اور یہ دونوں اصطلاحیں عموماً بطور مترادفات استعمال ہوتی ہیں۔ ہندوستان اور ہندوستانی ان اصطلاحوں کو ایک دوسرے کے مساوی اور متوازی ہی خیال کرتے رہیں گے۔ ہندوستان مستعمل ضرور ہے مگر اس کی حیثیت بھارت اور انڈیا جیسی نہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کے شہری کی حیثیت سے کیا میرے پاس اس میں چوتھی یا پانچویں اصطلاح شامل کرنے کے اختیار ہے میرے خیال میں یہ شخص کے دائرہ کار اور اختیارات سے اس وقت تک دور ہے، جب تک دوسری صورتوں میں ترمیم نہ کی جائے۔ تاہم اکثریتی فرقے کا ایک بڑا حصہ بھارت کو ہندوستان مانتا ہے اور اس میں رہنے والے ہر باشندے کو ہندو- عام اصطلاح ہندوستان کا مفہوم اکثر و بیشتر اسی تشریح کے ساتھ ہمارے سامنے آتا رہتا ہے۔ اس مشابہت کی جڑیں ثقافتی قوم پرستی کے نظریے میں پوشیدہ ہیں اس خیال کو فوری طور پر مسترد کرنے سے گریز کروں گا اور اس تعلق سے مزید تحقیقات اور تجزیے کو ترجیح دوں گا''[1]

[1] دیکھیے تفصیل خواجہ، افتخار احمد، (ڈاکٹر) ذہنی وفکری ہم آہنگی آرزو و جستجو، ص ۴۱۴-۴۱۵

اس اقتباس کی رو سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہندو ایک قومی شناخت ہے اور ہندوستان میں رہنے والے کو ہندو اسی ثقافتی طور پر کہا جاتا ہے۔ لہٰذا خواجہ افتخار احمد کی یہ رائے جہاں غور وفکر کے لیے راہ ہموار کرتی ہے وہیں تحقیق وتفتیش اور تجزیے کے باب بھی وا کرتی ہے۔ اس لیے اس مسئلہ پر دانشور اور مفکرین کو گیرائی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ وہ مزید تحریر کرتے ہیں کہ جہاں ہندو ایک قومی شناخت ہے وہیں یہ ایک مذہبی شناخت بھی ہے:

''ایک مذہب کی حیثیت سے ہندومت (سناتن دھرم) بہت قدیم ہے اور اس کے ساتھ ہزاروں سال کی ایک متمول میراث وابستہ ہے۔ تمل ناڈو کی انا یونیورسٹی اور مدراس یونیورسٹی میں ہونے والی تحقیقی مطالعہ کے مطابق رام سیتو کی عمر ۱۸۴۰۰ سال ہے۔ لہٰذا اس کی رسمی ابتدا کے اصل وقت کا حوالہ پیش کرنا مشکل ہے۔ لفظ ہندو براہ راست ویدک صحیفوں، سمرتیوں یا دھرم شاستر میں نہیں پایا جاتا ہے۔ اسے متاثر کن بنانے کے لیے کچھ اخذ شدہ مفاہیم دستیاب ہیں لیکن اس کی تحقیقات پر اتفاق رائے کا فقدان ہے۔ ہندوؤں کے مقدس صحیفوں میں نظریاتی اصطلاح 'ہندو' کا ذکر براہ راست کہیں بھی نہیں ہے۔ بھاوشیہ پورانا اور میر وتنتر نے اس کا استعمال بہت بعد میں کیا۔ ایرانی اور دوسرے حملہ آوروں نے اسے ایک مذہبی رنگ دیا۔ بال گنگا دھر تلک نے سب سے پہلے انیسویں صدی میں ہندو مذہب کی خصوصیات کی شناخت کیں اور وہ خصوصیات درج ذیل ہیں۔

عقیدت کے ساتھ ویدوں کی قبولیت

اس حقیقت کی شناخت کہ نجات اور سچائی کے ادراک کے بہت سارے ذرائع اور متنوع مسائل ہیں۔

''پرستش کے لیے کئی دیوتا ہیں'' [1]

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ لفظ ہندو کا استعمال ہندوؤں کے کسی بھی دینی نوشتہ میں

---

[1] خواجہ، افتخار احمد، (ڈاکٹر) ذہنی وفکری ہم آہنگی آرزو وجستجو، ص ۴۱۵-۴۱۶

نہیں ملتا ہے۔ البتہ جو لفظ ہندو دھرم کے لیے بولا جاتا ہے وہ ہے ویدک دھرم، سناتن دھرم وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اب ہندو کو قومی شناخت کے اعتبار سے نہیں دیکھا جاتا ہے بلکہ اس کو ہندو مذہب کے ساتھ چسپاں کر کے دیکھا جاتا ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ 'ہندو' کا لفظ سنتے ہی فوراً ہندو دھرم کے اوپر جاتا ہے ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ہمارے ہندو و دوان اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں۔

خواجہ افتخار احمد نے اپنی کتاب میں ہندو فرقوں کی تاریخ کے حوالے سے نہایت مستند گفتگو کی ہے۔

''پہلا فرقہ لنگایت، اس کا ظہور ۱۲ ویں صدی میں ہوا تھا وہ (لنگایت) ذات پات، بتوں کی پوجا، ویدوں اور برہمنی روایت پسندی پر اعتماد کو مسترد کرتے ہیں۔ پھر انیسویں صدی میں برہمو سماج آیا۔ اس کے پیروکار ویدک اور برہمنی اختیارات کو قبول کرنے نہ کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ بت پرستی اور مقدس بندھنوں کے استعمال کی مخالفت کرتے ہیں۔ پرارتھنا سماج کے بانی مہادیو گووند رانا ڈے نے بچپن کی شادی کی مخالفت کرتے ہیں اور وہ بیوہ کی دوبارہ شادی اور منوسمرتی کی حمایت کرتے ہیں۔ آریہ سماج انیسویں صدی میں وجود میں آیا مہارشی دیانند سرسوتی اس کے بانی ہیں اور وہ ویدوں کی حتمیت اور پنرجنم پر یقین رکھتے ہیں۔ آپ نے مورتی پوجا، جانوروں کی بلی اور مروجہ ذات پاک کے الزام کو مسترد کیا۔ قانون کی نظر میں اس موضوع سے متعلق ایکٹ یعنی Hindu Code Bill (ہندو کوڈ بل) Hindu Adoption and Maintenance Act، Hindu Marriage Act اور Hindu Succession Act۔ ہندو اصطلاح کی براہ راست تعریف کرنے سے قاصر ہیں لیکن ان چاروں میں سے ہر ایک 'ہندو' اصطلاح کو اکثریتی برادری کی مذہبی شناخت ہی تصور کرتا ہے۔'' ان تمام تفصیلات کو قلمبند کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا درجہ بند تفصیلات کے تناظر میں ہندو ایک مستحکم و پائیدار مذہبی شناخت اور معاشرہ ہے بالکل اسی طرح جیسے عیسائی، سکھ، پارسی، جین اور

مسلمان وغیرہ ہیں۔ وہ تمام سرکاری ریکارڈوں میں مذہب کے کالم میں اسی طرح 'ہندو' اصطلاح ہی تحریر کرتے ہیں جس طرح دوسری مذہبی جماعتیں اپنی اپنی اصطلاح تحریر کرتی ہیں'' [1]

متذکرہ بالا تمام تفصیلات کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ خواجہ افتخار احمد نے ہندوستان میں پائے جانے والے ادیان اور مذاہب کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سنسکرتی اور یہاں کی تہذیب کا مطالعہ وسعت و کشادگی اور گہرائی و گیرائی سے کیا ہے۔ جس کا اندازہ ہمیں ان کی تحریروں اور تقریروں میں ہوجاتا ہے:

اسی طرح خواجہ افتخار احمد نے ایک بحث اپنی متذکرہ کتاب میں ہندوتوا کے حوالے سے کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوتوا اور ہندو دھرم دو الگ الگ چیزیں ہیں اس کے متعلق تفصیل درج ذیل صفحات پر دیکھی جاسکتی ہے۔ [2]

آخر میں نتیجہ کے طور پر راقم یہ کہنا ضروری سمجھتا ہے کہ خواجہ افتخار احمد نے ہندومت اسی طرح مذاکرات و مکالمات کے حوالے سے جو نظریات پیش کیے ہیں ہوسکتا ہے ہے قاری کو ان سے اختلاف ہو۔ البتہ اس صداقت سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس مضمون میں غور وفکر کے کئی پہلو ہیں۔ اسی طرح ہمیں اس مضمون سے یہ بھی درس ملتا ہے کہ ہندوستان جیسے تکثیری سماج میں ہماری ترجیحات کیا ہونا چاہیے اور وقت کے تقاضوں کو سمجھ کر اپنی منزل کو طے کرنا نہایت ضروری ہے۔

---

[1] خواجہ، افتخار احمد، (ڈاکٹر) ذہنی وفکری ہم آہنگی آرزو و جستجو، ص ۴۱۶

[2] ایضاً ص ۵۵-۶۳

کتابیات

۱- قرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری، الجامع الاحکام القرآن، مطبع مصریہ، ۱۹۸۷ء

۲- طبری، ابوجعفر محمد بن جریر طبری، جامع البیان عن تاویل آی القرآن، بیروت لبنان، ۱۹۷۸ء

۳- زحیلی، وہبہ (ڈاکٹر) التفسیر المنیر فی العقیدۃ والشریعۃ والمنھج، دارالفکر، دمشق، ۲۰۰۹ء

۴- آزاد، ابوالکلام محی الدین (مولانا) ترجمان القرآن، ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۸۹ء

۵- احمد بن حنبل، المسند، داراحیاء التراث العربی، بیروت

۶- ابوالحسن مسلم بن حجاج بن قشیری، الصحیح المسلم۔

۷- محمد بن عبدالرحمٰن بن عبدالرحیم، تحفۃ الاحوزی بشرح جامع الترمذی، دارالفکر۔

۸- قاری، شیخ علی بن سلطان، محمد انصاری، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح،

۹- محمد ابن سعد، الطبقات الکبری، مکتبہ الخانجی قاہرہ، ۲۰۰۱ء

۱۰- ابن ہشام، ابومحمد عبدالملک، اردو ترجمہ، سیرۃ النبی، ادارہ اسلامیات لاہور، ۱۹۹۱ء

۱۱- طبری، ابوجعفر محمد بن جریر، تاریخ الرسول والملوک، اُردو ترجمہ نفیس اکیڈمی، کراچی، ۲۰۰۴ء

۱۲- ملا، عبدالقادر، بدایونی، منتخب التواریخ، اُردو ترجمہ، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء

۱۳- ابن قیم جوزیہ، احکام اہل الذمہ، جامع دمشق، طبع اول، ۱۹۶۱ء

۱۴- ابوالحسن بن حسین مسعودی، مروج الذہب، ومعادن الجوہر، نفیس اکیڈمی اسٹریچن روڈ کراچی، ۱۹۸۵ء

۱۵- قاضی، ابوالقاسم صاعد اندلسی، طبقات الامم، معارف اعظم گڑھ، ۱۹۲۸ء

۱۶- ابوالفضل، آئین اکبری، جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن، ۱۹۳۹ء

۱۷- جہاں گیر نورالدین، (بادشاہ) تزک جہاں گیری، مکتبہ الحسنات، دہلی، ۲۰۰۱ء

۱۸- دبستان مذاہب، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، ۲۰۰۱ء

۱۹- منشی فیض الدین، دہلوی، بزم آخر، اُردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۲ء

۲۰- شہرستانی، محمد عبدالکریم، الملل والنحل، بیروت، ۱۹۷۴ء

۲۱- چریاکوٹی، عنایت رسول عباسی (مولانا) بشری، شروانی پریس، علی گڑھ، ۱۹۳۹ء

۲۲- معبری، شیخ زین الدین، تحفۃ المجاہدیں فی بعض اخبار البرتکالین، شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ، ۱۹۷۲ء

۲۳- بیرونی، برہان الحق ابوریحان محمد بن احمد، فی تحقیق ماللہند من مقولہ فی العقل اومزدولہ، ناشران وتاجران کتب، ۲۰۰۵ء

۲۴- آزاد، ابوالکلام (مولانا) البیرونی اور جغرافیہ عالم، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ۲۰۰۴ء

۲۵- تھانوی، اشرف علی، (مولانا) الترتیب اللطیف فی قصۃ الکلیم والحنیف، اشرف المطابع، ۱۳۲۷ھ

۲۶- مودودی، سید ابوالاعلیٰ، الجہاد فی الاسلام، ادارہ ترجمان القرآن، ۱۹۹۲ء

۲۷- مودودی، سید ابوالاعلیٰ، اسلامی ریاست، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء

۲۸- شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، ناشران وتاجران کتب اردو بازار لاہور، ۲۰۰۶ء

۲۹- بھٹی محمد اسحاق (مولانا) قاضی سلیمان منصور پوری عہد، خاندان، اساتذہ، ہم عصر علماء

۳۰- قاضی سلیمان منصور پوری، خطبات سلیمان،

۳۱- شبلی نعمانی، (علامہ) مقالات شبلی، جلد پانچ، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء

۳۲- شبلی نعمانی، (علامہ) مقالات شبلی جلد چھ، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۱۹۳۷ء

۳۳- ندوی، سید سلیمان (مولانا) عرب وہند کے تعلقات، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، ۱۹۲۰ء

۳۴- گیلانی، مناظر احسن، (مولانا) تدوین قرآن، مکتبہ بخاری کراچی، پاکستان، ۲۰۰۵ء

۳۵- گیلانی، مناظر احسن، (مولانا) النبی الخاتم، مکتبہ اخوت، بدون سن۔

۳۶- گیلانی، مناظر احسن، (مولانا) مقالات گیلانی، شیخ زائد اسلامک سینٹر لاہور، ۲۰۰۴ء

۳۷- حسنی، سید عبدالحئ، (مولانا) الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، اُردو ترجمہ، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء

۳۸- ندوی، سید نجیب اشرف، (مولانا) مقدمہ رقعات عالم گیری، دار المصنّفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

۳۹- سید صباح الدین عبدالرحمٰن، (مولانا) ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

۴۰- سید صباح الدین عبدالرحمٰن، (مولانا) مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۰۹ء

۴۱- سید صباح الدین عبدالرحمٰن (مولانا) بزم تیموریہ، جلد اول، دوم سوم، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۸ء

۴۲- سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

۴۳- سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستانی سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

۴۴- سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی مذہبی رواداری، جلد اول، دوم، سوم۔ دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۱۹۸۳ء

۴۵- سرہندی، احمد، (شیخ) مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی، (اُردو ترجمہ) منشی نول

کشور،۱۹۱۳ء

۴۶- خلیق انجم،مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، برہان اردو بازار دہلی،۱۹۶۳ء

۴۷- قاضی،اطہر مبارک پوری،عرب و ہند عہد رسالت میں،تخلیقات لاہور،۲۰۰۴ء

۴۸- قاضی،اطہر مبارک پوری،خلافت راشدہ اور ہندوستان،ندوۃ المصنّفین،۱۹۷۲ء

۴۹- گیلانی،مناظر احسن،(مولانا) ہزار سال پہلے،نفیس اکیڈمی کراچی،۱۹۶۴ء

۵۰- گیلانی،مناظر احسن (مولانا) پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، جلد اول،دوم،مکتبہ رحمانیہ اُردو بازار لاہور،

۵۱- نجیب آبادی،اکبر شاہ،(مولانا) آئینہ حقیقت نما،نفیس اکیڈمی کراچی،۱۹۵۸ء

۵۲- شیخ محمد اکرام،آب کوثر،ادارہ ثقافت اسلامیہ،کلب روڈ لاہور،۲۰۰۶ء

۵۳- شیخ محمد اکرام،رود کوثر،ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور،۲۰۰۵ء

۵۴- سیوہاروی،حفظ الرحمٰن،قصص القرآن،مکتبہ قاسمیہ الفضل مارکیٹ،اُردو بازار لاہور

۵۵- محمد حمید اللہ،(ڈاکٹر) اسلام کیا ہے؟ شہید پرنٹنگ پریس،لاہور،۲۰۱۳ء

۵۶- محمد حمید اللہ (ڈاکٹر) خطبات بھاول پور،۲۰۰۷ء

۵۷- محمد حمید اللہ،(ڈاکٹر) رسول اکرم کی سیاسی زندگی،دارالاشاعت کراچی۔

۵۸- قاضی،سلیمان منصور پوری (مولانا) رحمۃ للعالمین،فرید بک ڈپو،۱۹۹۹ء

۵۹- سید عبدالرشید قرآن مجید اور عصر حاضر۔(مقالات کا مجموعہ) ہدی بک حیدر آباد،۲۰۱۲ء

۶۰- عثمانی،شمس نوید،اگر اب بھی نہ جاگے تو؟ روشنی پبلشنگ ہاؤس،۱۹۸۹ء

۶۱- ابو محمد امام الدین،(مولانا) حکومت الٰہیہ اور علماء و مفکرین،مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدر آباد،۱۹۴۲ء

۶۲- نظامی،خواجہ حسن،کرشن بیتی،مشائخ بک ڈپو،۱۹۲۳ء

۶۳- نظامی،خواجہ حسن،ہندو مذہب کی معلومات،دلی پرنٹنگ ورکس دہلی،۱۹۲۳ء

۶۴- عبیداللہ، نومسلم، تحفۃ الہند مع تکملہ کتھا سلوئی، دار احیاء السنہ اُردو بازار، لاہور۔

۶۵- مرزا محمد کاظم برلاس مرادآبادی، تاریخ الہند، گلزار احمدی، ۱۸۶۷ء

۶۶- وحیدالدین خاں (مولانا) ہندوستانی مسلمان، الرسالہ بکس، ۱۹۹۳ء

۶۷- قاسمی، ظفر دارک (ڈاکٹر) اسلام میں غیر مسلموں کے مذہبی حقوق، مشکاۃ پرنٹر، ۲۰۱۷ء

۶۸- قاسمی، ظفر دارک (ڈاکٹر) محمد ﷺ کی سیاسی دستاویزات اور انسانی حقوق، مشکوٰۃ پرنٹرز، ۲۰۱۷ء

۶۹- جی-اے چندراورکر، ہندو اخلاقیات، پریس جام باغ حیدرآباد،

۷۰- جالندھری، سید عبدالقیوم، (مفتی) منو کا قانون اور اسلامی قانون، سید محبوب عالم لٹن روڈ لاہور، بدون سن

۷۱- نجیب آبادی، اکبر شاہ خاں (مولانا) وید اور اس کی قدامت، ادارہ شہادت حق بلیماران، دہلی، ۱۹۶۹ء

۷۲- سید حامد علی (مولانا) ہندومت اور توحید، شہادت حق بارہ دری، دہلی، ۱۹۶۶ء

۷۳- محمد فاروق خاں، وید کا تعارف، روبی آفسیٹ پرنٹنگ پریس دہلی، ۱۹۹۰ء

۷۴- نائک، ذاکر عبدالکریم، (ڈاکٹر) اسلام اور ہندومت (ایک تقابلی مطالعہ) زبیر پبلشر لاہور۔

۷۵- فلاحی، توقیر عالم (پروفیسر) عظیم ہندوستانی مذاہب، ناشر مصنف، ۲۰۱۵ء

۷۶- فلاحی توقیر عالم (پروفیسر) قرآن اور گیتا کا تصور فلاح، ناشر مصنف، ۲۰۱۴ء

۷۷- محمد شارق سلیم (حافظ) ہندو دھرم اور اسلام کا تقابلی مطالعہ، قرطاس پبلشرز، کراچی، ۲۰۱۱ء

۷۸- قاسمی، محمد سعود عالم (پروفیسر) مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت، دارالمصنفین، شبلی

اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۹ء

۷۹- ندوی، محمد رضی الاسلام (ڈاکٹر) قرآن کریم اور آسمانی صحیفے، اریب پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

۸۰- ودیارتھی، عبد الحق (مولانا) میثاق النبیین، دار الاشاعت اسلامیہ آزاد روڈ جیکب سرکل بمبئی، بدون سن

۸۱- خواجہ افتخار احمد (ڈاکٹر) ذہنی وفکری ہم آہنگی آرزو وجستجو، مانک پبلی کیشن، ۲۰۲۰ء

۸۲- اردو دائرہ معارف اسلامیہ

اخبار ورسائل

۸۳- نقوش رسول نمبر، ادارہ فروغ اُردو لاہور، ۱۹۸۴ء

۸۴- الفرقان، بریلی شاہ ولی اللہ نمبر

۸۵- فتویٰ آن لائن دار العلوم دیوبند

۸۶- مضمون، مولانا گیلانی اور ان کا مطالعہ ادیان، مضمون نگار سعاد عباس، سید عبد الغفور بخاری۔

۸۷- مضمون البیرونی اور اس کی کتاب الہند، مضمون نگار غلام جیلانی برق۔

۸۸- ماہنامہ الشریعہ پاکستان

۸۹- روزنامہ انقلاب (اردو)، دہلی

۹۰- روزنامہ راشٹریہ سہارا (اردو)، دہلی

☆☆☆